حرفِ آغاز

ڈاکٹر اظہر وحید





جب انسان اپنے علم پر عمل نہیں کرتا تو

وہ علم دینے والے سے بے وفائی کا مرتکب ہوتا ہے

کامیابی کی دوڑ میں انسان اپنوں سے بچھڑ جاتا ہے

.....اور بچھڑ جانے والا پیچھے رہ جانے والا ہوتا ہے!!

پاکستان کا قیام مشیتِ خداوندی کا ایک جغرافیائی اظہار ہے

اہلیت صرف صلاحیت ہی کا نام نہیں

.....امانت، دیانت اور صداقت بھی اہلیت کا لازمہ ہیں

اسلام..... اللہ کا سلام ہے مخلوق کے نام!

السلام علیکم..... سلامتی کا پیغام ہے!!

فہرست مضامین

حرفِ اوّل

شعور سے دیکھا جائے یا شوق سے دیکھا جائے تو عام منظر بھی عظیم نظر آتا ہے۔ افراد حروف کی مانند نظر آتے ہیں ...... اور واقعات الفاظ کی طرح۔ حروف کی بامعنی ترتیب سے الفاظ مرتب ہوتے ہیں۔ الفاظ کا اپنے معانی کے ساتھ ربط و ضبط مضامین کو جنم دیتا ہے ...... اور کتابِ ہستی کے سب مضامین، درحقیقت کسی جزو کی اپنے کل کے ساتھ وابستگی کی معنوی تشریحات ہیں۔ کتابِ ہستی کی تلاوت کیلئے بصارت سے پہلے بصیرت کی ضرورت پیش آتی ہے ...... کہ بصیرت کے نور سے محروم آدمی صفحۂ ہستی پر مرتسم عبارت صحیح طور پر پڑھ نہیں پاتا ...... اور اِس طور پر جو پڑھنے سے قاصر ہو، وہ کچھ تحریر کرنے سے بھی قاصر ہوتا ہے ...... صفحۂ ہستی پر!

فرد کے ملنے سے واقعہ بنتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ دین دار فردِ واحد کو اہمیت دیتا ہے اور دنیا دار ہجوم کو اہم سمجھتا ہے۔ وحدت پرستوں اور کثرت کے پرستاروں میں فرق اُن کے رویوں سے واضح ہو جاتا ہے۔ کثرت کے سحر میں گرفتار شخص، فردِ واحد کی اہمیت کا منکر ہوتا ہے۔ کثرت کا شیدائی وحدت سے وحشت میں ہوتا ہے۔ وہ پردۂ ہستی پر نمودار ہونے والے حروف کو نظر انداز کر دیتا ہے اور براہِ راست الفاظ کی تعبیر میں مشغول رہتا ہے۔ وہ دینی الفاظ کی تشریح حروف کی مدد کے بغیر کرنا چاہتا ہے ...... اور بزعمِ خود کرنا چاہتا ہے ...... اور یہ تشریح بجائے خود ایک حرفِ غلط کی طرح صفحۂ ہستی سے مٹ جاتی ہے

...... کیونکہ کوئی صاحبِ کتاب اپنے لکھے ہوئے حروف کی توہین برداشت نہیں کرتا۔ دراصل حروف کی عزت افزائی نہ کی جائے تو الفاظ کی حرمت اور واقعات کی وقعت ختم ہوجاتی ہے۔ حسن، حسن ترتیب میں پوشیدہ ایک راز ہے۔ الفاظ بے ترتیب ہوجائیں، تو افراد بے ترتیب ہوجاتے ہیں اور افراد کے بے ترتیب ہونے سے قوم بے ترتیب ہوجاتی ہیں۔ تہذیب کی محفل لفظوں کی نشست و برخاست سے ترتیب پاتی ہے۔ محض ایک لفظ کی نشست یا شست بدل جائے تو کئی نشستیں برخاست ہو جاتی ہیں۔ الفاظ کی بے ربط تعبیروں اور بے رابطہ تفسیروں سے نفسِ مضمون بے ترتیب ہوجاتا ہے...... اور بے ترتیب الفاظ کا کاگا شعور کی منڈیر پر کوئی اطلاع نہیں دیتا...... صرف شور مچاتا ہے!

لفظ علامتیں ہیں۔ جہانِ معانی میں سفر کرنے والوں کیلئے علامتیں سنگِ میل ہوتی ہیں۔ جہاں علامتیں تنسخ ہوجائیں اور نسبتیں فسخ، وہاں قافلے گمراہ ہوجاتے ہیں۔ قوموں کی زندگی میں سب بڑا ظلم یہ ہے کہ لفظوں اور علامتوں کو اُن کے معانی و مفاہیم سے محروم کردیا جائے۔ علامتوں اور نسبتوں کو اپنے اصل مفاہیم سے جدا کرنے والے سنگ دل کس قدر ظالم ہیں کہ اُنہیں آنے والی نسلوں کی گمراہی کا کوئی ڈر نہیں۔ دراصل جو خود کسی سفر میں نہ ہو، اسے قافلے کے لٹ جانے کا کیا غم ہوسکتا ہے۔ راہبر اور راہزن میں ہجوں کے علاوہ ایک فرق دردِ دل کا بھی ہوتا ہے۔ عقیدوں اور عقیدتوں کا سرمایہ سرِ منبر و محراب لٹ رہا ہے اور کسی کو اِس کا غم نہیں۔ سیاسی استحصال کی طرح مذہبی جذبوں کا استحصال بھی معاشرے کا ایک چلن قرار پاچکا ہے۔ مسجد کا مینار علامتِ وحدت تھا...... اور صحنِ مسجد ہی میں واعظِ شیریں بیاں نے وہ نکتہ طرازیاں کیں کہ ماحول تلخ ہوگیا...... وحدتِ فکر فرقوں کی کثرت میں بدل گئی۔ خانقاہ کا گنبد اپنی ذات کی نفی کے گنبدِ بے در کی علامت تھی ...... زاویے بے نیازِ آرزو ہونے کی جائے درس تھے ...... اور زاویہ نشیں ہی آرزوئے رنگ و بو میں مبتلا پائے گئے۔

خرقۂ سالوس میں مہاجن دیکھ کر ایک مبتدی کی سرگردانی بالآخر رُوگردانی میں بدل جاتی ہے۔ متجسس ذہن اور متلاشی قلوب اہلِ مدرسہ کے ہاں قابلِ گردن زدنی قرار پاتے ہیں تو اہلِ درگاہ کے ہاں راندۂ درگاہ!!

درحقیقت لفظ' ظاہر ہے، اور اِس کے معانی باطن میں ہیں ......اور یہ باطن لفظ پڑھنے والے کا اپنا باطن ہے۔ یوں معرفتِ نفس کا لفظوں کے معانی کے ساتھ براہ راست تعلق ہے۔ جس طرح ہر لفظ کا اپنے معنی کے ساتھ ایک رشتہ ہے' اس طرح ہر ظاہر کی اپنے باطن کے ساتھ ایک نسبت طے ہے۔ لفظ سے معانی کا سفر اِسی نسبت کا عرفان ہے۔ اِس نسبت کا عرفان' کسی صاحبِ عرفان کے ساتھ وابستگی سے وابستہ ہے۔ نسبتوں کے باب میں نسبتِ معنوی کا اعتبار کیا جاتا ہے۔ باطن کا سفر ظاہر سے نجات کا سفر ہے۔ ظاہر سے نجات کے سفر میں ظاہری نسبت کیا فائدہ دے گی؟ دراصل ظلمت سے نور کا سفر ایک ربط اور رابطہ مانگتا ہے۔ اہلِ عرفان اس ربط کو نسبت کہتے ہیں ......اور رابطے کو ولایت!!

محبت، خدمت، خلوص، ایثار، قربانی، وفاداری اور اسی قبیل کے کتنے ہی الفاظ ہیں کہ اُن کی حرمت پر پہرہ نہ دیا جائے تو یہ ڈکشنری میں پڑے پڑے متروک ہو جائیں۔ لفظوں کی حرمت پر پہرہ' کردار سے دیا جاتا ہے۔ کردار شجرِ افکار کا پھل ہوتا ہے۔ جس درخت کا پھل میٹھا ہو' اس کا حسب نسب دریافت کرنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ فقیر اپنے کردار سے الفاظ اور معانی کے رشتوں کی حرمت کا امین ہوتا ہے۔ کوئی اللہ کا فقیر ہو تو اللہ بھی لفظ نہ رہے بلکہ زندہ و جاوید ہستی کی صورت ہر سُو عالم آراء دکھائی دے!!

ڈاکٹر اظہر وحید

۲۲ نومبر ۲۰۱۵ء

(۹ صفر ۱۴۳۷ھ)

حرفِ تشکّر

''جس نے بندوں کا شکر ادا نہ کیا' اس نے اللہ کا شکر ادا نہ کیا'' کے مصداق مجھ پر لازم ہے' میں ان تمام احباب کی خدمت میں کلمۂ تشکر پیش کروں' جنہوں نے کمال محبت سے ان مضامین کو کتابی صورت میں منتقل کرنے کی سعی کی۔ ان احباب ذی وقار میں سرِ فہرست ہمدم دیرینہ محمد یوسف واصفی ہیں۔ اس کتاب کی ترتیب و تدوین میں مرحوم فرقان دانش کا تعاون کبھی نذرِ نسیان نہ ہوگا...... وہ اس وقت مزارِ اقدس حضرت واصف علی واصفؒ کے زیرِ سایہ جوارِ رحمت میں جگہ پائے ہوئے ہیں۔ سہ ماہی ''واصفؒ خیال'' کی ادارت میں معاونین محمد حمیر انور، سید عامر احمد، ندیم اشرف، احمد جواد، سجاد علی ساجد اور مطیع الرحمان یہاں بھی معاون رہے۔ اس کارِ معاونت کیلئے میں اپنے رفیقانِ طریق کا ممنونِ احسان ہوں! صحافتی قبیلے سے تعلق رکھنے والے احباب میں حافظ شفیق الرحمان، ظہیر احمد بابر اور شہزاد فرآموش کی محبت کو فراموش نہ کرسکوں گا' جنہوں نے اخبارات میں کالم نگاری پر آمادہ کیا۔ آخر میں ایک کلمۂ سپاس ڈاکٹر محمد اویس افضل صاحب کی نذر...... جن کی مشفقانہ حوصلہ افزائی میرے سفر میں زادِ راہ ٹھہری۔

سرورق

ملک کے معروف خطاط عبد الواحد نادر القلم مرحوم میرے نانا محترم ہیں، اُن کے قلمی جانشین میرے ماموں منور اسلام۔ ایک دن ماموں سے ملنے اُن کی ''الخطاط اسلامک آرٹ گیلری'' جانے کا اتفاق ہوا' وہ ایک فن پارہ کا اسکیچ تیار کر رہے تھے۔ پنسل سے کھنچے ہوئے بیضوی دائرے میرے قلب و نظر میں سما گئے، میں نے فرمائش کر دی کہ پینٹنگ مکمل ہونے پر مجھے دی جائے۔ پنسل اسکیچ سے برش اور کینوس تک پہنچنے میں تین برس لگے، بالآخر حق بہ طلب گار رسید، یہ فن پارہ اس وقت میرے کلینک ''واصفؒ میڈیکل سینٹر'' کی زینت بھی ہے اور زیرِ نظر کتاب کا سرورق بھی۔ اس پینٹنگ میں' قرآنِ پاک میں کچھ سورتوں کے شروع میں چودہ حروفِ مقطعات کو ایک نیم دائرے کی صورت میں منقش کیا گیا ہے۔

علم اور عمل!

علم اپنی اصل میں ایک بحرِ بیکراں ہے...... اور اِنسانی علم اِس میں تیرتے ہوئے ایک بجرے کی مانند ہے...... عمل کے بغیر اس کی قسمت میں ساحلِ مراد نہیں! وہ علم جس پر عمل نہ کیا جائے' انسان کے خلاف ایک فردِ جرم بن جاتا ہے۔علم حاصل کرنا فرض ہے...... تو اِس پر عمل کرنا واجب ہے۔ واجبات ترک کر دیے جائیں تو نوافل کام نہیں آتے۔ علم پر عمل کرلیا جائے تو علم ایک اثاثہ بن جاتا ہے...... وگرنہ واجبات...... بلکہ واجب الادا قرضہ جات!!

علم اور عمل دو توام حقیقتیں ہیں۔ اِن میں سے ایک کی نفی کر دی جائے تو دوسری حقیقت بھی آشنائے دوام نہیں ہوتی۔ علم جب تک عمل سے واصل نہ ہو' وجود پرور نہیں ہوتا...... اور جب تک وجود پرور نہ ہو' قابلِ بیان نہیں ہوتا...... اور جب تک قابلِ ''بیان'' نہ ہو' دوسروں کیلئے قابلِ عمل نہیں ٹھہرتا۔ دراصل علم صرف زبانِ حال سے بیان ہوتا ہے۔

عمل کے بغیر علم ایسے ہی ہے' جیسے کسی ریستوران کی سیڑھیوں پر رکھے ہوئے پلاسٹک کے گملوں میں کاغذ کے گلاب...... راہ چلتے لوگوں کی نظر لبھائیں' لیکن ماحول کو خوشبودار نہ کر پائیں!! علم اور عمل میں وہی تعلق ہے' جو پھول اور خوشبو میں ہوتا ہے۔ وہ علم جس پر عمل نہ ہو' محض معلومات کا ''خزانہ'' ہے۔ ایسے خزانے انسانی دماغوں سے کہیں

زیادہ بہتر اور منظم طور پر لائبریریوں اور کمپیوٹروں میں ''محفوظ'' ہوتے ہیں۔ درحقیقت علم وہی ہے' جو وجود پر وارد ہو جائے ...... اور یہی وہ علم ہے جو وجود کو جمود سے نکال کر وجد میں داخل کر دیتا ہے۔

ایک بے سمت اور بے مصرف ذہنی مصروفیت کا نام علم نہیں! حصولِ علم کا ایک مقصد حاضر و موجود سے نجات بھی ہے۔ ایک صاحبِ علم کو خود سے نجات کا علم بھی آنا چاہیے۔ وہ علم جو وجود کی کشش سے نجات نہ دے سکے' اُس سے نجات پانے کی دعا کرنی چاہیے۔ وہ علم جو انسان کو لطافت کی بہشت سے نکال کر کثافت کی زمین پر ہبوط کر دے' اُس پر توبہ واجب ہے...... کہ یہی وہ علم ہے جو نفس پر ظلم ایجاد کرتا ہے۔ علم خود شناسی بھی ہے اور خود احتسابی بھی! ستم یہ ہے کہ ہمارا سارا ''علم'' اپنی مہلتِ عمل سمیت دوسروں کے اعمال کا احتساب کرنے میں صرف ہو جاتا ہے۔ یوں زندگی خرچ ہو جاتی ہے ...... اور خاطر تک جمع نہیں ہو پاتی! دِن کی روشنی کا علم اگر ہماری رات میں چراغاں نہ کر سکے' تو روشنی کا علم کس کام ٹھہرا!!

جب انسان اپنے علم پر عمل نہیں کرتا تو وہ علم دینے والے سے بے وفائی کا مرتکب ہوتا ہے۔ بے عمل اِنسان وقت کے رحم و کرم پر ہوتا ہے' باعمل شخص وقت کے اسی سیلِ رواں کو موڑ دیتا ہے۔ پیہم عمل کرنے والی قومیں وقت کے تیز دھارے کو آبشاروں، جھیلوں اور ندیوں کی شکل دے کر جہانِ رنگ و بُو میں رنگا رنگ گُلکاریاں پیدا کر دیتی ہیں۔ بے عمل قوم ہر سال کسی سیلابِ بلا کا شکار ہوتی ہے۔

علم کے بعد بے عملی' دراصل اپنے ہی علم پر بے یقینی کا اعلان ہے۔ علم پر یقین نہ ہو' تو عمل کی طرف قدم نہیں بڑھتا۔ عمل کی شاہراہ پر چلنے والے اپنے علم کو عین یقین کی آنکھ سے دیکھ لیتے ہیں ...... اِسے مشاہدہ کہتے ہیں۔ مشاہدے کے بعد مجاہدے میں مداومت کا عمل دو

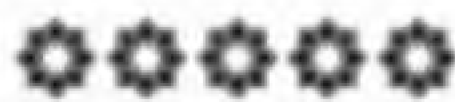
قدم ہے۔ اس طریق پر چلنے والے مسافر چلتے چلتے خود سنگِ میل کی صورت ہو جاتے ہیں جنہیں دیکھ کر قافلے اپنا قبلہ درست کرتے ہیں ...... اور نئے سرے سے ہمت باندھتے ہیں !!

اِنسان کو علم اِس لیے دیا گیا ہے کہ وہ فنا سے بقا کی طرف ہجرت کر سکے۔ حضرت واصف علی واصفؒ فرماتے ہیں: ''اگر علم کا مُدعا خوشنودیٔ خلق ہے تو حجاب اور اگر علم کا منشاء رضائے حق ہے تو نور' بلکہ نورٌ علیٰ نور!!'' وہ علم جو نور کی طرف راہنمائی نہ کر سکے' اُس میں گھرے ہوئے شخص کی مثال اَز رُوئے سورۃ نور ایسی ہے' جیسے مادّیت کے بحرِ ظلمات میں گہری اندھیری رات اور اس میں طغیانی کی منہ زور موجیں ...... کہ اگر کوئی شخص اپنا ہاتھ باہر نکالے تو اُسے اپنا ہاتھ خود بھی دکھائی نہ دے!!

ایک دُنیا دار آدمی اِس لیے علم حاصل کرتا ہے کہ لوگوں کو مرعوب کر سکے۔ لوگ دولت اور حکومت سے بھی خلقِ خدا کو مرعوب کرتے رہتے ہیں ...... ایسے لوگوں کو جاہل کہا جاتا ہے۔ وہی عام سے کام جو لوگ دولت اور حکومت سے کرتے رہتے ہیں' اگر علم کو ذریعہ بناتے ہوئے کیے جائیں' تو جہالت کے اِس درجے کو کیا کہیں گے؟ اگر حصولِ علم کا مقصد مادّی منفعت ہے تو ایسا علم' نفع بخش نہیں ہوگا...... گھاٹے کا سودا نکلے گا!! علم اگر صرف جان لینے کی تمنا تک محدود رہے ...... تو جان لے کر رہے گا!! آج کے دَور کا علمِ معاشیات لوگوں سے معیشت چھین لینے کا ہنر سکھاتا ہے۔ موجودہ دَور کا علمِ طب' معالجین کو صرف بیماریوں کی تشخیص کرنے اور اَدویات تجویز کرنے کا لائسنس فراہم کرتا ہے' اُنہیں مریضوں سے ہمدردی کی تعلیم نہیں دیتا۔ بیماروں سے زیادہ بیماریوں میں دلچسپی لینے والا معالج شفا کے تصور سے ناآشنا ہے۔ معالج کا اِخلاص اور اخلاق ہی مریض کیلئے شفا کی نوید ہوتی ہے۔ امیر اور غریب مریض میں تفریق کرنے والا صرف دولت جمع کرنے میں مصروف ہے۔ نجی ہسپتال گویا نجی بینک کا نقشہ پیش کرتے ہیں۔ بینکوں کی طرح اِن کا عملہ امیر کلائنٹس کے سامنے

بچھ بچھ جاتا ہے...... اور غریب ہتھے چڑھ جائے تو اس کا خون نچوڑ لیا جاتا ہے۔ غلطی سے ہم ٹیکنیکل تعلیم کو علم سمجھ بیٹھے ہیں' حالانکہ فنی تعلیم محض ایک ہنر ہے۔ ہنرمند افراد جب تک خدمت کا ہنر نہیں سیکھتے' اُن کی ہنرمندی نوسر بازی کی ایک ترقی یافتہ شکل بن جاتی ہے۔ علم جب تک قربانی دینے کا ہنر نہ سکھائے' منفعت بخش نہیں ہوتا...... نہ اپنے لیے، نہ مخلوقِ خدا کیلئے! جو علم ربّ کی طرف سے آئے گا' وہ مخلوق کی ربوبیت کرے گا!!

اِنسان جیسے جیسے سائنس اور ٹیکنالوجی میں اپنی ترقی کی رفتار میں اضافہ کرتا چلا جا رہا ہے' اِس پر اخلاق اور رُوحانیت کی تعلیم بھی اُسی انداز اور رفتار سے واجب ہوتی چلی جاتی ہے۔ اس کی مثال ایسے ہی ہے جیسے موٹروے پر دوڑنے والی گاڑیاں، لوہے کی پٹری پر پھسلنے والی سبک رفتار بلٹ ٹرین اور ہوا کے دوش پر تیرنے والے جمبو جیٹ اگر نظم وضبط کے پروٹوکول کی پاسداری نہ کریں تو نتائج خوفناک مرتب ہوتے ہیں۔ گلوبل ویلیج میں انفرادی غلطی کا نتیجہ اجتماعی نکلتا ہے...... اِس طرح' پہلے کی طرح آج بھی تعمیرِ ملت کیلئے فرد کی اصلاح فرداً فرداً ضروری ہے!!



علم کے بعد بے عملی...... علم پر یقین کم کر دیتی ہے۔
(پہلی کرن)

علم اور اخلاص

انسان بھی عجب مخلوق ہے، علم حاصل کرتا ہے، عمل کی غرض سے ...... اور جب عمل کا لمحہ قریب آتا ہے تو مزید حصولِ علم کیلئے نکل کھڑا ہوتا ہے۔ دراصل جب تک وہ اپنی غرض سے نہیں نکلتا' اُس کا علم' اُس کے عمل میں نہیں آتا۔ اخلاص' اغراض کی نفی کا نام ہے۔ جب تک نفی کے عمل سے نہ گزرا جائے' ثبات کا اثبات نہیں ہوتا۔ اخلاص قربانی مانگتا ہے...... کہ قرب کا راستہ قربانی ہے۔ اخلاص کا عمل بے سبب ہوتا ہے ...... اسی ''سبب'' سے بلا سبب ...... بلکہ بالائے سبب ...... ذات تک رسائی صرف اخلاص کے پاس ہے۔۔ صرف اخلاص کو اجازت ہے کہ علم کے دروازے پر دستک دے۔ اگر علم کا دَر نہ کھلے تو علم کے شہر کی شاہراہیں دکھائی نہیں دیتیں۔

علم کو عمل میں بدلنے کے لیے یقین اور عزم کے ساتھ ساتھ اِخلاص کی ضرورت ہوتی ہے ...... اور یہ ضرورت اَز حد قسم کی ضرورت ہے ...... اِس کے بغیر عمل' عمل نہیں رہتا' بلکہ ایک مادّی، جدلی اور جبری فعل بن جاتا ہے۔ فعل کو عمل بنانے والی شے نیّت ہے ...... اور نیت کے وضو کو اِخلاص کہتے ہیں۔ اخلاص عمل نہیں' عمل انگیز (catalyst) ہے ...... کہ نظر نہیں آتا' اور نہ کسی عمل میں بطور فاعل حصہ ہی لیتا ہے لیکن اِس کی موجودگی ایک زمینی عمل کو آسمانی بنا دیتی ہے۔ اِخلاص کہیں ''نظر'' نہیں آتا ...... کیونکہ یہ صلہ وصول کرنے

والوں کی قطار میں کھڑا نہیں ہوتا۔ یہ صفِ دشمناں کی ملامت سے بچنے کے لیے ہجومِ دوستاں سے چھٹ کر بھی کھڑا نہیں ہوتا۔ صرف اخلاص کی ہمت ہے کہ کوچہ ٔملامت میں بصد سامانِ رسوائی رقص کرے۔ اخلاص ...... ستائش اور ملامت' دونوں سے بے نیاز ہے ...... بلکہ بے نیازِ آرزو ہے...... یہی وجہ ہے کہ ''بے نیازِ نشاطِ رنگ و بو'' ہے۔

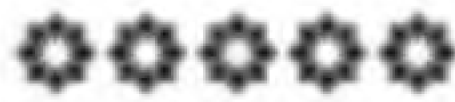
اخلاص' کرامت ایجاد کرتا ہے...... اور آج کے دَور کی سب سے بڑی کرامت یہی ہے کہ عمل علم کے مطابق ہو جائے۔ اِستقامت صرف اِخلاص کے نصیب میں ہے۔ اِخلاص ...... جرأتِ اظہار پیدا کرتا ہے۔ اگر اِخلاص نہ ہوتو ''سچ'' کا اظہار کسی فتنے کے ظاہر ہونے سے کم نہیں! اِخلاص کی کوکھ سے جنم لینے والا علم ہی وجود کا حصہ بن پاتا ہے۔ اِخلاص میں یہ صلاحیت ہوتی ہے کہ فنا کے دیس میں پلنے اور ڈھلنے والے وجود کو دارِ بقا میں جا آباد کرے۔ گویا اخلاص ...... سلطان ہے!! دراصل حقیقی علم اُسی وجود سے پھوٹتا ہے جو اپنی ذاتی اغراض کی عملی نفی کر چکا ہو۔ ذاتی غرض کی نفی ہی اخلاص اور اخلاق کا ثبات ہے۔ ذات تک رسائی کی راہ پانے کیلئے ذاتی اغراض سے اعراض لازم ہے۔ ذات کے طالب کو ذاتیات سے بالاتر ہونا پڑتا ہے۔ ذات بے لوث ہے، بے غرض ہے اور بے نیاز ہے۔ اللہ کا بندہ بے نیاز نہیں ہوسکتا ...... بے لوث اور بے غرض تو ہوسکتا ہے۔ سورۃ اخلاص کو سورۃ توحید بھی کہا جاتا ہے۔ کردار میں اخلاص دَر آئے تو توحید کی کوئی صورت نکل ہی آتی ہے۔ علم اپنی ہیئتِ اصلی میں خود شناسی اور خدا شناسی کا پیامبر ہوتا ہے ......اور خود شناسی کے سفر پر روانہ ہونے کا پروانہ اِخلاص کے پاس ہے!! بس ایک بار درجۂ اخلاص تک پہنچنا لازم ہے، اِس کے بعد خانۂ شعور تک علم کی ترسیل ایک خودکار عمل ہے۔ ایک بندۂ اخلاص کیلئے علم ...... عقلِ سلیم کا پھیلاؤ ہے۔ اِخلاص میسر آجائے تو علم common sense کی ایک extension بن جاتا ہے۔ دراصل

ایک مخلص اِنسان ذات کی خوشبو کے حصار میں ہوتا ہے ...... اور علم اور ذات اکثر اوقات مترادفات سمجھے جاتے ہیں۔ عرفانیات کے باب میں اُس ذات کا تصور نہیں' جس کا لازمہ علم نہ ہو ...... اور نہ ہی یہاں ایسے علم کا تصور ہوتا ہے' جس کا حوالہ کوئی ذات نہ ہو!!

منافق، مسلمان اور مومن بظاہر ایک جیسا عمل کرنے میں مصروف پائے جاتے ہیں ...... لیکن اِن میں تفریق اور تخصیص کا پیمانہ اخلاص ہے۔ اخلاص میزانِ عمل ہے۔ اعمال کو حسنات اور سیئات کے باٹوں میں تقسیم کرنے کا عمل ...... اَمر کے بعد اخلاص کے ذمے ہے۔ مومن کی اصل قوت' اُس کا اِخلاص ہے۔ اِخلاص کی فراوانی مردِ قلندر کی نشانی ہوتی ہے۔ اخلاص کا عمل' خاموش اِحسان ہے! اخلاص اپنے عمل کی قیمت وصول نہیں کرتا!!

محبت اور عقیدت کی طرح علم کا صلہ لینے والا شخص بھی محرومیوں کی کھائی میں جا گرتا ہے۔ اپنے علم کو دولت اور منزلت کی صورت میں کیش کروانے والے شخص کا بالآخر دیوالیہ ہو کر رہتا ہے۔ علم' آسمان سے نازل ہونے والا ایک پاکیزہ رزق ہے ...... اس کی منزلت کی قدر یہ ہے کہ اس پر عمل کیا جائے۔ علم ایک نعمت ہے اور اِس نعمت کا شکر' یہ ہے کہ اسے عمل میں لایا جائے۔ علم' اِخلاقیات کا ہو یا اِلٰہیات کا ...... اس کی تبلیغ کی بہترین صورت یہی ہے کہ اس پر عمل کر کے دکھایا جائے ...... بصورتِ دیگر روحانی علوم بھی ایک دیومالائی داستان کی طرح بس دہرائے چلے جانے کے کام آتے ہیں۔ علم پر عمل' دراصل اپنے علم پر یقین کی ایک دلیل ہے ...... وگرنہ بلا دلیل بات' کوئی بلا وجہ کیوں قبول کرے گا ...... کوئی مبلغ آخر نبوت کے درجے پر تو نہیں کہ اُسے بلا دلیل ماننا لوگوں کے ایمان کی دلیل ٹھہرے۔ بے عمل شخص اگر روحانیت کا علم بولنے لگے تو سمجھ لینا چاہیے کہ روحانیت خطرے میں ہے۔ دین ...... اِلٰہیات، عبادات اور اخلاقیات کا مجموعہ ہوتا ہے۔ عبادات اور اِلٰہیات پر اِعتقادات کا تعلق خدا سے ہے لیکن اخلاقیات کا معاملہ اِنسانوں کے ساتھ ہے...... اور انسانوں کے

ہاتھ میں ہے۔ کسی اِنسان کے بااخلاق ہونے کی گواہی اِنسان ہی دیتے ہیں ......اور سب سے معتبر گواہی وہ ہوتی ہے جو اُس کے ماتحت لوگ اُس کی عدم موجودگی میں دیتے ہیں۔ دینِ اسلام کا طرۂ امتیاز یہ ہے کہ یہاں اخلاقیات عبادات میں داخل ہیں۔تصوف کا نشانِ اِمتیاز یہ ہے کہ وحدت الوجود کے پیرائے میں بات کرتا ہے اور اِخلاقیات کو اِلٰہیات کا حصہ بنا دیتا ہے۔ اِنسانی اِخلاقیات کی حد جہاں ختم ہوتی ہے' وہاں روحانی اِخلاقیات کی سرحد شروع ہوتی ہے۔ جہاں انصاف کا سانس پھولنے لگتا ہے' وہاں اِحسان دم بھرتا ہے۔ تصوف ......درجۂ اِحسان ہے!



اخلاص کیا ہے......؟

اخلاص ایک ایسے ناتے کا نام ہے جس میں کوئی چور دروازہ نہ رکھا جائے۔

اور خودغرضی کیا ہے......؟

اپنے ناتوں میں چور دروازے ڈھونڈنے کا نام!

(پہلی کرن)

امانت، دیانت اور حکومت

امانت اور دیانت ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح لازم و ملزوم ہیں ...... جس طرح جسم کے ساتھ روح۔ دیانت امانت کی روح ہے۔ جو اپنے اندر دیانت نہیں رکھتا' وہ امانت رکھنے کا اہل نہیں۔ کوئی خاندان ہو یا خانقاہ ...... مملکت ہو یا معیشت ...... دیانت کے جوہر کے بغیر اپنے وجود کا طول و عرض برقرار نہیں رکھ سکتی۔

حکومت بھی ایک امانت ہے ...... امانت نااہل کے سپرد ہو جائے تو سلامت نہیں رہتی۔ دراصل حکومت ...... عوام کی طرف سے حکمرانوں کے پاس جمع کروائی ہوئی چھوٹی بڑی بہت سی امانتوں کا مجموعہ ہوتی ہے۔ یہ امانتیں حقوق کی شکل میں بھی ہو سکتی ہیں۔ مملکت کا حکمران مالک الملک کی منشاء کے مطابق ایک منشی بن کر عوام کی اَمانتوں کے بہی کھاتوں کی نگرانی کرتا ہے۔ کسی امانت کو ہڑپ کرنا تو دُور کی بات ...... امانتوں کی نگرانی سے غفلت کا نام بھی بددیانتی ہے۔ اِس طرح ملکی سطح پر نااہل ہونا بنیادی طور پر بددیانت ہونے کے زمرے میں آتا ہے۔ اگر خازن ہی خائن ہو جائے تو خزانہ کدھر جائے۔

بددیانت حکمرانوں کے دورِ حکومت میں ملکی خزانہ اُن کے ہاتھوں سے نکلتا ہوا غیر ملکی دسترس میں چلا جاتا ہے ...... اس طرح بددیانتی غداری کی ایک شکل بن جاتی ہے۔ جب بدعنوان ہونا عیب کی بجائے ہنر تصور کیا جائے تو امارت حکومت کی واحد اہلیت قرار پاتی

ہے۔ایسے میں مملکت پر جو تباہی نازل ہوتی ہے' تو اس کیلئے الامان الحفیظ کا وظیفہ بھی ناکافی ٹھہرتا ہے۔

حکومت کرنا دراصل حکمت کرنا ہے۔ کسی حکومت کی حکمتِ عملی صرف اس وقت عملی حکمت بن سکتی ہے جب سرمایہ دار' جاگیردار' سوداگر اور تاجر قسم کے لوگ اختیارات کے منبع و مرکز سے دُور رکھے جائیں۔ تاجر' مملکت کی تجوری کو تجارت کیلئے استعمال کرے گا ...... سوداگر' رعایا کا سودا کر سکتا ہے ...... زردار' زور آور ہو کر مزید زراندوزی کرے گا ...... اور جاگیردار جب کوئی الیکشن یا سلیکشن جیتنے میں کامیاب ہو جائے گا' تو رعیت کو ہاری تصور کرے گا۔

حکومت کرنا دراصل زیردستوں کو زبردستوں کے استبداد سے بچانے کی حکمتِ عملی ہے۔ یہ انصاف سے شروع ہوتا ہے اور احسان تک پہنچتا ہے ...... زبردستوں کے ساتھ انصاف ...... اور زیردستوں کے ساتھ احسان۔ انصاف اُس وقت انصاف نظر آتا ہے' جب اُوپر سے شروع کیا جائے۔ انصاف مستحسن ہے' مگر احسان سے احسن نہیں۔ منصفوں کو یہ یاد رکھنا چاہیے کہ انصاف کا عمل اوپر سے شروع ہوتا ہے اور احسان کا عمل نیچے سے!!

حکومت ...... اقتدار حاصل کرنے اور پھر اس کی حفاظت کی تدبیر کرتے رہنے کا نام نہیں ...... بلکہ حکومت کا کام اقدار کی حفاظت کرنا ہے ...... خواہ اس عمل میں اقتدار محفوظ رہے' یا نہ رہے۔ اختیارِ اعلیٰ ...... ربّ الاعلیٰ کی طرف سے دی گئی ایک امانتِ چندروزہ ہے۔ چندروزہ امانت پر ہمیشہ کیلئے تصرف کی خواہش بذاتِ خود بددیانتی ہے۔ دولت کے ارتکاز سے لے کر اختیارات کے ارتکاز تک ...... سب خرابیاں اس عارضی تصرف پر ہمیشہ متصرف رہنے کی خواہش سے پیدا ہوتی ہیں۔ نافرمان لوگ اقتدار کو ہمیشہ کیلئے حاصل

کرنا چاہتے ہیں...... حالانکہ انسانی تاریخ میں فرماں روائی اقتدار کی بجائے اقدار کو حاصل ہوتی ہے۔فرماں روائی...... دلوں پر فرمان جاری کرنے کو کہتے ہیں۔ دلوں پر جاری ہونے والے فرمان دلوں پر بھاری نہیں ہوتے۔حکمرانی حکم چلانے کونہیں کہتے۔حکم چلانے والے کو چلاّنا پڑتا ہے...... یا پھر خود چلنا پڑتا ہے۔حکمرانی کا بھرم اپنے مالک کے حکم پر چلنے سے قائم رہتا ہے۔درحقیقت ہرحکومت' نگران حکومت ہوتی ہے۔

اختیار کی طرح دولت بھی ایک امانت ہے۔اپنے اختیار کو دولت میں اضافے کیلئے استعمال کرنا ...... یا اپنی دولت کے استعمال سے کوئی اختیار حاصل کرنا...... دونوں ہی بدعنوانی کے زمرے میں آتے ہیں۔ بدعنوانی دراصل عنوانات کا اَدل بدل ہی تو ہوتا ہے...... اور عنوانات کے بدلنے سے بدعنوانی و بداعتدالی کے نئے نئے عنوانات کھلتے ہیں۔اختیار اور دولت دونوں میں سے کسی کا استعمال بھی حد سے گزر جائے تو اِس پر حد جاری ہوسکتی ہے۔

امانت اور دیانت کا سبق پہلے اپنے وجود کی عمارت میں نافذ کرنا واجب ہے...... تب ہی اِس کا نفاذ باہر کی اَمارت میں ممکن ہوتا ہے۔ہمیں اپنے چندمربع فٹ وجود پر چندعشروں کیلئے تصرف دیا گیا ہے۔

اپنے جسم پر اقتدارِاعلیٰ کے منصب پر فائز ہونے کے بعدمعزول ہونا کتنا یقینی ہوتا ہے...... اس پر یقین اُس یقین سے پہلے آجانا چاہیے جس کا ایک نام موت بھی ہے۔بہرحال ملکِ وجود ہو'یا وجودِمملکت...... مالک الملک کی مرضی کونظرانداز کرنے والا...... اپنی مرضی سے تصرف کرنے والا...... بدعنوان ہی کہلائے گا۔

لفظ معنی کا عنوان ہوتے ہیں۔روح کی طرح معانی بھی بے نام رہتے ہیں...... جب تک انہیں کسی اِسم اور جسم کا لباس میسرنہیں آجاتا۔جہانِ معانی میں کسی معنی کو اس کے صحیح

عنوان سے ہٹا دینا بھی بدعنوانی میں شمار ہوتا ہے۔ جب ہم سچ بولتے ہیں تو لفظ اور معانی کے رشتوں کے ساتھ عدل کر رہے ہوتے ہیں۔ جب جھوٹ بولتے ہیں تو ظلم کرتے ہیں ...... کہ الفاظ کو اُن کے درست تناظر اور تندرست مفہوم سے محروم کر دیتے ہیں۔ الفاظ جسم ہیں اور معانی روح ...... جسموں کو روح کے نزدیک رکھنا دراصل روح کے عالم میں کیے گئے ایک وعدے پر پورا اُترنے کی تدبیر ہے۔ حکمِ ربی ہے کہ وعدوں کے متعلق سوال ہوگا۔ انسان اپنے وعدوں کا مسئول ہے۔ درحقیقت روحانیت' اپنی مسئولیت کا احساس ہے۔

وعدہ بھی ایک امانت ہے ...... لفظوں کی شکل میں دی گئی ایک امانت۔ وعدہ پورا نہ کرنا امانت میں خیانت کرنا ہے۔ وعدہ وفا نہ کرنے والا ہی تو بے وفا کہلاتا ہے۔ وعدہ ایک ایسی امانت ہے ...... جسے لینے والے کی بجائے دینے والے کو واپس کرنا ہوتا ہے۔ وعدہ ...... حال کے پاس مستقبل کی امانت ہے۔ الفاظ کی شکل میں وصول اور موصول ہونے والی یہ امانت جب عمل کی صورت میں لوٹائی جاتی ہے' تو اسے دیانت داری کہتے ہیں۔ کل کا وعدہ ایک جھوٹا وعدہ ہوتا ہے ...... کیونکہ کل کبھی نہیں آتا۔ آج کی درخواست پر آج ہی عمل درآمد ضروری ہوتا ہے ...... کیونکہ آج ہر روز آتا ہے۔ درخواست پر غور کرنے کے وعدے میں آدھا انکار شامل ہوتا ہے۔ ہر عہد اپنے عہد ہی میں پورا ہونا چاہیے ...... جو اپنا عہد پورا نہیں کرتا' اُس کا عہد اُدھورا رہ جاتا ہے۔ درحقیقت اپنے عہد پر پورا نہ اُترنے والا' کسی عہدے کیلئے بھی پورا نہیں اُتر سکتا!

صبحِ اَلست انسان اپنے ربّ سے بھی ایک عہد کر چکا ہے ...... اب زندگی کی شام پڑنے سے پہلے اِسے اپنا بندہ ہونا ثابت کرنا ہے ...... تاکہ وہ اپنے عہد پر ثابت قدم رہنے کا ثبوت پیش کر سکے۔ بندے کا اپنے ربّ کے حضور سجدۂ تسلیم' اُس کے پاس اپنے عہد پر قیام

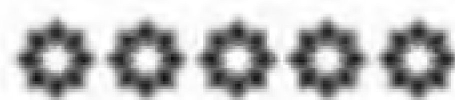
کا ثبوت ہے۔غور کرنے کا مقام ہے ...... قدیم نے کس مقام پر حادث کو اپنے کس راز کی امانت تفویض کردی ...... کہ کہا گیا ...... :**الانسانُ سِرّی وانا سِرّہ** ' ...... ''اِنسان میرا راز ہے اور میں اِنسان کا راز ہوں'' ...... گویا ربّ کا راز انسان کے پاس ہوتا ہے ...... یا یوں کہیں کہ انسان وہی ہوتا ہے جس کے پاس اپنے ربّ کا راز ہوتا ہے ...... اسی لیے تو اُلوھی راز کے متلاشی بالآخر کسی انسان کے پاس ہی پہنچتے ہیں!!

امانت دیانت اور ایفائے عہد کے باب میں معیارِ اوّل و آخر وہی ایک ہستی ہے جو نگاہِ عشق و مستی ہی میں نہیں' نگاہِ فکر و دانش میں بھی اوّل و آخر ہے .... ازل سے صادق ﷺ ...... ابدالآباد تک امین ﷺ۔ تمام صداقتیں اپنی صداقت کی سند پانے کیلئے صادق ﷺ کی طرف رجوع کرتی ہیں ...... تمام امانتیں' آسمانی ہوں یا زمینی ...... امینؐ ہی کے پاس عافیت وحفاظت پاتی ہیں ...... تمام عہد درحقیقت صادق و امینؐ کے دم قدم سے قائم ہیں۔قصہ مختصر ...... انسان ہونے کیلئے **الانسان** ﷺ کا ہونا پڑتا ہے۔

پس ...... انسان وہی ہے جو **الانسان** ﷺ کے قریب ہے ...... اور یہ قرب' زمان و مکاں سے ماوراء ہے ...... کہ یہ قرب' قربِ معنوی ہے۔ظاہر ہے صادقؐ اور امینؐ کے قریب وہی ہوسکتا ہے' جس کا باطن امانت' دیانت اور ایفائے عہد کے نور سے منوّر ہوگا۔ درحقیقت تصوف اخلاقِ محمدی ﷺ سیکھنے اور سکھانے کا نام ہے۔

ہم کتنے خوش نصیب ہیں کہ قریب کے دور میں ہم ایک ایسی شخصیت سے متعارف ہوئے کہ جس کا قول و کردار اِخلاقِ محمدی ﷺ کا پَرتَو تھا۔بقول حضرت واصف علی واصفؒ

ع ترے راہوں میں بے سایہ گیا ہوں



عالمِ امن اور امنِ عالم!

ہم میں سے ہر شخص ایک دوسرے کے حقوق کی امانت اٹھائے ہوئے ہے ...... جب تک ان امانتوں کو پوری دیانت داری سے ہم حقداروں کو لوٹا نہیں دیتے' امنِ عالم ایک خواب کا عالم رہے گا۔ حق دار کو حق لوٹانا' کسی قانون یا سزا کے ڈر سے نہ ہونا چاہئے ...... کہ نیت میں اگر خیانت دَر آئے تو قانون میں ترامیم بھی دَر انداز ہوتی چلی جاتی ہیں۔ جب تک نیت میں دیانت کو جگہ نہیں ملتی ...... کسی حقدار کو اس کی امانت نہیں ملتی۔ ایک بددیانت شخص اپنے اردگرد بہت سی محرومیوں کا باعث بنتا ہے ...... اور چھوٹی چھوٹی محرومیاں بڑے بڑے جھگڑوں کا سبب بن جاتی ہیں۔

قیامِ امن کا پہلا جنیوا ...... ایک فرد ہے' جسے ایڈریس کیے بغیر عالمی امن کا کوئی کنونشن کامیاب نہیں ہوسکتا۔ فرد کو پُرسکون کرنا' معاشرے کو امن کی بنیاد فراہم کرنا ہے۔ حالتِ امن کا قائم ہونا کسی انقلاب کے برپا ہونے سے کم نہیں ...... اور یہ اِنقلاب سے پہلے ایک فرد کے قلب میں رُونما ہوتا ہے۔

کوئی فرد یا قوم ...... جب تک احساسِ تفاخر سے صحیح سلامت باہر نہ نکل آئے ...... اَمن سلامت نہیں رہ سکتا۔ دوسروں سے بالا ہونے کا احساس خود کو قانون سے بالاتر سمجھنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ احساسِ تفاخر ایک زعم کے سوا اور کیا ہے ...... اور کتابِ معنی میں زعم اور

وہم ...... سراب کے ہم معنی ہیں۔ زعم ...... حسب کا ہو یا نسب کا ...... حقیقت میں عالی ہونے کے باوجود ...... حقائق سے دُور لا پھینکتا ہے۔ کسی زعم میں مبتلا انسان کہیں کا نہیں رہتا۔ وہ انسانوں کی دنیا سے دُور خود پسندی کے ایسے جزیرے میں بن باس لے بیٹھتا ہے جہاں تنہائی کی ہولناکیاں سائیں سائیں کرتی ہے۔ وہ جسے ہم اپنے سے کمتر سمجھتے ہیں' اگر اُس کا وجود مٹ جائے تو ہم نامکمل رہ جاتے ہیں۔ ہمارے وجود کی وحدت اس وقت تک مکمل نہیں ہوتی جب تک باہر کثرت کی موجودگی سلامت نہ ہو۔ زعم کیلئے نہ کوئی مرتبہ' علم ہی دلیل ٹھہرتا ہے' اور نہ دولت اور عقل ہی حجت قرار پاتی ہے۔ مرتبہ' دولت' اور عقل درجہ بدرجہ ذمہ داریوں کی دلیلیں ہیں۔ اگر کوئی مرتبے میں عالی ہے تو وہ کم رُتبے والوں کی خدمت کرے ...... اگر دولت میں کوئی دوسروں سے بڑھ کر ہے' تو غریبوں کو بڑھ کر اپنی دولت میں شامل کرے ...... اگر کوئی علم و عقل میں عالی ہے تو وہ جاہلوں کی بے عقلی خندہ پیشانی سے برداشت کرے۔ کسی بھی لحاظ سے کم رتبہ لوگوں کی بہترین خدمت یہ ہے کہ اُن کے ساتھ تواضع سے پیش آیا جائے۔ تواضع ...... دوسروں کی عزتِ نفس کا احترام کرنے کو کہتے ہیں۔ تکبر ...... دوسروں کی اَنا کو اپنے مرتبے کے بلڈوزر تلے روندنے کا نام ہے۔ درحقیقت اپنے سے کم تر کا خیال وہی رکھ سکتا ہے جو اپنے حال اور ماضی پر زعم سے نجات حاصل کر چکا ہو۔ نجات حاصل کرنے کیلئے خود سے لڑنا پڑتا ہے۔ گویا جدّ وجہد کا آغاز اپنے گھر سے ہوتا ہے۔ جو اَپنے اندر خود سے لڑتا رہتا ہے ...... مخلوق اُس سے اَمن میں رہتی ہے۔ جو اپنے اندر شکست کھا جاتا ہے' اُس کی لڑائی باہر بازاروں اور چوراہوں پر آجاتی ہے۔

آج کل اِصلاح کے نام پر اَمن کی دھجیاں بکھیری جا رہی ہیں۔ مشرق ...... مغرب کی اصلاح کرنا چاہتا ہے اور مغرب ...... مشرق کو سبق سکھانا چاہتا ہے ...... غالبًا تہذیب کا کوئی سبق ...... یوں مشارق و مغارب باہم متحارب ہیں ...... حالانکہ سورج آسمان کا ہو یا

تہذیب کا...... مشرق سے اُبھرتا ہے اور مغرب میں غروب ہوتا ہے۔ درحقیقت خود کو اصلاح یافتہ سمجھنا بھی ایک درجۂ غرور ہے۔ دوسروں کی اصلاح کرنے کا دعویٰ کرنے والا خود اصلاح یافتہ ہونے کے زعم میں مبتلا ہوتا ہے۔

اَمن کی تمنا ایک خواب رہے گی جب تک طاقتور کمزور کا احترام کرنے کی تہذیب سے آشنا نہیں ہو جاتا۔ امنِ عالم اس وقت تک قائم نہیں ہو سکتا' جب تک انسان دوسرے انسانوں کی عزتِ نفس کو تقدیس اور تکریم کی نگاہ سے دیکھنے کا عادی نہیں ہو جاتا۔ دراصل جھگڑے کی ابتدا اُس وقت ہوتی ہے جب کسی فریق کو شبہ ہو جائے کہ اس کی توہین کی جا رہی ہے۔ دوسروں کی توہین کا سبب ...... غرور ہوتا ہے یا پھر کوئی تعصب۔ دراصل تعصب بھی ایک درجہ غرور ہے...... اپنی قوم قبیلے کی زبان' رنگ' نسل اور تہذیب پر غرور!! ...... اور ہر مغرور شخص دوسروں کی توہین کا مرتکب ہوتا ہے۔ جھگڑا ختم کرنے کا سب سے تیر بہدف نسخہ یہ ہے کہ فریق کو ہر طریقے سے یہ باور کروا دیا جائے کہ وہ قابلِ عزت ہے۔ اپنی اَنا کا بت منہ کے بل گرا دیا جائے تو جھگڑا کھڑا نہیں ہوتا۔ جھگڑا ہمیشہ اپنی اَنا کا گھوڑا آگے بڑھانے پر ہوتا ہے ...... اور یہی جھگڑا پہلے وقتوں میں قبیلوں اور اب قوموں کے درمیان جنگ کا باعث ہے۔ فرد' فرد کا اور قوم' قوموں کا اِحترام کرنا سیکھ لے ...... عالمی امن قائم ہو جائے گا۔ بصورتِ دیگر اَمن ...... بقول مرشدِ صادق حضرت واصف علی واصفؒ ...... دو جنگوں کے درمیانی وقفے کا نام رہے گا۔

انسان عظیم ہے ...... اس کیلئے طاقت کا حصول ہی کافی نہیں ...... اِسے عظمت بھی چاہئے۔ کسی عظمت کے بغیر طاقت' غرور کا ایک ابولہول ہے...... اور غرور مہذب دنیا میں غیر مہذب ہونے کا ایک چلتا پھرتا اشتہار ہے۔ طاقت اپنی عظمت کو نہ پہنچے تو بجائے عزیمت کے' ہزیمت کو پہنچتی ہے۔ طاقت میں عظمت اُس وقت آتی ہے' جب یہ جھکنے کا فن سیکھتی ہے۔

طاقت کی عظمت' اِس کا عجز ہے۔ عجز علم ہے، تکبر جہالت ہے۔

علم روشنی ہے ...... یہ روشنی جس قندیل سے نکلتی ہے اسے محبت کہتے ہیں۔ سب سے بڑا علم محبت کی قندیل سے تعلق قائم کرنا ہے ...... اور سب سے بڑی جہالت شمعِ محبت سے رُخ پھیر لینا ہے۔ محبت سے محروم ہونا' علم سے محروم ہونا ہے ...... محبت سے محروم انسان تعصب اور جہالت کے اندھیروں میں بھٹکتا رہتا ہے۔ محبتوں اور محبوبوں کا منکر' جاہل مطلق ہوتا ہے۔ محبت ایک ولایت ہے ...... اور یہ ولایت انہیں عطا ہوتی ہے جو ہر غرض سے پاک ہوتے ہیں۔ بے غرض انسان حالتِ امن میں ہوتا ہے ...... اُس سے اُمنِ عالم کو کوئی خطرہ نہیں ہوتا۔ نفرت' حسد' بغض اور کبر ...... انسانی نفس کی متفرق اور متکثر اغراض ہیں ...... اور انہی اغراض ومقاصد کے ٹکراؤ سے جنگ کا طبل بج اُٹھتا ہے۔ محبت ...... وحدت ہے۔ نفرت تکثیر ہے ...... بلکہ وحدت کی تکفیر ہے۔ محبت جمع کرتی ہے ...... افراد کو ...... دلوں کو!! نفرت ...... لوگوں کو تقسیم کرنے کا مکروہ عمل ہے۔ نفرت ...... بھائیوں کے درمیان پہلے دیوار کھینچتی ہے ...... پھر تلوار !!

وسائل پر تصرف کی اندھی خواہش طاقت کی لاٹھی گھمانے پر مجبور کر دیتی ہے۔ اپنے اندر سکون کی دولت سے محروم ہو جانے کے سبب ...... افراد اور اقوام ایک دوسرے کے ساتھ بے سمت اور بے مصرف مقابلے میں مصروف ہیں ...... اور طرفہ تماشا یہ کہ اسی ''مصروفیت'' کا نام ...... ''عمل'' رکھ دیا گیا ہے۔ گویا ہماری ''عملی زندگی'' ...... عملی طور پر باہم متحارب ہونے اور مسلسل جنگی جنون میں مشغول رہنے کا نام ہے۔ جنگی جنون میں مبتلا ہونا ...... شعور سے نکل کر شور اور شورش میں مبتلا ہونا ہے۔ قوموں کے درمیان وسائل پر جھگڑا تصادم کی شکل اختیار کر لیتا ہے ...... اور تصادم میں سب سے پہلے جس چیز کا خون ہوتا ہے' وہ انسانی وقار' عقل اور شعور ہے۔ جب تک حالتِ اُمن اندر نافذ نہ ہو ...... باہر

امن کی حالت کا نفاذ ممکن نہیں ۔ جنگ و جدل سے نجات' خواہش سے نجات حاصل کئے بغیر ممکن نہیں ۔

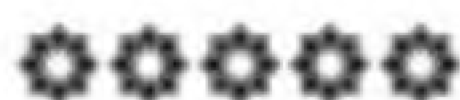
اَمن ...... امان دیئے بغیر ممکن نہیں ۔اور امان ایک طاقتور ہی کمزور کو دے سکتا ہے ...... یوں قیام امن کی ذمہ داری ہمیشہ طاقتور کے سر ہی رہے گی ۔ امان ...... معافی کی طرح غیر مشروط ہوتا ہے۔ مشروط اَمان کو باجگزاری کہتے ہیں ۔امن کا قیام اس وقت تک نہیں ہوسکتا جب تک طاقت کی تلوار تہذیب کے نیام میں ڈالنے کی تمنا بیدار نہیں ہو جاتی ۔

اَمن کا خرمن ...... بیا کا گھونسلہ ہے ...... برداشت اور رَواداری کا تنکا تنکا جمع کرنے سے بنتا ہے ۔ایک شعلۂ استکبار ...... اَمن کے خرمن کو جلا کر راکھ کر دیتا ہے ۔

اسلام ...... (کا سلام ہے' مخلوق کے نام ! السلامُ علیکم ...... سلامتی کا پیغام ہے ...... اگر کوئی قبول کرے !! کتنی بڑی رحمت کا بادل انسانیت کے سروں پر اُمڈ آیا تھا ...... اُس روز جب رنگ ، نسل اور زبان کے تعصبات یک قلم مٹی میں ملا دیئے گئے ...... جبلِ رحمت پر رحمتِ عالم مجسم ہوگئی ...... پوری انسانیت کیلئے پیغام رحمت امن ، سکون اور سلامتی کا پیغام' عرفات کی فضاؤں اور نداؤں کو عطر بیز کر رہا تھا ۔ عالمِ انسانیت میں یہ کس شان کی وحدت تھی اور کیسی وحدت کی شان تھی کہ رنگ ، نسل اور زبان کے فخر و مباہات اور تعصبات ...... وقوفِ عرفات کے روز موقوف ہو چکے تھے ۔استحصال کا ہر ممکنہ پہلو قلم زد کر دیا گیا ...... سُودی کاروبار بلا تخصیص سُود وزیاں بیک جنبشِ قلم روک دیا گیا۔ انسانی مذاہب کی تاریخ نے اپنے صفحات میں ایک ایسی سنہری بات محفوظ کر لی جو رہتی دنیا تک اَمن عالم کی ضمانت ہے ...... بانئ دینِ مبین ؑ ایک عام مسلمان کی جان و آبرو کو کعبہ سے بڑھ کر محترم قرار دے رہے ہیں ۔ اس سے پہلے انسانی لہو معبدوں کی حرمت پر بہتا چلا آتا تھا ۔ آج دُنیائے عالم کے مذاہب کی تکمیل اِس بات پر ہو رہی ہے کہ انسان کو تحریم حاصل ہے ...... انسان کی تکریم اَولی

ہے۔آج فکرِ انسانی کو ایک نیا رُخ دیا جاتا ہے...... انسان مقدس ہے...... انسان مقدم ہے اور ہر وہ چیز مؤخر' جو انسان کی تکریم کی راہ میں حائل ہے...... یہاں تک کہ نماز باجماعت کیلئے بھی دوڑ کر شامل ہونے کی ممانعت کی گئی ...... کہ دوڑ خواہ کیسی ہی ہو' اِنسانی وقار کے منافی ہے۔

خطبہ حجتہ الوداع پوری انسانیت کیلئے ہر دَور میں اُمن کا پیغام ہے...... اور اِس پیغامِ اُمن پر عمل درآمد عالمی اُمن کی ضمانت ہے!



بے ضرر...... محفوظ ہے!

ضرر رساں...... غیر محفوظ......!!

(دلِ ہر قطرہ)

برداشت اور عدم برداشت!

برداشت اور عدم برداشت کا تعلق اِخلاقی جذبے سے کہیں بڑھ کر دینی جذبے کے ساتھ ہے۔ برداشت کا راستہ خالصتاً اِلَی اللّٰہ ہوتا ہے...... اس لیے مَعَ اللّٰہ ہوتا ہے۔ اسی طرح عدم برداشت کا دائرہ صرف دینی غیرت وحمیّت ہے ۔ عدم برداشت کی جا' اگر دینی غیرت ہے تو بجا...... لیکن اگر جا بجا ہے تو ناروا ...... بلکہ ذاتی اَنا!! اگر عدم برداشت ذاتی اَنا کی بنا پر ہو' تو اِس کا حشر غروراور تکبر کے دائرے میں ہوگا۔ جب غرور کے دائرے میں حشر ہوتا ہے تو انجام بالعموم عبرت کے دائرے میں نشر ہوتا ہے۔قوم، قبیلے، رنگ، نسل اور زبان کا تعصب دراصل غرور اور تکبر کی ایک اجتماعی شکل ہے۔ ہمارے دینی بھائیوں اور دینی جماعتوں میں برداشت کا جوہر سب سے زیادہ ہونا چاہیے۔اس لیے کہ برداشت کا تعلق صبر کے ساتھ ہے اور اہل ایمان کو صبر اور صلوٰۃ سے مدد لینے کا حکم ہے۔عدم برداشت بے صبری کا مظاہرہ ہے اور بے صبری صرف دنیا دار کا خاصہ ہے...... کہ وہ عاقبت کا انتظار نہیں کرسکتا۔ دین کی تبلیغ گفتار سے زیادہ کردار سے ہوتی ہے۔اس لیے ایک دین دار شخص کی گفتگو اور رویہ قوتِ برداشت کا شاہکار ہونا چاہیے کہ وہ دین کی نمائندگی کر رہا ہے۔ دین کا جوہر اخلاص اور اخلاق ہے...... عبادات میں اخلاص ...... اور معاملات میں اخلاق!! اگر دین کی نمائندگی کرنے والے برداشت اور صبر کا دامن بار بار چھوڑ دیں اور دوسری

طرف دنیادار لوگ اپنی سیکولر اخلاقیات کے سہارے برداشت پر مبنی مثال اور معاشرے قائم کر دیں تو ایک عام آدمی اپنا رُخ کس طرف کرے گا؟ ظاہر ہے ایسی صورت میں وہ بغداد، دمشق اور ریاض کی بجائے لندن، پیرس اور روم کی معاشرت کا حصہ بننا پسند کرے گا۔ دین سے بیزاری کہیں ہماری مردم آزاری کا ردِّعمل تو نہیں؟ کیا ہم اُسی دین کے پرچارک ہیں جس کا کلیۂ اوّل اَز رُوئے حدیث یہ ہے کہ تم میں سے کوئی شخص اُس وقت تک مسلمان نہیں ہوسکتا جب تک کہ اُس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ نہ ہوں۔

دین کا رستہ درحقیقت اپنی نفی کا راستہ ہے...... اس لیے دینی غیرت وحمیت' غصے اور تعصب سے ایسے ہی جدا ہے' جیسے نور ظلمت سے۔ غیرت اور غصے میں وہی فرق ہوتا ہے جو خوشبو اور بدبو میں ہے۔ ذاتی اَنا کیلئے زندگی گزارنے والا جب کسی دینی کام میں ہاتھ ڈالتا ہے تو فساد برپا کر دیتا ہے۔ وہ کلمۂ حق کو بھی اپنی ذاتی اَنا بنا لیتا ہے۔ کلمے کی اصل دراصل خود پرستی کی نفی ہے...... خدا پرستی خود پرستی کی نفی ہے۔ خودی کی نفی کیے بغیر جب انسان خدا کا تصور کرتا ہے تو وہ اُس کی اپنی فہم کے بت کے سوا اور کیا ہوتا ہے؟ یہی وجہ ہے کہ رسالتؐ کے واسطے کے بغیر توحید کا اقرار ناممکن ہے۔ اللہ سے محبت کا دعویٰ رسول کریم ﷺ کی متابعت کے بغیر معتبر نہیں ٹھہرتا۔ اتباع درحقیقت اتباعِ کردار ہے۔ پیروی نقوشِ قدم کی تلاش کا نام ہے۔ آپ ﷺ کے نقوشِ قدم مکارمِ اخلاق ہیں۔ دینِ مبین رسولِ امینؐ کا لایا ہوا دین ہے۔ رسولِ رحمت ﷺ جس دین کے ساتھ مبعوث ہوئے' وہ دین رحمت ہے۔ دینِ رحمت میں داخل ہونے والا لامحالہ مخلوقِ خدا کے حق میں رحم دل ہو جاتا ہے۔ رحم کیا ہے؟ قطبِ ارشاد حضرت واصف علی واصفؒ کا فرمان ہے: ''رحم اُس فضل کا نام ہے جو اِنسانوں پر اُن کی خامیوں کے باوجود کیا جائے''۔ اگر ہم اپنے لیے خدا سے رحم کے طلبگار ہیں تو مخلوقِ خدا کیلئے رحمت کا سائبان بنیں...... یعنی دوسروں کی خامیوں پر اپنی

برداشت کی چادر ڈالیں...... اپنے عفو کی عبا میں دوسروں کے عیوب چھپانا' اس ذات کے قرب کا باعث بن سکتا ہے جو ستارُ العیوب ہے۔

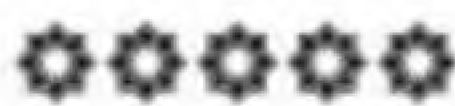
وہ شخص چمن کی سَیر کیا کرے گا جس کی نظر پھول اور خوشبو کی بجائے کانٹے اور کھاد پر پڑے۔ اصلاح کے باب میں کسی کی خامیاں گنوانے سے پہلے اس کی خوبیوں کا بیان جاری کرنا چاہیے...... تاکہ وہ اپنی خوبیوں کا سفر جاری رکھ سکے۔ خامیوں کی نشاندہی وہ کرے' جو خامیوں کو دُور کرنے پر مامور ہے۔ کہا جاتا ہے کہ حسن' دیکھنے والے کی آنکھ میں ہوتا ہے۔ دیکھنے والے کی آنکھ میں حسن اس لیے ہوتا ہے کہ وہ حسن دیکھنے کی خوگر ہوتی ہے۔ خوبی ُحُسن دراصل خوبی ُحُسنِ نظر ہے۔

برداشت اور برداشت کا جوہر صرف اپنی ذاتی اَنا اور مفاد کی قربانی ہے۔ اجتماعی اور ملّی مفاد کا کلیہ اور ہے۔ اگر اجتماعی مفاد اور قومی وقار کے معاملات پر سمجھوتہ در سمجھوتہ ایکسپریس کا سفر جاری رہے تو برداشت اور بے غیرتی میں فرق نہیں رہتا۔ ہم غیروں کی زیادتی برداشت کرتے چلے جاتے ہیں' اپنوں کی نازبرداری برداشت نہیں کرتے۔ جب تک ہم ''رُحَمَاءُ بَینَھُم ''نہیں ہوتے' اَشِدَّاءُ عَلَی الکُفَّار '' کیسے ثابت ہو سکتے ہیں۔ جب ہم اپنے سرمائے کی قدر نہیں کرتے تو وہ غیروں کے کام آتا ہے۔ ہمارا نوجوان ہمارا سرمایہ ہے۔ اُسے سرمایہ داری کی بھینٹ نہ چڑھایا جائے۔

برداشت اگر مبنی بر اِخلاص ہو تو افکار و کردار میں روحانیت کو جنم دیتی ہے۔ اگر برداشت کے پیشِ نظر مفاد اور منفعت کا سودا ہو' تو عین ممکن ہے یہی برداشت اندرونِ خانہ' دِلوں میں منافقت، کینہ اور کدورت پیدا کردے۔ برداشت اگر مزاج کا حصہ بن جائے تو اِنسان متحمل ہو جاتا ہے۔ دراصل ایک متحمل مزاج انسان ہی تخلیقی جذبوں کا حمل اُٹھا سکتا ہے۔

برداشت کا ایک روحانی پہلو یہ ہے کہ انسان ترغیباتِ نفس کی لپک کو برداشت کرے۔ مرغوباتِ نفس کی تکون دولت، شہرت اور عورت کے غیر قائمہ زاویوں سے مل کر بنتی ہے۔ لذائذِ نفس کی نفی کرنا ایک کڑوا کام ہے' لیکن یہی کڑواہٹ اگر برداشت کر لی جائے تو ''دل برداشتہ'' کے اندر تلک مٹھاس کی لہر پیدا کر دیتی ہے۔

برداشت ایک ایسا اخلاقی سبق ہے' جسے سناتے رہنے کی بجائے کر کے دکھایا جانا چاہیے۔ سنی سنائی بات ویسے بھی برداشت نہیں ہوتی۔ برداشت کا درس دینے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اپنے سے کمزور آدمی کی کمزوریاں برداشت کر کے دکھائی جائیں...... اس طرح وہ شخص اپنے سے کمزور لوگوں کو برداشت کرنے کا سبق سیکھ لے گا۔ یوں معاشرے میں برداشت اور رواداری کی سبک خرام ہوا چلنے لگے گی...... سب کو سکون کا سانس آئے گا۔ برداشت یک طرفہ بھی ہو تو دو طرفہ فائدہ دے جاتی ہے۔ کاروبارِ گلشن یا گلشن کاروبار...... جیو اور جینے دو کے اصول پر چلتے ہیں۔ برداشت اجنبی کو دوست بنا دیتی ہے...... عدم برداشت دوستوں میں اجنبیت پیدا کر دیتی ہے۔ دراصل برداشت اتنی بڑی قوت ہے کہ غیریت کو اپنایت میں بدل دیتی ہے۔ اس کے برعکس عدم برداشت اپنوں کو غیروں کے حوالے کر دیتی ہے۔ عدم برداشت نفرت کے بیج بوتی ہے اور برداشت محبت کی کونپلوں کو گلاب میں تبدیل کر دیتی ہے۔ فیصلہ ہمارے ہاتھ میں ہے...... ہم دلوں کی زمین میں نفرت کا جھاڑ جھنکار اور کدورت کی باڑیں لگاتے ہیں' یا محبت کی تاحدِ نظر لہلہاتی فصل بوتے ہیں۔ فصل محبت کی ہو یا نفرت کی...... اسے ایک نسل بوتی ہے اور کئی نسلیں کاٹتی ہیں۔



''سب سے بڑی قوت' قوتِ برداشت ہے''

فصل گل ہو یا فصل دل ...... جس کی برداشت زیادہ ہوتی ہے' وہ فصل زیادہ بارآور ہوتی ہے ۔ برداشت کا تعلق قوت سے ہے اور قوت کا تعلق برداشت سے!! برداشت ایک تخلیقی قوت ہے۔قوتِ برداشت حسن کو عدم سے وجود میں لاتی ہے اور عدم برداشت وجودِ حسن کو سوئے عدم لے جاتی ہے ۔ برداشت ترتیب کا باعث ہے اور ترتیب جب اپنے حسنِ ترتیب کو پہنچتی ہے تو حسن کہلاتی ہے ۔ برداشت مخفی کو ظہور میں لاتی ہے ۔ درحقیقت باطن میں موجود بے پایاں حسن کو پردۂ ظاہر پر لانے کی موجد قوت کا نام برداشت ہے ۔عدم برداشت ایک داخلی انتشار ہے ۔جس طرح بڑھاپے میں عناصر میں انتشار رونما ہو جانے سے زندگی کا دیا مدھم پڑنے لگتا ہے' اسی طرح اگر خیال میں انتشار واقع ہو جائے تو ہماری معنوی زندگی روشنی دینے سے انکار کر دیتی ہے ۔ بہر حال انتشار وجود میں ہو یا خیال میں' زندگی کی لَو مدھم پڑ جانے کی علامت ہے ۔

برداشت دانائی کا پیش خیمہ ہے ۔ جب ہم برداشت کے خیمے میں داخل ہوتے ہیں تو ہمیں توقف اور تفکر کا موقع ملتا ہے ۔ تفکر کی خوبی یہ ہے کہ انسان سب سے پہلے اپنی خامیوں پر متفکر ہوتا ہے ۔ جب تک اپنی خامیاں نگاہ میں رہیں' اِنسان غرور کے پھندے میں نہیں پھنستا ۔ اپنی کوتاہیاں پیش نظر ہوں تو دوسروں کو معاف کرنا آسان ہو جاتا ہے ۔ ہمیں دوسروں کے عمل سے زیادہ اُن کی نیت پر غصہ آتا ہے ...... حالانکہ دوسروں کی نیت کے متعلق پیشن گوئی اُن کے متعلق ہمارا ایک گمان ہی تو ہوتا ہے ...... اور ہمارا گمان ہمارے اختیار میں

ہے۔گمان اچھا بھی قائم کیا جا سکتا ہے۔نیت کے بھید تو دلوں کے بھید جاننے والا ہی بہتر جانتا ہے۔ ایک چھوٹی سی برداشت' بڑی دانائی دے کر جاتی ہے۔کسی معاشرے میں قوتِ برداشت کا ہونا اُس کے تہذیب یافتہ ہونے کی علامت ہے۔ عدم برداشت جہالت کی نشانیوں میں سے ہے۔ انسانی تہذیب کی ساری تاریخ بس ایک قوتِ برداشت کی بتدریج ترویج سے عبارت ہے۔

آدم کو مٹی سے پیدا کیا گیا...... اس لیے اِس کی طینت میں عاجزی کو دخل ہے۔ ابنِ آدم جب تک انکسار میں رہتا ہے' اپنے فطری جوہر کے قریب رہتا ہے...... عافیت میں رہتا ہے۔ جب آگ بگولا ہوتا ہے' اپنی طینت سے بغاوت کا مرتکب ہوتا ہے۔ مٹی کا وصف جو اِسے آگ سے ممتاز کرتا ہے' وہ اس کی قوتِ برداشت ہے۔ زمین کی قوتِ نمو' اِس کی قوتِ برداشت کے سبب ہے۔ یہ زمین کی کشادگی ہے کہ بدبودار کو ڈھانپ لیتی ہے اور خوشبودار پیدا کیے چلے جاتی ہے۔صفتِ بوترابی یہی ہے کہ زمین کے بیٹے بھی دوسروں کے بدبودار رویے اپنی برداشت کی عبا میں چھپا لیں ...... بدلہ نہ لیں ...... بلکہ بدبو کے بدل میں خوشبودار رویوں کو فضا میں درد کے سورج کی طرح اُچھال دیں۔ بہشتِ سماوی سے نکل کر آنے والوں پر لازم ہے کہ اپنے جنت زار رویوں سے یہاں بہشتِ ارضی پیدا کریں۔ ظاہر ہے' بہشتی دروازہ زمین پر ہی نصب ہوتا ہے۔

اِخلاقیات کے تمام سوتے برداشت سے پھوٹتے ہیں۔ اِلٰہیات اخلاقیات کے بغیر محض ایک فلسفہ ہے۔گویا دین کو فلسفے سے نکال کر عمل میں داخل کرنے والی قوت' قوتِ برداشت ہے۔ اخلاقیات کا سارا نصاب اپنی اَنا کی تیز دھار تلوار کو برداشت کی نیام میں رکھنے سے ترتیب پاتا ہے۔جس کی اَنا طاقتور ہوتی ہے' اُس کیلئے برداشت ایک کڑا امتحان ہے۔ عاجزی کی گدڑی پہننے والے برداشت کی کڑوی گولی دانت پیسے بغیر نگل لیتے ہیں،

نتیجہ یہ کہ شفایاب ہو جاتے ہیں۔ اِس کے برعکس اَنا کی کلف والے جارجٹ میں ملبوس لوگ خود کو گلیوں بازاروں میں کتنا بھی مہذب ظاہر کریں' جب انسانی معاملات کے آنگن میں آنکلتے ہیں تو یکدم ننگے ہو جاتے ہیں۔

برداشت ایک خالصتاً دینی جذبہ ہے۔ اگر اِسے دین سے ہٹ کر پروموٹ کیا جائے تو self-improvement اور selfishness میں فرق نہیں رہتا۔ صرف اپنے فائدے کیلئے اخلاقیات کا سبق سیکھا جائے تو نفاق اور diplomatic tactics کے ہنر کے سوا اور کیا ہے۔ اِخلاق اور نفاق میں فرق صرف اخلاص کا ہے۔ اِخلاص اپنے مفاد اور مزاج کی نفی کا نام ہے۔ اِخلاص صرف فی سبیل اللہ ہوتا ہے...... اور اللہ ایک ذات کا نام ہے' کسی سائنسی اور اخلاقی مجموعۂ قوانین کا نام نہیں۔ وہ مقدس ذات اپنے مزاج یعنی پسند اور ناپسند کی خبر جس ذات کے ذریعے مخلوق کو دیتی ہے' وہ ذات مخبرِ صادق ﷺ کی ذاتِ اقدس ہے۔ مکّے کی گلیوں میں کوڑا اچھینکنے والی بڑھیا کی خبرگیری سے لے کر طائف کی وادی میں لہو سے وضو کرنے کے بعد اہل طائف کے حق میں دعا کرنے تک ...... سارا سفر اخلاق کا سفر ہے...... اور یہ سفر برداشت کی سواری پر طے ہوتا ہے۔ صلح حدیبیہ سے فتح مکہ تک' سارے معرکے دراصل قوتِ برداشت کے معرکے ہیں۔

ایک مسلمان کیلئے برداشت کا سبق لینا اور اِس پرعمل کرنا کس قدر آسان ہے۔ بس کچھ دیر کیلئے تفکر کے خیمے میں داخل ہونے کی ضرورت ہے۔ آخر ہم عبادت کس لیے کرتے ہیں؟...... اپنے ربّ کا تقرب حاصل کرنے کیلئے!...... اگر ہم معاملات میں تھوڑی سی برداشت پیدا کرلیں تو ہماری عبادت کی ریاضت آسان ہوسکتی ہے۔ ایک مسلمان کی معراج یہ ہے کہ وہ اللہ کے حبیب ﷺ کے قریب ہو جائے...... اور آپ ﷺ معلمِ اخلاق ہیں۔ غور طلب بات ہے' متعلم اگر تعلیمِ اخلاق کو پس پشت ڈال دے تو معلمِ اخلاقؐ کی قربت کیسے

حاصل کر سکے گا۔ قرب، درحقیقت معنوی قربت ہوتی ہے...... وگرنہ ظاہری سنگت تو سنگ و خشت کو بھی حاصل ہوتی ہے۔ ہم ایک چھوٹا سا کام کیوں نہیں کر لیتے...... بس کسی مسلمان کو اپنے سے کم درجے کا مسلمان سمجھنا چھوڑ دیں۔ ایمان دل کا معاملہ ہے اور دل کو دلیل سے ثابت نہیں کیا جا سکتا...... پھر ہم کسی کے بے ایمان یا کم ایمان ہونے کی دلیل آخر کہاں سے لے آتے ہیں؟ کسی مسلمان کو غیر مسلمان سمجھنا چھوڑ دیں تو ہم سب مسلمان ہیں۔ ہمارے دل میں اسلام کی خدمت کرنے کا جذبہ ٹھاٹھیں مارتا ہے...... الحمدللہ! اچھا جذبہ ہے...... بس اس جذبے کو گوندھنے میں اگر ذرا سی برداشت کا نمک ڈال لیا جائے تو لنگر خوب بٹے گا...... سب کو کفایت کرے گا۔ اسلام کی خدمت دراصل مسلمانوں کی خدمت ہے...... فلسفۂ اسلام کی تشریح، اسلام کی خدمت نہیں...... تشریحِ اسلام تو ہماری اپنی اپنی فہم ہے...... کسی کی کم...... کسی کی زیادہ! ہم کیا کرتے ہیں؟ اپنی ذاتی فہم کی بنیاد پر دوسروں کی فہمائش کرتے رہتے ہیں۔ اخلاقی کلیے خود احتسابی کیلئے دیئے جاتے ہیں، دوسروں کا احتساب کرنے کیلئے نہیں۔ اخلاقیات کے اصول اپنی پیمائش کیلئے مقرر کیے جاتے ہیں...... دینی اصول اس لیے نہیں پڑھائے جاتے کہ اِن اصولوں کا فیتا پکڑ کر ہم فٹافٹ دوسروں کے اسلام کا قد ماپتے پھریں...... ہم پہلے قد ماپتے ہیں...... پھر گردن!!

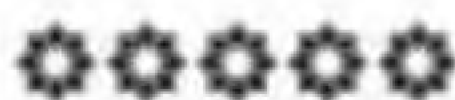
دین ایک دسترخوان ہے...... اور جس ذات نے یہ مائدۂ خیال بچھایا ہے، اُس کا اوڑھنا بچھونا رحمت ہے...... وہ ذات رحمت اللعالمین ﷺ ہے۔ ہم سب اُن کے بچھائے ہوئے دسترخوان پر بطور مہمان مدعو ہیں۔ ایک مہمان کیلئے جائز نہیں کہ وہ دوسرے مہمانوں کو دسترخوان سے اُٹھائے۔

برداشت کا تعلق صبر کے ساتھ ہے۔ برداشت اور صبر کے راستے کا مسافر ایک درجے کا شہید ہوتا ہے۔ وہ شہادت دیتا ہے کہ کوئی ذات موجود ہے جس کی خاطر وہ سب کچھ

برداشت کر رہا ہے......جس کی معیت پانے کیلئے وہ صبر کر رہا ہے......اِنّ اللّٰہ مع الصّابرین!!

قانونِ قدرت ہے کہ کسی خطّے میں مرض بعد میں پیدا ہوتا ہے اور اس کی شفا پہلے پیدا کر دی جاتی ہے......یعنی درد سے پہلے دوا پیدا کرنا اصولِ فطرت ہے۔ ہمارے ملک میں آج تعصب اور تشدد کی وبا پھوٹ چکی ہے لیکن مشیتِ الٰہیہ اس وبا کا سدِّ باب کرنے کیلئے فکرِ واصفؒ کی صورت میں دو دہائیاں قبل ہی ایک دوا پیدا کر چکی ہے ......اور یہ دوا آج کے طلب اور تقاضوں کے مطابق کیپسولیٹڈ فارم capsulated form میں ہے۔ یہ محض عقیدت کی بات نہیں بلکہ حقیقت کی بات ہے کہ اس وقت قوم کو اِسی دوا کی ضرورت ہے ......ان نسخہ ہائے شفا سے فائدہ اٹھا کر شفایاب ہونا چاہیے۔ فی زمانہ یہ واحد فکری نسخہ ہے کہ ہر مکتبۂ فکر اور فقر کیلئے یکساں طور پر تجویز کیا جا سکتا ہے۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اقوالِ واصفؒ ایک طرف جامعہ نعیمیہ سے لیکر جامعہ اشرفیہ اور جامعہ المنتظر کے طلباء میں اور دوسری طرف جامعہ پنجاب سے لیکر ایکن ہاؤس اور لمز یونیورسٹی کے نوجوانوں‘ سب میں یکساں طور پر مقبول ہیں۔ اس وقت اہلِ پاکستان میں ''اتحاد، تنظیم اور یقین'' کا ایک ''ولولۂ تازہ'' پیدا کرنے کیلئے اور مختلف مکتبہ ہائے فکر کو متحد اور متفق رکھنے کیلئے فکرِ واصفؒ ایک نظریاتی اساس کا کام دے سکتا ہے۔ اہلِ پاکستان! کلامِ واصفؒ کی صورت میں ہمارے پاس ایک طرف روحانی سطح پر ''نہج البلاغہ'' کی بازگشت ہے اور دوسری طرف فکرِ قائدؒ اور فکرِ اقبالؒ کی آسان نثر میں نشرِ ثانیہ ہے......اسے نشاۃِ ثانیہ کیلئے استعمال کیا جائے۔ نابغہ ہستیوں کا وجود کسی ملک اور معاشرے کیلئے پروردگار کی نعمتوں میں سے ایک نعمت اور احسان کی طرح ہوتا ہے۔ ضرورت‘ اِس نعمتِ پروردگار سے فائدہ اُٹھانے کی ہے۔ اللہ نہ کرے‘ ہم اپنے پانی، زمین اور موسم جیسی نعمتوں کی طرح اِس نعمت کی بھی ناقدری کے مرتکب ٹھہریں۔

(''حضرت واصف علی واصفؒ کی یاد میں منعقدہ ایک سیمینار بعنوان ''سب سے بڑی قوت‘ قوتِ برداشت ہے'' کے لیے لکھا گیا)



نیکی اور دُنیاداری

دنیادار کی نیکی کی کوکھ میں ایک برائی پوشیدہ ہوتی ہے...... یہ برائی اس وقت جنم لیتی ہے جب وہ اپنی مرضی کی نیکی کرتا ہے یا پھر نیکی میں من مرضی کرنا چاہتا ہے......اور اس من مرضی کا تعلق من سے نہیں، تن سے ہوتا ہے۔ من مرضی کا مطلب من مانی ...... حالانکہ نیکی کی روح تو اپنے من کے ققنس کی راکھ سے جنم لیتی ہے۔ دنیادار صرف اپنے من پسند ماحول میں، اپنے من چاہے لوگوں کے ساتھ، من چاہی نیکی کرنا چاہتا ہے۔ جہاں پر اُسے اپنے پندارِ نفس کے زخمی ہونے کا اندیشہ ہو، وہاں سے وہ راہِ فرار اختیار کرنے میں عافیت سمجھتا ہے، حالانکہ وہیں پر نیکی کرنے کا بہترین موقع میسر آتا ہے۔ وہ اپنی متاعِ زندگی صرف اپنے لئے بچا کر اور سجا کر رکھنا چاہتا ہے ...... اور بچا کھچا سب کچھ نیکی کے نام پر غریبوں میں نچھاور کرنے کا دعویٰ کرتا ہے۔ کاروبارِ زندگی کا یہی معمول اُس کی نظر میں نیکی کہلاتا ہے۔ اِس طرح وہ نیکی کے معاملے میں بھی اپنے نفس کی لگائی ہوئی گھات یعنی توجیہات کے جال میں پھنستا چلا جاتا ہے۔ جال توجیہہ کا ہو یا تشبیہ کا ...... اس میں گرفتار ہونا یا تو لالچ کے سبب ہوتا ہے یا پھر غفلت کے سبب! لالچ سب کی نظر میں ہوتا ہے...... لیکن غفلت نظر نہیں آتی ...... یہاں تک کہ خود کو بھی نہیں ...... اِسی لیے اہلِ نظر کے نزدیک غفلت سب سے بڑا گناہ ہے۔ غفلت سب گناہوں کی جڑ ہے...... کیونکہ یہ نزدیک کو دُور کرنے کا موجب ہے۔

دنیا دار نیکی اس لیے کرتا ہے کہ نیکی کرنا اُسے منفعت بخش معلوم ہوتا ہے۔ اُس نے نیکی کے نام پر کبھی گھاٹے کا سودا نہیں کیا۔ نیکی کا سفر اُس کیلئے کسی خواہش کی تکمیل کا سفر بھی ہوتا ہے۔ وہ نیکی کے نام پر لٹنا نہیں، لُوٹنا چاہتا ہے...... عزت، دولت، ثواب۔ وہ بھول جاتا ہے کہ نیکی کے سفر میں جس دِل میں لُٹنے کی تمنا نہ ہو، اُسے راستے ہی سے لوٹا دیا جاتا ہے۔ دنیا دار دوسروں کی دنیا کی خبر نہیں لیتا...... لیکن اُن کے دین کی خبر گیری میں مشغول رہتا ہے۔ وہ محروموں کو اُن کا حق دینے کی بجائے انہیں قناعت کا سبق دینے میں زیادہ دلچسپی رکھتا ہے ۔ وہ دوسروں کے دین کا خیال رکھتا ہے اور اپنی دنیا کا...... حالانکہ دوسروں کی دنیا ہی تو اپنا دین بن جاتی ہے ...... یعنی دوسروں کی دنیا سنوارنے سے اپنا دین سنورتا ہے۔

دنیا دار کے پاس چیزوں کو ماپنے کیلئے صرف ایک ہی پیمانہ ہوتا ہے...... اور وہ پیمانہ قدر کی بجائے مقدار ماپتا ہے۔ نیکی ماپنے کیلئے بھی وہ قدر کی بجائے قدآوری اور قبولیت کی بجائے مقبولیت کے باٹ استعمال کرتا ہے۔ وہ نذر کے نام پر جو کچھ پیش کرتا ہے، وہ نمود و نمائش ہوتی ہے۔ وہ خدا کے نام پر خود جھکتا نہیں ...... دوسروں کو جھکانا چاہتا ہے۔ دراصل اصلاح کے نام کی کوئی اصطلاح جب کسی کم ظرف کے ہاتھ میں آتی ہے تو وہ خود اصلاح پکڑنے کی بجائے دوسروں کو پکڑنے کا کام اپنے ذمے لے لیتا ہے...... اور اُس کا یہ طرزِ عمل پکار پکار کر کہہ رہا ہوتا ہے...... ''ہم ہی تو ہیں اصلاح کرنے والے''۔ دنیا داروں میں سے بدترین دنیا دار وہ ہے جو دین کے نام پر اپنی دنیا کی دکان سجا کر بیٹھ جاتا ہے...... یہ دکان اُس کے مزاج اور مفاد کی ہوتی ہے...... لیکن باہر سائن بورڈ پر نام اور کام دین کا لکھا ہوتا ہے۔ دنیا دار نیکی کے نام پر فوراً ہی مرنے مارنے پر تُل جاتا ہے۔ وہ اپنی نذر اور اُس کی قبولیت کے درمیان اتنا بھی انتظار نہیں کر سکتا، جتنا کبھی قابیل نے کیا تھا۔ وہ اپنی نیکی کا صلہ پانے میں بسا اوقات اِس قدر عجلت کا مظاہرہ کرتا ہے کہ نیکی کرنے سے بھی پہلے اُس

کا معاوضہ لینے کیلئے اُٹھ کھڑا ہوتا ہے...... مخلوقِ خدا کو دکھانے کیلئے اُس کے پاس یہ سند ہی کافی ہوتی ہے کہ اُس کا اِرادہ نیکی کا تھا۔ شکریہ وصول کرنا یا داد وصول کرنا دراصل اپنی نیکی کا معاوضہ وصول کرنا ہے۔ دنیا دار دیگر ادائیگیوں کی طرح شکریے کی ادائیگی کو بھی صرف دوسروں کا فرض جانتا ہے لیکن اپنے فرائض کی ادائیگی کو دوسروں پر احسان تصور کرتا ہے۔ ضرورتمندوں کو پہلے قطار کی صورت میں لائن حاضر کرنا اور پھر اُن کے سروں پر تھکاوٹ، اِحسان اور کچھ مادی اشیاء کا بوجھ لاد دینا...... نیکی نہیں کہلاتا۔ نیکی تو مانگنے والے کو اس کی منہ مانگی شئے' مانگنے سے بھی پہلے دینے کا نام ہے۔ مانگنے والے کی ضرورت پوری کرنا تو فرائض کے زمرے میں آتا ہے۔ مانگنے پر ضرورت پوری کی تو گویا شرمندہ کیا...... خود کو آئینۂ سخاوت کے سامنے...... اور سائل کو اُس کی عزتِ نفس کے آئینے میں ...... یہ بھرم رکھنا نہیں' بھرم پھوڑنا ہے۔ سخی اپنی سخاوت کے ذریعے مخلوق کی ضرورتوں کے' اور مجبوریوں کے عیب ڈھانپتا ہے...... یوں سخی خدا کے قریب ہوتا ہے۔

مال دار کی روحانیت اُس کا سخی ہونا ہے۔ سخی ہونے کیلئے تجوری میں مال سے کہیں بڑھ کر دل میں مال خرچ کرنے کا حوصلہ ہونا ضروری ہے۔ سخی کی نشانی یہ ہے کہ وہ گنتی نہیں کرتا...... اسی لیے تو اسے بے حساب رزق عطا کیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے جسے بے حساب رزق عطا ہو جائے' اُسے حساب کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ گن گن کر رکھنے والا بخیل بھی ہوتا ہے اور بزدل بھی۔ دراصل ہر بخیل شخص بزدل ہوتا ہے...... وہ غریب ہونے سے ڈرتا ہے۔ جمع کرنے والے کی تجوری کسی دن خالی ہو جاتی ہے...... جو تقسیم کرتا رہتا ہے اس کی نظر اور خزانہ دونوں بھرے رہتے ہیں۔ سخی کا خزانہ تجوری میں نہیں ...... غیب میں جمع ہوتا ہے...... اور غیب لامحدود ہوتا ہے ...... جبکہ ظاہر اور ظاہر کا ہر حاصل ...... محدود!! جمع کرنے اور تقسیم کرنے میں چنداں فرق نہیں ...... بس عقل مندی سے جمع کرنے کو تقسیم

کرنا کہتے ہیں ...... یعنی ظاہر میں تقسیم کرو اور غیب میں جمع کرلو!!

درحقیقت مال دار ایک عیال دار کی طرح ہوتا ہے ...... جس طرح عیال دار شخص اِس لیے عیال دار کہلاتا ہے کہ اُس کے ذمے ایک کنبے کی معاشی و معاشرتی ذمہ داریاں ہوتی ہیں، اسی طرح ایک مال دار شخص بھی اِس لیے مال دار ہوتا ہے کہ وہ غریبوں کی معاشی کفالت کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ وہ مال دار جو دین دار بھی ہو ...... بلکہ وہ دین دار جو مال دار بھی ہو ...... وہ جانتا ہے کہ اُس کے پاس بہت سا مال دوسروں کی امانت کے طور پر جمع ہے ...... وہ دیانت داری سے مستحق افراد کو اُن کی امانتیں پہنچاتا رہتا ہے ...... اور امین کہلاتا ہے ...... وہ جانتا ہے کہ ایک دیانت دار تاجر قیامت کے روز انبیاء اور شہداء کے ساتھ ہوگا۔ قیامت کو نظر میں رکھنے والوں کیلئے ہر روز، روزِ حشر ہے۔

نیکی کا جوہر ...... انسانیت کی قدر کرنا ہے۔ جو انسان کی قدر نہ کر سکا، وہ نیکی کی قدر کیا پہچانے گا۔ دنیادار کے نزدیک انسان بھی اَشیائے صَرف کی طرح ہوتے ہیں، جن کے وہ نرخ طے کرتا رہتا ہے ...... وہ انسانوں کو صَرف کرتا رہتا ہے اور چیزوں کو جمع کرتا رہتا ہے۔ جو شخص اپنے ساتھ انسان جوڑتا رہا اور چیزیں خرچ کرتا رہا ...... وہ دین کمانے میں کامیاب ہوگیا ...... اور جو شخص چیزیں جمع کرتا رہا اور انسان ضائع کرتا رہا، اس نے دراصل دین ضائع کیا ...... اُس نے گھاٹے کا سودا کیا ...... اُس کے اعمال کا پلڑا ہلکا رہ گیا ...... کیونکہ اس نے اپنے ربّ کے شاہکار یعنی انسان کو اشیاء کے مقابلے میں ہلکا جانا۔ روزِ قیامت جب میزانِ عمل میں سب سے بھاری چیز حسنِ اخلاق ہوگی، تو حسنِ اِخلاق کی طرف آج ہی سے کیوں نہ توجہ کی جائے! حسنِ اِخلاق کا پہلا مرحلہ یہ ہے کہ انسان، انسان کی طرف متوجہ ہوجائے۔ حسنِ اخلاق ...... انسانوں کے ساتھ کیا گیا حسنِ سلوک ہی تو ہوتا ہے۔ حسنِ اخلاق یقیناً ایک بھاری عمل ہے ...... کیونکہ کسی ''ہلکے'' انسان کے ساتھ

بااخلاق ہونا نفس پر بہت بھاری ہوتا ہے۔ عام آدمی سے نیکی کرنا ایک بڑی بات ہے۔ خالص نیکی وہی ہے جو انسان ایک ایسے عامی انسان سے کرتا ہے' جو اُس کے احسان کو نہ تو واپس لوٹانے کی استطاعت رکھتا ہو اور نہ اسے مشتہر کرنے کی استعداد ہی رکھتا ہو۔ بہترین نیکی بہترین اخلاق ہے۔ بہترین اخلاق سب سے بہتر نیکی ہے۔

دراصل نیکی کے قریب بھی پہنچنے کیلئے اپنی عزیز متاع سے دُور ہونا پڑتا ہے...... یعنی اپنی عزیز ترین متاع کو خرچ کرنا پڑتا ہے۔ نیکی تو ایسی نازک طبع ہوتی ہے کہ اسے اگر شبہ بھی ہو جائے کہ قیمتی متاع کو پہلی اور اسے دوسری ترجیح دی گئی ہے ...... تو یہ روٹھ جاتی ہے۔ اپنی نیکی یاد دلانے والا' بھلا دیا جاتا ہے...... جو نیکی کر کے بھول جاتا ہے' وہ یاد رہتا ہے۔

نیکی توفیقِ خداوندی ہے۔ نیکی بھی ایک شہرِ حرمت ہے...... کسی انسان کے بس کی بات نہیں کہ وہ اِذنِ خداوندی کے بغیر نیکی کی مقدّس وادی میں قدم رکھے۔ دراصل زمان و مکاں کی بے کنار وسعتوں میں نیک عمل کرنے کیلئے میسر افراد' وسائل اور وقت کا ایک ساتھ ہم آہنگ ہو جانا...... اور ان سب معاملات کا synchronize ہو جانا...... بشری اختیار میں ہرگز نہیں...... اس لیے نیکی بھی ''سرزد'' ہوتی ہے اور توفیقِ الٰہی کہلاتی ہے۔ جب کسی نیک عمل کا پایۂ تکمیل تک پہنچنا سراسر توفیقِ الٰہی پر منحصر ہے' تو انسان نیکی کو اپنی جانب منسوب کر کے برائی کا مرتکب کیوں ہوتا ہے؟

نیکی کی راہ پر چلنے والا کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈرتا۔ نیکی کے سفر میں ملامت' نیکی پر استقامت جانچنے کیلئے آتی ہے۔ سچے اور سُچے مسافر اِس کسوٹی پر پورا اُترتے ہیں...... اور مقیم کہلاتے ہیں۔ نیکی کی راہ پر چلنے والا' چلتے چلتے اِخلاص کی وادی میں پہنچ جاتا ہے...... اور وادیٔ اِخلاص وہ ہے' جہاں شش جہات کا کوئی تصور نہیں...... نہ شرق ہے' نہ غرب...... نہ دایاں' نہ بایاں...... نہ اپنا' نہ غیر۔ جہانِ اخلاص میں مفاد کا سایہ نہیں

پڑتا...... یہ وادی' وادیٔ بے گمان ہے ...... اس لیے یہاں شیطان کا بس نہیں چلتا۔ جہانِ اخلاص میں مقیم انسان کی پہچان بھی عام آدمی کے بس کی بات نہیں۔ اخلاص اگر چنبے کی بوٹی ہے تو اِس کی خوشبو...... بس مخلصین ہی پہچانتے ہیں۔ مخلصین اُس کے عبد ہیں۔ عبد کو ربّ پہچانتا ہے...... اور ربّ کو اُس کے عبد!!

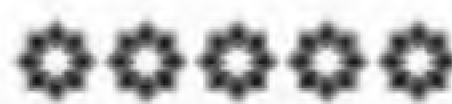
درجۂ اِخلاص تک پہنچنا درحقیقت ماسواء سے ماوراء تک پہنچنا ہے...... اور اِخلاص سے توحید' دو قدم ہے...... یہ کہنے کو دو قدم ہے...... مگر اس بارے میں کچھ کہنا ...... کچھ طے کرنے کے برابر ہے...... اور یہ بھی طے ہے کہ اُس کا بیان صرف انسان کے پاس ہے...... اُس کی شان بیان کرنا اِسی کے شایانِ شان ہے۔ درحقیقت اِخلاص اور توحید ایک ہی سورۃ میں جمع ہیں ...... اور اِس سورۃ کی شرح بصورتِ انسان کھلتی ہے۔ وحدہ' لاشریک کی شرح جس صورت میں کھلتی ہے...... وہ بلاشرکتِ غیرے کائنات و مافیہا میں ایک ہی صورت ہے...... یہی وہ صورت ہے جو احسنِ تقویم ہے...... یہی وہ صورت ہے جس کے متعلق عارفوں نے خبر دی:

اِس صورتؐ نوں میں جان آکھاں — جان آکھاں کہ جانِ جہان آکھاں
سچ آکھاں تے ربّ دی شان آکھاں — جس شان تھیں شاناں سب بنیاں

سلام ہے ربّ کائنات کی اُس محبوب صورتؐ پر...... کہ جس کا فرمایا ہوا ایک ایک حرف ...... نیکی کی راہ پر چلنے والوں کیلئے حرفِ آخر ہے۔ سلام ہے اُس احسن تقویم صورتؐ پر کہ جس کا اُسوہ' نیکی کی راہ پانے والوں کی تقویم ہے۔

کیا خوب ہے کہنا...... حضرت واصف علی واصفؒ کا...... در شانِ حُسنِ احسنِ تقویم......

یہی چہرہ' نشانِ وجہُ اللہ — ورنہ رکھتا ہے کیا خدا چہرہ



یاد اور یادداشت!!

یاد کا تعلق دل سے ہے اور دل کا تعلق روح سے۔ یادداشت کا تعلق ذہن سے ہے اور ذہن دماغ کا چربہ ہے۔ دماغ اپنی ماہیتِ تشکیل میں جسم کی چربی ہے۔ وقت کی حدّت سے جب جسم پگھلنا شروع ہوتا ہے تو دماغ بھی کھولنے لگتا ہے۔ کھولتا ہوا دماغ ہو یا پانی ...... بتدریج کم ہوتا رہتا ہے ...... دوسروں کی پرورش کا سامان کیے بغیر!!

جسے دل کی نعمت میسر نہ آسکے اُسے زندگی میں ہر کام صرف ذہن کی مدد سے کرنا ہوتا ہے ...... اور ذہن کی طاقت سے زندگی کی گاڑی کھینچنا ایسے ہے جیسے پہیوں کے بغیر بیل گاڑی کھینچنا۔ ذہن اپنی ذہانت کی اِنتہا تک پہنچ کر بھی دل کی ابتدا تک نہیں پہنچ سکتا۔ ذہن سب کچھ پڑھ لے، تو بھی دِل اور آنکھیں نہیں پڑھ سکتا۔ اِنسانی ذہن منطق کی ناہموار زمین پر منہ کے بل رینگ کر چلتا ہے۔ دراصل ذہن کسی حقیقت تک پہنچنے کیلئے کئی کئی بار اسباب اور نتائج کے ہجے کرتا ہے ...... اس طرح حقیقت بیان کرنے میں ایک مخمصے کا شکار رہتا ہے۔ ذہن اکثر وقات اَسباب اور نتائج کے جوڑ توڑ کرنے میں خود ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جاتا ہے ...... یوں مایوسی کی دلدل میں قدم رکھ دیتا ہے۔ مایوسی کی وادی میں اُترنے والا ایک نشہ کرنے والے کی طرح اس میں دھنستا ہی چلا جاتا ہے ...... یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ ایک وادیٔ ہلاکت ہے۔

دِل کا حال عجب ہے، یہ زبانِ حال سے ناقابلِ بیان حقیقتوں کو بھی بیان میں لے

آتا ہے۔ دل کا چلن عجیب ہے...... چلتا زمین پر ہے...... فاصلے آسمانوں کے طے کرتا ہے ...... آسمانِ خیال کی لامحدود پہنائیوں میں محوِ پرواز رہتا ہے...... بلاخوف وحزن!! دل جانتا ہے...... کیونکہ مانتا ہے...... کہ وہی ہے...... وہی ہے جو پَر پھیلائے ہوئے پرندوں کو ہوا میں تھامے ہوئے ہے...... اگر اُس کی مدد شاملِ حال نہ ہوتی تو خیال کا پنچھی ہوا و ہوس کے نادیدہ جال میں پھنس کر رہ جاتا!!

دل ایک عجب محلِ اَسرار ہے...... یہ روح اور جسم دونوں کا مشترک دارالحکومت ہے ...... اس لیے دل پر جس کا قبضہ ہو جائے...... درحقیقت حکومت اُسی کی ہے۔ ''کشف المحجوب'' میں سیدنا علی ہجویری المعروف حضرت داتا گنج بخشؒ فرماتے ہیں ''توبہ حکومتوں کے بدل جانے کا نام ہے''۔ یعنی نفس کی حکومت کے معزول ہو جانے اور حق کی حکومت قائم ہو جانے کا نام!! توبہ کا مطلب یہ ہوا کہ دل کی سلطنت میں جھوٹے خداؤں کا عمل دخل ختم ہوا اور ایک خدائے واحد کا اَمر جاری ہوا...... بے شک جب حق دل میں داخل ہو جاتا ہے تو باطل کا جانا ٹھہر جاتا ہے...... باطل ایسے کافور ہو جاتا ہے...... جیسے تھا ہی نہیں! بے شک باطل تو تھا ہی نظر کا دھوکا...... جب پانی مل گیا تو پانی کا دھوکا ختم ہوا...... سراب ختم ہوا۔ درحقیقت تخلیقی حقیقتوں میں باطل کا وجود سرے سے موجود ہی نہیں۔

قطبِ ارشاد حضرت واصف علی واصفؒ فرماتے ہیں: ''جب توبہ قبول ہوتی ہے تو گناہ کی یاد بھی ختم ہو جاتی ہے''۔ بڑا پُرلطف جملہ ہے...... اِس میں لطف یہ ہے کہ یہاں یاد کا تذکرہ ہے، یادداشت کا نہیں۔ یاد کا تعلق دِل سے ہے اور دل ایک جائے لطف و کیف ہے ...... گناہ کی یاد ختم ہونے کا مطلب یہ ہوا کہ گناہ کا پُرلطف تذکرہ ختم ہوا۔ جب ندامت پیدا ہو جاتی ہے تو گناہ کی یاد ختم ہو جاتی ہے۔ ندامت ایک جائے ملامت ہے اور یاد ایک جائے لطف و کرامت!! توبہ کے بعد گناہ ندامت بن کر یادداشت میں تو رہ سکتا ہے' لطف بن کر یاد

میں نہیں رہ سکتا۔ یادداشت میں رہنے والی چیز بالآخر خزاں رسیدہ پتے کی طرح جھڑ جاتی ہے اور یاد میں قائم رہنے والی چیز اپنی آب و تاب کے ساتھ زندہ رہتی ہے۔ یادداشت میں تردّد ہے، یاد میں تلذذ!! اسلئے یادداشت بے کیف ہوتی ہے اور یاد کیف آور!!

محبت ...... یکے اَز تصرفاتِ محبوب ہے۔ محبوب کا تصرف براہِ راست دل پر ہوتا ہے۔ دِلبر کی نظر دِل پر پڑتی ہے تو کرم ہو جاتا ہے...... اور کرم کی ایک نشانی یہ ہوتی ہے کہ انسان یادداشت کی قید سے نکل کر یاد کی دنیا میں آباد ہو جاتا ہے۔ یاد کی دنیا میں داخل ہونا بظاہر خود کو گم کرنا ہے...... لیکن کسی کی یاد میں گم ہونے والا کہیں اور دریافت ہو جاتا ہے ...... ظاہر ہے' وہ ظاہر سے نکل کر باطن میں قدم رکھ چکا ہوتا ہے۔

یاد اور یادداشت کی عمر میں وہی فرق ہے جو روح اور جسم کی عمر میں ہوتا ہے۔ اگر کسی وجہ سے دماغی چوٹ لگ جائے، تو یادداشت چلی جاتی ہے' لیکن یاد قائم رہتی ہے۔ اگر چوٹ دل پر لگی ہو تو چہرۂ یار کے نقوش کی طرح یاد کے نقوش بھی انمٹ ہو کر رہ جاتے ہیں۔ بسترِ مرگ پر لیٹا ہوا بوڑھا شخص بھی محبوب کا نام سن کر آنکھیں کھول دیتا ہے۔

یادداشت کا تعلق مادّی اَشیا سے ہے اور یاد کا تعلق رُوحانی دُنیا سے۔ یہی وجہ ہے' کمپیوٹر اور الیکٹرونک آلات صرف یادداشت کا ریکارڈ رکھ سکتے ہیں ...... یاد کا' نہیں! ...... دل کا' نہیں! ...... درد کا' نہیں! ...... درد کے دَرماں کا' نہیں!!

یادداشت کی قید میں گرفتار آدمی حسابی کتابی ہوتا ہے...... وہ گنتا ہے بے حساب، دیتا ہے حساب اور احتساب کے ساتھ...... وہ نئے حساب لگاتا ہے، پرانے حساب چکاتا ہے۔ اس کے برعکس یاد کے شیش محل میں بیٹھا ہوا شخص دِل کا بادشاہ ہوتا ہے...... وہ کھلے ہاتھ اور کھلے دِل والا ہوتا ہے...... وہ دیتا ہے' بغیر حساب کے...... اس لیے اُسے احتساب کا کھٹکا نہیں۔ بغیر حساب دینے والا ہی بے حساب لے سکتا ہے! درحقیقت بااختیار تو

وہی ہے جو دیتے ہوئے بے اختیار ہو جائے۔ گنتی کرتے رہنا منشیوں کا کام ہے..... سخی منش لوگوں کا نہیں!!

یاد محبّ اور محبوب کے درمیان ایک لا سلکی رابطہ ہے۔ یہ رابطہ نظر نہیں آتا لیکن نظر نہ آنے والی حقیقتیں اس رابطے کے بیدار ہونے پر نظر آنے لگتی ہیں۔ یاد..... زمان و مکاں کی پابندیوں کو خاطر میں نہیں لاتی۔..... یادداشت وقت اور جغرافیے کی عقوبت گاہ میں ہے، اپنے انجام یعنی فنا کے گھاٹ اُترنے کی منتظر..... لحظہ بہ لحظہ!!

یادداشت بجائے خود ایک عمر قید ہے..... جب تک ختم نہ ہو جائے' انسان کو رہائی نہیں ملتی۔ یادداشت پر وقت کا حملہ ہوتا ہے، اس لیے یادداشت کی قسمت میں عافیت نہیں ..... چلتے چلتے کسی ناگہانی کا شکار ہو جاتی ہے۔

یادداشت ناتواں ہو جاتی ہے..... یاد ہر دم جواں، پیہم رواں بلکہ جاوداں رہتی ہے۔ یادداشت کا سفر بجانبِ کہولت ہے، یاد کا سفر شعور کی جوانی کی طرف ہے۔ یادداشت' مائل بہ اضمحلال ہوتی ہے..... یاد' فریفتۂ استقلال!! یادداشت بلوغت کو پہنچ کر بھی بچپن تک نہیں پہنچ پاتی..... جبکہ یاد پہلی ہی جست میں عہدِ اَلست کی خبر لے آتی ہے۔

یاد..... صرف ایک کی ہوتی ہے..... یاد صرف اُسی کی ہوتی ہے جو اِسے پیدا کرنے کا موجب بنتا ہے..... یعنی یاد اپنے خالق سے جدا نہیں ہوتی۔ یاد اپنے پیدا کرنے والے کے علاوہ کسی کے سامنے جوابدہ بھی نہیں ہوتی۔ یادداشت کسی کی نہیں ہوتی ..... اِس لیے ہر کسی کے سامنے جوابدہی کا دَم بھرتی ہے۔ یادداشت ماضی کی ہر گلی میں' ہر چوراہے پر' ہر فرد کے سامنے جوابدہی کے کٹہرے میں کھڑی نظر آتی ہے۔

یادداشت کی قید میں موجود منظر نامے زیادہ تر حسرت نامے ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس یاد ایک عکسِ جمال ہے..... جمالِ یار کو پہلے رُوبرو کرتی ہے' پھر ہو بہو!! یاد ناظر اور

مناظر میں دوئی ختم کر دیتی ہے۔ جہاں یاد ہے، وہاں یار ہے...... جہاں تک یاد ہے' وہاں تک یار ہے!! جدائی کہاں، فرقت کہاں، فرقت بیان کرنے کی فرصت کہاں، جو کچھ ہے ہمہ حال ہے!!

شعر کی زبان میں بیان کریں تو یاد اور یادداشت میں وہی فرق ہے جو آمد اور آورد میں ہے۔ نثری لہجے میں بات کریں تو یاد اور یادداشت میں فرق کلمے اور مہمل میں فرق جیسا ہے۔ یادداشت کے کمزور پڑنے پر لوگ مہمل باتیں کرنے لگتے ہیں۔ یاد کلمے سے منسلک ہے...... انسان جس کا کلمہ پڑھتا ہے اس کی یاد سے کبھی غافل نہیں ہوتا۔

یاد علم بن جاتی ہے...... اور علم کو درجۂ استناد تک پہنچا دیتی ہے...... جبکہ یادداشت کا درجہ صرف تعلیمی اَسناد تک محدود رہتا ہے!! علم کی جائے نشست قلب ہے...... تعلیم کی اقامت دماغ تک ہے...... اور یہ اقامت گاہ بہت جلد خالی کروالی جاتی ہے۔ علم جب قلب میں صدر نشیں ہوتا ہے تو دوسروں کا قلب منقلب کرنے کا باعث بن جاتا ہے۔ یہی ہے اِنقلاب کا حقیقی راستہ...... جو سیدھا ہے' سہل ہے اور پُر امن ہے!!

یادداشت ایک بوجھ ہے۔ یاد ایک خوشبو ہے...... اور خوشبو کا سفر زندگی کو بوجھل نہیں ہونے دیتا۔ یاد کا دِیا...... جب روشن ہو جاتا ہے تو فراق کے دُھندلکے سمٹنے لگتے ہیں ...... اور محبوب کا چہرہ روشن تر ہو جاتا ہے۔

یاد براہِ راست دِل میں اُترتی ہے اور دل کو ترازو کر دیتی ہے۔ یاد کو دماغ سے کوئی علاقہ نہیں...... اور دل کا تمام علاقہ یاد کا باجگزار ہے...... اپنی زندگی کیلئے...... زندگی کی سلامتی کیلئے......!!

یادداشت...... دوزخ کی مانند ہوسکتی ہے' جسے بجھانے کیلئے نسیان کی دُعا کرنی پڑتی ہے۔ یاد ہمیشہ کیلئے جنت زار ہے...... جنت یاد کی چھوڑی وراثت ہی تو ہے!!

مناظر میں دوئی ختم کر دیتی ہے۔ جہاں یاد ہے، وہاں یار ہے...... جہاں تک یاد ہے' وہاں تک یار ہے!! جدائی کہاں، فرقت کہاں، فرقت بیان کرنے کی فرصت کہاں، جو کچھ ہے ہمہ حال ہے!!

شعر کی زبان میں بیان کریں تو یاد اور یادداشت میں وہی فرق ہے جو آمد اور آورد میں ہے۔ نثری لہجے میں بات کریں تو یاد اور یادداشت میں فرق کلمے اور مہمل میں فرق جیسا ہے۔ یادداشت کے کمزور پڑنے پر لوگ مہمل باتیں کرنے لگتے ہیں۔ یاد کلمے سے منسلک ہے...... انسان جس کا کلمہ پڑھتا ہے اس کی یاد سے کبھی غافل نہیں ہوتا۔

یاد علم بن جاتی ہے...... اور علم کو درجۂ استناد تک پہنچا دیتی ہے...... جبکہ یادداشت کا درجہ صرف تعلیمی اَسناد تک محدود رہتا ہے!! علم کی جائے نشست قلب ہے...... تعلیم کی اقامت دماغ تک ہے...... اور یہ اقامت گاہ بہت جلد خالی کروالی جاتی ہے۔ علم جب قلب میں صدر نشیں ہوتا ہے تو دوسروں کا قلب منقلب کرنے کا باعث بن جاتا ہے۔ یہی ہے اِنقلاب کا حقیقی راستہ...... جو سیدھا ہے' سہل ہے اور پُر امن ہے!!

یادداشت ایک بوجھ ہے۔ یاد ایک خوشبو ہے...... اور خوشبو کا سفر زندگی کو بوجھل نہیں ہونے دیتا۔ یاد کا دِیا...... جب روشن ہو جاتا ہے تو فراق کے دُھند لکے سمٹنے لگتے ہیں ...... اور محبوب کا چہرہ روشن تر ہو جاتا ہے۔

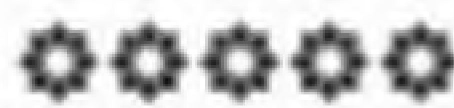
یاد براہِ راست دِل میں اُترتی ہے اور دل کو ترازو کر دیتی ہے۔ یاد کو دماغ سے کوئی علاقہ نہیں...... اور دل کا تمام علاقہ یاد کا باجگزار ہے...... اپنی زندگی کیلئے...... زندگی کی سلامتی کیلئے......!!

یادداشت...... دوزخ کی مانند ہوسکتی ہے' جسے بجھانے کیلئے نسیان کی دُعا کرنی پڑتی ہے۔ یاد ہمیشہ کیلئے جنت زار ہے...... جنت یاد کی چھوڑی وراثت ہی تو ہے!!

یاد محبوب کی ہوتی ہے، یادداشت اشیاء کی ہوتی ہے۔ اس لیے یادداشت شے ہے اور یاد ایک نشانِ لاشئے ہے۔ ہر شے کو فنا ہے ...... اور لاشئے کا ہر نشان فنا کی زد سے باہر رہے گا۔

یاد محبوب کا عطیہ ہے۔ محبوب یکتا ہوتا ہے، اس لیے محبوب کی یاد دوئی سے یکتائی تک لے آتی ہے۔ یاد کے وسیلے ہی سے فراق مائل بہ وصال رہتا ہے۔ یاد کا وسیلہ نہ رہے تو فراق ہمیشہ کیلئے فراق ہو کر رہ جائے ...... اور وصال ایک خواب و خیال ہو جائے۔ یاد ...... روح کا سفر ہے۔ روح کا سفر روح کی جانب ہوتا ہے ...... مادے کی طرف نہیں۔ یاد ...... خیال اور خواب کو معانی دیتی ہے۔ یاد کے وسیلے سے محبّ اپنے محبوب کی عاقبت میں سانجھ پیدا کر لیتا ہے۔ دراصل یاد ایک ایسا خیال ہے جو محبوب کے ساتھ تعلق کو ہمہ حال کر دیتا ہے۔ یاد ...... ایک روحانی ہمسائیگی ہے۔ یاد کے دم سے سنگتیں ہیں ...... اور سنگتوں کے دَم سے میلے ہیں۔ سنگت دراصل یادوں کی سنگت ہے ...... وگرنہ میلے میں ہم سب اکیلے ہیں۔

؎ جس دی یاد اے ساڈے دل وچ
اوہدی ساڈی اِکّو گور



توحید ...... کا ایک مفہوم
محبّ اور محبوب کے درمیان
دوئی کا ختم ہو جانا بھی ہے!
(دلِ ہر قطرہ)

کامیاب ناکامیاں اور ناکام کامیابیاں!

اُس نے سو(۱۰۰) کامیاب آدمیوں کی سوانح لکھی ...... پانچویں کامیاب آدمی کی سوانح لکھتے ہوئے اس نے بتایا کہ اُس نے خودکشی کر لی تھی!!

اگر سمت راست نہ ہو' تو ہر سفر ...... سفرِ معکوس ہے۔اگر راستہ راستی کی طرف نہ لے کر جائے' تو مسافر کا ہر قدم منزل سے دُوری کا عنوان ہے۔اگر نیت باوضو نہ ہو' تو نیک مقامات کا سفر زیارت نہیں' سیاحت کہلاتا ہے...... اس طرح ہر سفر' اِخلاص کی بجائے منافقت کے قریب کرتا ہے۔

اگر نیّت قبلہ رُو ہو جائے تو منزل کی جانب اُٹھنے والا ہر قدم منزل تصور ہوتا ہے ...... یعنی منزل قدم قدم پر ہوتی ہے...... اِسی لیے اہلِ حق کا ہر قدم راہروانِ منزل کیلئے ایک سنگِ میل بنتا چلا جاتا ہے۔

اگر صحتِ مقصد حاصل نہ ہو' اور منزل حاصل ہو جائے تو انسان کامیاب ہونے کے باوجود ناکام رہ جاتا ہے ...... باہر اُس کی کامیابیوں کے جشن ہوتے ہیں اور اندر ضمیر کی عدالت اُسے قیدِ تنہائی کی سزا سنا رہی ہوتی ہے۔دراصل انسان کی سعی جب تک اِخلاص اور رَضا کے صفا مروہ کے درمیان محوِ طواف نہ ہو' اُس کی ہر سعی ایک سعیٔ لاحاصل ہے!! اخلاص کی ایک مخصوص خوشبو ہوتی ہے...... خودغرضی کی ایک خاص بساند ہوتی ہے۔خودغرضی

خود کو خواہ کتنی ہی توجیہات میں ملبوس کرلے' اس کی بُو پہچان لی جاتی ہے۔ بندۂ اخلاص خود غرضی کو پہچان لیتا ہے ...... لیکن بندۂ اغراض اخلاص کی خوشبو کو نہیں پہنچ سکتا۔ خود غرضی قدم قدم پر دھوکا کھاتی ہے ...... لالچ کی سزا کے طور پر!! دراصل لالچ کے مقدر میں دھوکا لکھ دیا گیا ہے۔ اخلاص گرچہ بے رنگ ہوتا ہے لیکن بے حد خوشبودار ہوتا ہے ...... اِس لیے اخلاص کے مسافروں کو قدم قدم پر منزل کا گمان ہوتا ہے۔ بہرحال مقصد کی صحت کا تعین اُس مقصد کے بے غرض ہونے سے لگایا جاسکتا ہے۔ بیمار مقاصد اپنی خود غرضی کی علامات سے الگ پہچان لیے جاتے ہیں ...... جیسے مجرم اپنے چہروں سے پہچان لیے جاتے ہیں۔ خود غرضانہ اور خود پرستانہ مقاصد راستوں کو پیچیدہ کرتے ہیں اور رویّوں کو پراگندہ۔ بےلوث مقصد راستوں کو خوشبودار کرتا ہے اور زندگی کو بے خوف! جب زندگی خوف اور حزن سے آزاد ہوگئی تو کامیابی کے جشن منانے کی ضرورت نہ رہی ...... اور نہ ناکامی پر ندامت ہی لازم ٹھہری۔ دراصل ناکامی میں یہ ہمت نہیں ہوتی کہ وہ کسی بےلوث اور بے خوف مسافر کو منزلِ مراد سے محروم کرسکے!!

مقصد کا تعین اندر کیا جاتا ہے اور منزل کا باہر ...... اس لیے مقصد ہمیشہ کامیابی پر فائق ٹھہرے گا! جب کبھی انتخاب کا دوراہا آئے گا' باہر کی دنیا کا مسافر کامیابی کو مقصد پر ترجیح دے گا اور باطن کا مسافر مقصد کو کامیابی پر!! باطن کی دنیا کا سفیر کامیابی کو ہاتھ کی میل سمجھے گا اور مقصد کو ہتھیلی کا پھوڑا بنا کر رکھے گا!!

اکثر اوقات خواہشات کو مقصد کا نام دے دیا جاتا ہے ...... اور لالچ کو جستجو کا!! ایسے میں کامیابی کا سفر درحقیقت اپنے عشرت کدے اور پھر عبرت کدے تک پہنچنے کا سفر ہے۔ اگر کامیابی کسی خواہش کے حصول کا نام ہے ...... اور خواہش کا نام شہرت ہے تو شہرت کو ایک ''نامور'' عبرت بننے میں دیر نہیں لگتی۔

یہ بات انتہائی قابلِ غور ہے' اگر حکومت ، دولت اور شہرت کے حصول کا نام کامیابی ہے تو فرعون اور قارون کو تاریخ کے کامیاب ترین لوگ قرار دینا پڑے گا اور ......(معاذ اللہ) موسیٰؑ اور ہارونؑ کو ناکام ......مگر تاریخ بہت دانا اور بینا ہے......قرن ہا قرن اِنسانوں کی ناکام کامیابیوں اور کامیاب ناکامیوں کو لکھتے لکھتے تاریخ دانا ہوگئی ہے ......اور دانائی کا تقاضا ہے کہ عزت اور شہرت میں فرق روا رکھے......حکومت کو عبرت سے جدا لکھے۔ بارہا ایسا ہوا کہ غریبی دلوں میں گھر کرتی رہی اور امیری اپنے ہی گھر میں غریب الوطن ہوتی رہی!!

کامیابی کی داد وصول کرنے کی تمنا انسان کو اپنے مقصد سے محجوب کر دیتی ہے۔ جب تک اپنی کامیابی کی داد باہر سے وصول کرنے کی تمنا دل سے رخصت نہیں ہوتی' انسان اپنے اندر کا سفر کرنے میں ناکام رہتا ہے......ظاہر ہے اَندر کا سفر دِل سے شروع ہوتا ہے اور دِل ایک وقت میں ایک ہی کام کرتا ہے......ایک وقت میں صرف ایک چہرہ دیکھتا ہے ......اس لیے چہرے کی یکتائی کا شاہد ہوتا ہے۔ دل' اپنے اندر دلبر نہ دیکھے تو باہر کامیابی کے بے جان بُت دیکھتا رہتا ہے۔

منزل محبوب نہ ہونی چاہیے' بلکہ محبوب منزل ہونا چاہیے۔ جس نے اپنی منزل کو محبوب جانا' وہ اپنے ہم سفروں کے حق میں بہت ظالم ثابت ہوا۔ وہ اپنے بھائی بندوں کے کندھے پھلانگتا ہوا اخلاق اور رواداری کی صفوں کو توڑتا ہوا آگے نکلا...... جب وہ منزل کے قریب پہنچا تو دیکھا کہ اسے جاننے اور پہچاننے والے سب پیچھے رہ گئے۔ وہ اپنی جان پہچان کے لوگوں کو پیچھے چھوڑ آیا تھا۔ اُس کے اردگرد تالیاں بجانے والے لوگ سب اجنبی تھے......وہ کامیابی کے نام پر شہرت کے عوض منزل کا سودا کر چکا تھا!!

مقصد کا تعین کیے بغیر کامیابی کی میراتھن دَوڑ میں شامل ہونا دراصل ایک بے نام

اور بے ہنگم بھیڑ میں گم ہونا ہے۔ کسی مقصد کے حصول میں کامیاب ہونے سے رہ جانا' ناکامی نہیں ...... بلکہ ناکامی یہ ہے کہ انسان کسی بلند تر مقصد کا تعین کرنے میں ناکام رہ جائے۔ کامیابی حاصل کرنا کوئی بہت بڑا مسئلہ نہیں ...... آدھی کامیابی تو انسان اپنے مقصد کا تعین کرنے میں حاصل کر لیتا ہے ...... اور باقی اپنے اندازِ سفر کا تعین کرنے میں!! کامیابی کو انسان نے ایک ہوّا بنالیا ہے ...... اس لیے ہوا کے گھوڑے پر سوار رہتا ہے۔ کامیابی کی دوڑ میں انسان اپنوں سے بچھڑ جاتا ہے ...... اور بچھڑ جانے والا تو پیچھے رہ جانے والا ہوتا ہے!!

عجب تضاد ہے' ہم اپنے بچوں کے کانوں میں شروع دن سے ''زندگی کی دوڑ'' ...... survival of the fittest اور struggle for existence ...... قسم کے نعرے ٹھونستے رہتے ہیں ...... اور پھر ''کامیابی کی چابی'' سے چلنے والے روبوٹ قسم کے بچوں کے رویوں کے متعلق حیران بھی ہوتے ہیں کہ آج کے بچے بات بات پر مشتعل کیوں ہو جاتے ہیں۔ ہم سوچتے کیوں نہیں کہ دوڑتے ہوئے شخص کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت اس کا ساتھ نہیں دے سکتی۔ کامیابی کے اس ''بین الاقوامی'' تصور نے زندگی کو مقابلے کا امتحان بنا کر رکھ دیا ہے۔ ایک ایسا امتحان جس سے وہ عمر بھر عہدہ برآ نہیں ہو پاتا ...... بلند و بالا عہدوں پر فائز ہونے کے باوجود!! ہر طرف مقابلہ ہے، مجادلہ ہے ...... اور پھر مقاتلہ ہے ...... مکانوں کا مقابلہ' گاڑیوں کا مقابلہ' مرتبوں اور منصبوں کا مقابلہ! گویا اچھی بھلی خوش و خرم، خراماں خراماں زندگی دنگل میں اُتر گئی ...... اور پھر اس دنگل میں دنگا فساد عین قانونی قرار پایا۔ محبت اور جنگ میں سب کچھ جائز قرار دے دیا گیا ...... گویا محبت نہ ہوئی' چھینا جھپٹی کی ایک دَوڑ ہوئی۔ اس تصورِ حیات نے انسان کی زندگی سے سکون، اطمینان، توکل اور قناعت جیسے خوبصورت تصورات تو کیا' الفاظ تک چھین لیے ہیں۔ اب وہ صرف اسلامیات کی کتابوں میں ایسی اصطلاحات پڑھتا ہے ...... اور بدقسمتی سے وہ بھی محض مقابلے

اور بے ہنگم بھیڑ میں گم ہونا ہے۔ کسی مقصد کے حصول میں کامیاب ہونے سے رہ جانا' ناکامی نہیں ...... بلکہ ناکامی یہ ہے کہ انسان کسی بلند تر مقصد کا تعین کرنے میں ناکام رہ جائے۔ کامیابی حاصل کرنا کوئی بہت بڑا مسئلہ نہیں ...... آدھی کامیابی تو انسان اپنے مقصد کا تعین کرنے میں حاصل کر لیتا ہے ...... اور باقی اپنے اندازِ سفر کا تعین کرنے میں!! کامیابی کو انسان نے ایک ہوّا بنا لیا ہے ...... اس لیے ہوا کے گھوڑے پر سوار رہتا ہے۔ کامیابی کی دوڑ میں انسان اپنوں سے بچھڑ جاتا ہے ...... اور بچھڑ جانے والا تو پیچھے رہ جانے والا ہوتا ہے!!

عجب تضاد ہے' ہم اپنے بچوں کے کانوں میں شروع دن سے ''زندگی کی دوڑ'' struggle for existence اور survival of the fittest ...... قسم کے نعرے ٹھونستے رہتے ہیں ...... اور پھر ''کامیابی کی چابی'' سے چلنے والے روبوٹ قسم کے بچوں کے رویوں کے متعلق حیران بھی ہوتے ہیں کہ آج کے بچے بات بات پر مشتعل کیوں ہو جاتے ہیں۔ ہم سوچتے کیوں نہیں کہ دوڑتے ہوئے شخص کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت اس کا ساتھ نہیں دے سکتی۔ کامیابی کے اس ''بین الاقوامی'' تصور نے زندگی کو مقابلے کا امتحان بنا کر رکھ دیا ہے۔ ایک ایسا امتحان جس سے وہ عمر بھر عہدہ برآ نہیں ہو پاتا ...... بلند و بالا عہدوں پر فائز ہونے کے باوجود!! ہر طرف مقابلہ ہے، مجادلہ ہے ...... اور پھر مقاتلہ ہے ...... مکانوں کا مقابلہ' گاڑیوں کا مقابلہ' مرتبوں اور منصبوں کا مقابلہ! گویا اچھی بھلی خوش و خرم، خراماں خراماں زندگی دنگل میں اُتر گئی ...... اور پھر اس دنگل میں دنگا فساد عین قانونی قرار پایا۔ محبت اور جنگ میں سب کچھ جائز قرار دے دیا گیا ...... گویا محبت نہ ہوئی' چھینا جھپٹی کی ایک دَوڑ ہوئی۔ اس تصورِ حیات نے انسان کی زندگی سے سکون، اطمینان، توکل اور قناعت جیسے خوبصورت تصورات تو کیا' الفاظ تک چھین لیے ہیں۔ اب وہ صرف اسلامیات کی کتابوں میں ایسی اصطلاحات پڑھتا ہے ...... اور بدقسمتی سے وہ بھی محض مقابلے

کا امتحان پاس کرنے کیلئے! وہ ادارے جہاں سے اِن روحانی اصطلاحات کی تشریحِ باعمل ہو اکرتی تھی' وہاں اپنے اپنے مریدین' متعلقین اور معتقدین کی تعداد اور پھر اُن کے اثر ورسوخ میں مقابلے کی دَوڑ شروع ہے۔ مقابلے میں کامیابی کی اِس دَوڑ میں انسان ہانپ کر رہ گیا ہے ...... یہاں تک کہ سانس بحال کرنے کیلئے اُسے پھر کارڈیک انسٹیٹیوٹ لے جانا پڑا!

دراصل کسی دَوڑ میں شامل ہونا' انسان کی حیثیتِ انسان ایک ناکامی ہے ...... کہ مقابلے کیلئے تو بیلوں، گھوڑوں اور کتوں کی دَوڑ ہی کافی تھی۔ انسان اگر مقابلہ کرنا چاہتا ہے تو اپنے اندر کے دشمن سے مقابلہ کرے ...... وہ اندر کے دشمن سے مقابلہ کرے تاکہ باہر دوستوں سے ملاقات ہو سکے۔ دراصل جب انسان خود سے شکست کھا جاتا ہے تو جیت کی دَوڑ کیلئے باہر نکل پڑتا ہے۔ خود سے ڈرنے والا انسان بہت بہادر ہوتا ہے ...... اس لئے باہر شکست قبول کر لیتا ہے۔

کامیابی کے تمغے کو ترک کرنے والا اتنا بہادر ہوتا ہے کہ نشان حیدر کا مستحق ٹھہرتا ہے۔ اپنے اندر سے بے خبر رہنے والا باہر والوں کیلئے سراپا شر ہوتا ہے ...... کہ وہ ہر قیمت پر جیتنا چاہتا ہے!!

انسان نے اتنی ترقی کر لی ہے، لیکن ابھی تک کوئی ایسا پوڈیم ایجاد نہیں کر سکا جس پر تین سے زیادہ لوگ جگہ پا سکیں۔ کیا ایک کی جیت کیلئے سب کی ہار ضروری ہے؟؟ زندگی کا میدان تو ایک طرف' کھیل کا میدان بھی مار دھاڑ سے اس قدر بھرپور ہے کہ وہاں بھی ہار جانے والے اپنے آنسو اور سسکیاں ضبط نہیں کر پاتے۔ جب کھیلوں کے مقابلے کا یہ حال ہے تو مقابلے کے کھیل میں کیا کچھ نہیں ہوتا ہوگا ...... مقابلے کے اس کھیل میں انسان اپنی زندگی ہی پر کھیل جاتا ہے! زندگی کے اس کھیل میں کھلاڑی ایک ہوتا ہے اور باقی سب حریف' یا پھر تماشائی ...... اخباروں' تجزیہ نگاروں سے لے کر خبرناموں اور حالاتِ حاضرہ

کے ناظرین تک ...... کچھ تماشائی ہیں ...... اور کچھ تماشے کی داد اور رقم وصول کرنے والے!!

ہم سکون کی زندگی تیاگ کر مقابلے کے اکھاڑے میں اُتر جاتے ہیں ...... لیکن مقابلے سے دستبردار ہو کر سکون کی زندگی کا انتخاب نہیں کرتے ...... حالانکہ ''مقابلے کا امتحان''، مستقبل کو پُرسکون بنانے کیلئے ہی تو دیا جاتا ہے!! جب مقابلے کا مدعا سکون کی زندگی ہے تو سکون کا انتخاب پہلے ہی کیوں نہیں کر لیا جاتا؟ مقابلے کی دوڑ میں اُترنے والا فراخ دل نہیں رہ سکتا ...... وہ بہت جلد کم ظرفی پر بھی اُتر آتا ہے اور تنگ دِلی پر بھی!! مقابلے کے دنگل میں زندگی گزارنے والا ایک نفسیاتی عارضے ''خود ساختہ دشمن کے فریبِ فہم'' (paranoid delusion) کا شکار ہو جاتا ہے ...... اور یوں ساری عمر ایک چومکھی لڑائی لڑتے لڑتے کسی گمنام معرکے میں مارا جاتا ہے۔

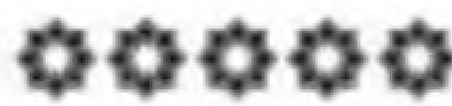
زندگی کے بارے میں واصفؒ خیال ایک عجب حسنِ خیال ہے ...... آپؒ فرماتے ہیں ''زندگی کسی میدانِ کارزار کا نام نہیں ...... یہ جلوہ گاہ ہے' حسن کی جلوہ گاہ ...... زندگی کسی اُلجھے ہوئے سوال کا نام نہیں ...... یہ ایک پُرلطف منظر ہے، ایسا لطیف منظر کہ تبصرے اور تنقید کے بوجھ کو بھی برداشت نہیں کرتا ...... یہ ایک دیکھنے والا منظر ہے ...... ایک سننے والا نغمہ ہے ...... ایک سوچنے والا منصوبہ نہیں ...... ایک مشکل معمہ نہیں ...... زندگی تو بس زندگی ہے ...... کسی کا احسان ہے ...... کسی کی دین ہے ...... کسی اور کا عمل ہے'' ...... ایسے حسین خیال کے حسن کا شاہد وہ ہرگز نہیں ہو سکتا' جو اپنے بھائی بندوں کے ساتھ مقابلے اور مجادلے میں مصروف ہے ...... ایسے لطیف خیال کا لطف اُس کے قریب سے بھی نہیں گزرتا جو کامیابی کی دَوڑ میں بہت دُور نکل چکا ہے!!

خواہش راست ہو یا ناروا ...... مقابلے کی دَوڑ بہرحال خواہش کے راست متناسب ہوتی ہے۔ اپنی خواہش کو صفر کر دینے والا حالتِ سکون میں آ جاتا ہے ...... اور جو

خود حالتِ سکون میں ہو' وہی دوسروں کیلئے تسکین کا سامان ہوتا ہے۔

درحقیقت کامیابی یہ نہیں کہ ہم اپنی ذاتی زندگی کس حد تک خوش حال بنا سکتے ہیں' بلکہ کامیابی کا معیار یہ ہے کہ ہم دوسروں کی زندگی خوش گوار بنانے میں کس حد تک کامیاب رہے۔ ممکن ہے کہ ایک کامیاب ڈاکٹر خدمتِ انسان کے حوالے سے ایک ناکام انسان ہو!! عین ممکن ہے' ایک کلرک اپنے سائلوں کی زندگی آسان بنانے کے اعتبار سے کامیاب زندگی کا چلتا پھرتا نمونہ ہو!! زندگی کے سفر میں عام مشاہدہ ہے کہ دوسروں کا بوجھ اٹھانے والا خود ہلکا پھلکا ہو جاتا ہے...... دراصل بوجھ تو سارا خواہشات کا ہوتا ہے۔ جب ہم بے لوث خدمت کی طرف آتے ہیں تو خواہشات سے آزاد ہو جاتے ہیں۔ اپنی خواہشات سے دُور اور دوسروں کی توقعات کے نزدیک رہنے والا شخص سدا بہار ہوتا ہے...... وہ ہر صبح بادِ نسیم کی طرح اٹھکیلیاں بھرتا ہوا اُٹھتا ہے اور رات کو ایک نوزائیدہ بچے کی طرح نینداور سکون کی آغوش میں جا سوتا ہے۔ گویا اس کی زندگی ایک میٹھی نیند کی طرح ہے...... اور موت پُرسکون زندگی کی طرح!! دراصل موت زندگی کا ایک لازمی جزو ہے۔ جب تک ہم موت کو آسان نہیں کرتے' زندگی مشکل میں رہے گی۔

کامیابی کسی جزوی کامیابی کا نام نہیں' بلکہ مکمل زندگی کے کامیاب ہونے کا نام کامیابی ہے...... اور ظاہر ہے' موت کے بغیر زندگی نامکمل ہے۔ اس لیے جب تک موت کامیاب نہیں ہوتی' زندگی کے کامیاب ہونے کے متعلق شبہ رہے گا۔ ایک کامیاب زندگی کا حاصل ایک پُرسکون موت کے سوا اور کیا ہے؟؟



معافی تلافی

معافی چاہنا ...... چاہت کے ابواب میں سے ہے۔معافی چاہنے والا اور معافی دینے والا دونوں ہی راہِ محبت کے راہی ہیں۔معافی مانگنا اور معاف کرنا' نفرت کو مٹانے کا موجب ہے۔جس سرزمینِ وجود پر محبت جلوہ گر ہوتی ہے' وہاں نفرت کی باڑیں اُگنے کا امکان نہیں رہتا۔غلطی ہو یا غلط فہمی کی کوئی صورت ...... اہلِ دل کیلئے معافی طلب کرنا بہرصورت فرض ہے۔غلطی دانستہ ہو یا نادانستہ ...... معافی بہرحال دانستہ طلب کرنا واجب ہے۔ہر فرض کی قضا ہے' معافی کی قضا نہیں۔معافی طلب کرنے میں جس قدر تاخیر ہوتی ہے' فاصلے بھی اسی قدر تیز رفتاری سے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔

حالات و واقعات میں بظاہر اپنی غلطی نظر نہ آ رہی ہو' تب بھی معافی نظر آنی چاہیے۔معافی ظاہری ہو تو بھی فائدہ باطنی ہوتا ہے۔اپنی غلطی کا ثبوت طلب کرنے سے کہیں بہتر ہے کہ معافی طلب کر لی جائے ...... کیونکہ غلطی صرف وہی نہیں ہوتی جو ہماری ڈکشنری میں درج ہے بلکہ غلطی کے بچّے وہ بھی ہو سکتے ہیں جو دوسروں کے ہاں رائج ہیں۔حقیقت تو یہ ہے کہ سب سے بڑی غلطی دوسروں کی دل شکنی ہے۔وہ شکن جو ایک کے ماتھے پر اور دوسرے کے دل پر پڑتے ہیں' انہیں دُور کرنے کا تیر بہدف نسخہ ...... بس معافی طلب کرنا ہے۔

معافی طلب کرنے والا دراصل یہ اعلان کر رہا ہوتا ہے کہ وہ اپنی اُنا کا قیدی نہیں رہا ...... وہ ''میں'' سے زیادہ ''تُو'' کے احترام میں مشغول ہے۔ ''تُو'' کا احترام اُمن کا التزام ہے ...... ''میں'' کی عزت افزائی اندیشۂ نقضِ امن ہے۔ جس نے کسی ''تُو'' کا احترام نہ کیا ...... اُسے زندگی میں ہر طرف تُو تکار کا سامنا رہا۔ ''تو'' کا احترام ...... احترامِ آدمیت ہے ...... اور احترامِ آدمیت ہی وہ صراطِ مستقیم ہے کہ جو اِس پر مُستقم رہا ...... اِستقامت سے چلتا رہا ...... وہ بالآخر شہرِ اِنسانیت تک پہنچ گیا۔ شہرِ انسانیت تک رسائی حاصل اِنسانیت ہے۔ شہرِ اِنسانیت وہ ہے' جہاں اُنسیت کا آئین رائج ہے ...... جس کے مندرجات میں محبت' ایثار' خلوص اور رواداری ہے۔ جہاں کمزوروں کو زورآوروں سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ...... کہ زورآور اَز خود کمزوروں کی ضرورت کا خیال رکھنے پر مامور ہیں ...... جہاں رزق اور عزت کی تقسیم' زور اور زَر کی تقسیم کے ساتھ مشروط نہیں۔

معافی چاہنے والا شخص اپنے سینے پر شہرِ انسانیت کا ایک تمغہ سجائے ہوئے ہوتا ہے ...... اور جو شخص اِس تمغے کی قدر نہیں کرتا ...... یعنی معافی چاہنے والے کو معاف نہیں کرتا' وہ اِنسانیت اور اُنسیت سے کوئی نسبت نہیں رکھتا۔

معافی طلب کرنے سے فرار یا معافی دینے سے اِنکار کی راہ دراصل راہِ آدمیت سے فرار اِختیار کرنا ہے ...... اور آدم یا اِبنِ آدم سے فرار ''براہِ راست'' اِستکبار تک جا پہنچتا ہے۔ تکبر کا مطلب ہے ...... اپنی مرضی کو سب سے اعلیٰ جاننا ...... ہر حال میں اپنی مرضی سے مطلب رکھنا۔ اِستکبار کے جنگل میں من مرضی کا قانون چلتا ہے ...... اور یہ ''قانون'' ...... فرعون، ہامان اور قارون کا وضع کردہ ہے۔

فرعونوں کے شہر کی نشانی یہ ہوتی ہے کہ وہاں انسانوں پر جنگل کا قانون چلتا ہے ...... وہاں کمزوروں کو دبا کر رکھنا زورآوروں کا بنیادی حق سمجھا جاتا ہے ...... وہاں زور اور

زَر کی زِرہ بکتر پہنے بغیر کوئی زندہ نہیں رہ سکتا...... کیونکہ وہاں قانون طاقت نہیں' بلکہ طاقت قانون کا درجہ رکھتی ہے۔ جس کے ہاتھ میں زور کی لاٹھی ہوتی ہے' اسی کے کھونٹے پر قانون کی بھینس بندھی رہتی ہے...... اور معیشت کی گائے بھی صرف زور آور کے گھر میں آ کر دودھ دیتی ہے۔

جو شخص معافی کے راستے پر چلتا ہے' وہ انبیاء کے راستے پر ہے...... اور جو شخص اِنتقام کے ہذیان کا شکار ہے وہ فرعون اور شدّاد کے فکری قبیلے سے تعلق رکھتا ہے۔

درحقیقت معافی...... تلافی ہوتی ہے...... اُس دوطرفہ نقصان کی' جو بے خبری کے عالم میں دِل کی سلطنت میں کہیں رونما ہو چکا ہوتا ہے۔ معافی...... ایک مکالمہ ہے ...... اور جہاں مکالمہ ہو' وہاں مقابلہ نہیں ہوتا۔ مکالے کو مناظرے میں نہیں بدلنا چاہیے۔ مناظرے میں اپنے سچ اور دوسروں کے جھوٹ کو ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور مکالے میں صرف سچ کو اُجاگر کیا جاتا ہے...... خواہ وہ کہیں بھی نظر آ رہا ہو۔ جہاں معافی مانگنے اور معافی دینے کا چلن ختم ہو جائے' وہاں مکالے کی جدت ختم ہو جاتی ہے اور مجادلے اور مقابلے کی حدت شروع ہو جاتی ہے۔ اِختلافات کے درمیان مکالمہ قائم رہے تو اِختلاف رحمت کی صورت بھی اختیار کر لیتا ہے...... کہ مکالمہ دوطرفہ ہوتا ہے...... اور میانِ گفتگو کوئی درمیانی راہ دریافت ہو جاتی ہے' جو میانہ روی کو جنم دیتی ہے۔ اگر مکالمہ نہ رہے تو اِختلاف تعصب کا راستہ اختیار کر لیتا ہے ...... اور یہی اِختلاف پھر اِنسانیت کیلئے رحمت کی بجائے زحمت کی شکل بن جاتا ہے۔ اپنے مزاج کے برعکس کسی مزاج کو برداشت کرنے سے اِنکار کا نام فرعونیت ہے...... اور مخالف کی رائے کو بزورِ قوت بدلنے کی کوشش دہشت گردی کہلاتی ہے۔

جب ہم کسی کو معاف کرتے ہیں تو اُس کیلئے اِصلاح کا اور اپنے لیے فلاح

کا دروازہ کھلا رکھتے ہیں...... وہ مصلحین جو معافی کے کواڑ بند کر کے اصلاح کی دعوت دیتے ہیں...... مصلحین نہیں بلکہ مفسدین کہلاتے ہیں۔مصلحین دراصل مُفلحین ہوتے ہیں...... دوسروں کی فوز وفلاح کیلئے تڑپتے ہیں اور اپنی اِصلاح کیلئے۔ معاف کرنا مصلحین کا ایک ہتھیار ہے۔ معافی...... اصلاح کیلئے کارگر سلاح (ہتھیار) ہے...... عجب ہتھیار ہے...... پیار کی طرح وار کرتا ہے...... اور دوسرے کو ہاتھ اُٹھانے کی بجائے ہاتھ ملانے پر مجبور کر دیتا ہے۔

معافی لینے اور دینے کی خُو رکھنے والے خوش نصیب ہوتے ہیں' کہ اُن پر لفظ اپنے معنی منکشف کرتا ہے...... وہ معافی دیے جاتے اور دُرِّ معانی لیے چلے جاتے ہیں۔ یوں چلتے چلتے وہ اُس جائے لطافت پر پہنچ جاتے ہیں' جسے جنت کہا جاتا ہے۔ جائے لطافت' جائے مغفرت ہی تو ہوتی ہے۔ جب تک ہم دوسروں کو معاف نہیں کر دیتے' جائے لطافت میں جگہ کیسے پا سکتے ہیں۔ جو لوگ معاف کرنے اور معافی مانگنے کی جرأت سے محروم ہوتے ہیں' اُن کے خانۂ شعور میں اِحسان، محبت، شفقت، رحمت، فضل، عفو اور درگزر جیسی حقیقتوں کا گزر نہیں ہوتا۔ اِنتقام کی سیاست میں مصروف آدمی عفو و درگزر کے مفہوم سے ناآشنا ہوتا ہے۔ عفو سے کام لینا عافیت ہے۔ درگزر سے کام لینے والا اپنے راستے خود واگزار کروالیتا ہے۔

معافی ہوتی ہی اُس کیلئے ہے' جس نے نقصان پہنچایا ہو...... جس نے سب سے زیادہ نقصان پہنچایا ہو' اُسے سب سے زیادہ اور سب سے پہلے معافی کی ضرورت ہوتی ہے۔ محض دوسروں کو نقصان پہنچانے میں توقف کرنے کا نام معافی نہیں۔ معافی صرف چشم پوشی ہی نہیں پردہ پوشی بھی ہے۔ جو معاف نہیں کرتا' وہ دوسروں کے عیوب کی پردہ دَری کرتا ہے...... جو دوسروں کے پردے فاش کرتا ہے' اُس کا بندِ قبا بھی قائم نہیں رہتا۔

معافی دِل سے دی جاتی ہے' عقل سے نہیں۔ جب ہم عقل سے دوسروں کو معاف

کرنے کی کوشش کرتے ہیں' تو دلیل طلب کرتے ہیں ...... اور وہ بھی مجمع میں ...... کیونکہ دلیل مجمع کی ...... اور مجمع دلیل کا محتاج ہوتا ہے۔ دلیل کا سہارا لے کر معاف کرنا دراصل مشروط معاف کرنا ہے ...... اور یہ معافی اُس وقت منسوخ ہو جاتی ہے جب پہلی دلیل کے مقابل دوسری دلیل آ جائے۔ صرف اور صرف عقل سے معاف کرنا ...... صرف دوسروں کو معاف کرنا ہے' خود کو نہیں ...... اور یہ یکطرفہ معافی ہے۔ دل سے معاف کرنا دوطرفہ معافی ہے۔ خود کو معاف کرنے کا عمل دل سے ہے ...... دلیل سے نہیں۔ جب ہم دل سے معاف کرتے ہیں ...... تو ہی مکمل معافی نامہ تحریر کر پاتے ہیں۔ مکمل معافی دوطرفہ ہوتی ہے ...... اور یہی وہ معافی نامہ ہے جس میں اپنی معافی کا اعلان بھی درج ہوتا ہے۔ اس دوطرفہ معافی کا اعلان دل کی عدالت میں تنہا کیا جاتا ہے ...... کوئی گواہ اور دلیل طلب کیے بغیر۔ دل کی دنیا اور ہے ...... دلیل کی دنیا اور ......!

خدمت اور محبت کی طرح معافی بھی غیر مشروط ہوتی ہے۔ مشروط معافی دراصل باجگزاری ہے۔ شرائط منوانے کے بعد کسی کو معاف کرنا درحقیقت تاوان لے کر رہا کرنے کے مترادف ہوتا ہے۔

معاف کرنے کا عمل امن کا پھریرا لہرانے کا عمل ہے ...... کیونکہ جب تک کوئی اپنے مخالف کو معاف نہیں کرتا' وہ خود کو مسلسل ایک حالتِ جنگ میں مصروف رکھتا ہے۔ جنگ آخر کس لیے کی جاتی ہے ......؟ مخالف کو مٹانے کیلئے؟ مخالف کو مٹانے کی ضرورت نہیں ہوتی، بلکہ منانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ مخالف اگر ہم نوا ہو جائے تو مخالفت ختم ہو جاتی ہے۔ دراصل مخالف تب مرتا ہے' جب مر مٹتا ہے۔ معافی ...... مخالفت کو موافقت میں بدل دیتی ہے۔

معافی کا اُلٹ انتقام ہے ...... کلیہ یہ ہے کہ انتقام لینے والے سے انتقام لیا جائے گا

...... اور معاف کرنے والے کو معاف کر دیا جائے گا۔ کیا خوب فرمایا' قطبِ ارشاد حضرت واصف علی واصفؒ نے ...... ''معافی دینے والے کو معافی ملتی ہے...... جو معافی لینے جا رہا ہے' وہ معافی دے کر جائے'' ...... گویا سکون اور محبت کی طرح معافی لینے کا عمل بھی دراصل دینے کا عمل ہے۔

جب ہم کسی کو معافی نہیں دیتے تو سزا دیتے ہیں ...... اور سزا دینے کیلئے قانون کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ قانون کی کتابوں میں جزا سے زیادہ سزا تجویز کی جاتی ہے...... اور یہ سب کی سب تجاویز دائرۂ اِحسان میں تجاوزات ہیں۔ قانون ......صرف انصاف کے تقاضے پورے کرسکتا ہے' احسان کے نہیں۔ قانون کا نفاذ صرف باہر تک ہے، احسان کا نفوذ اندر تلک...... !! انصاف خارج میں امن لانے کی ضمانت ہے ...... احسان باطن میں امان پانے کی علامت ہے۔ انصاف ...... صفات کی دنیا میں پُر امن سفر کی راہداری ہے۔ احسان ...... ذات سے ذات تک سفر ہے۔ دل کی ویرانی، اپنی آبادی اور شادابی کیلئے جس اَبرِ رحمت کی منتظر رہتی ہے' اُسے اِحسان کہتے ہیں۔

معافی ...... اپنے مزاج کے اعتبار سے اِحسان کے قبیلے سے تعلق رکھتی ہے ...... اِس لیے حق سے سوا دینے کی قائل ہوتی ہے۔ جو شخص حق سے سَوا دیتا ہے' وہ اپنے حق سے سِوا لینے کا اہل ہو جاتا ہے۔

قانون سزا دیتا ہے' اِحسان سزا سے بچاتا ہے۔ اپنے مجرم کو سزا سے بچانا ہو تو اُسے صدقِ دل سے معاف کر دینا چاہیے...... بصورتِ دیگر فطرت اُسے کسی اور عدالت سے سزا دلوا دیتی ہے۔ دوسروں کو اُن کی غلطی پر شرمندہ کرنا بھی انہیں سزا کے درجے پر کھڑا کرنا ہے۔ معافی جزا سزا سے رہائی پانے کا عمل ہے۔

کوئی شخص اُس وقت تک سکون کی نیند نہیں سو سکتا، جب تک وہ جاگتے میں سب کو

معاف نہیں کر دیتا۔ دراصل پُرسکون نیند صرف ایک آزاد انسان کی جاگیر ہوتی ہے۔ آزاد وہ ہے' جو منفی جذبوں کی قید سے آزاد ہے۔

معافی ...... کتابِ احسان کا دیباچہ ہے۔ معاف کرنا بے ضرر ہونا ہے ...... اِحسان کرنا منفعت بخش ہونا ہے۔ بے ضرر ہوئے بغیر کوئی منفعت بخش نہیں ہو سکتا۔ معافی دینے والوں کا سفر انصاف سے احسان کی طرف ہوتا ہے۔ انصاف نصف ہے ...... احسان مکمل!!

تصوّف کو درجۂ اِحسان کہا گیا ہے ...... اَز رُوئے حدیث اِحسان یہ ہے کہ تو اپنے ربّ کی عبادت اِس طرح کرے' گویا تُو اُسے دیکھ رہا ہے ...... گویا تصوّف معبود کو محبوب بنانے کا طریق ہے۔ معافی ...... کسی ذات کے حوالے سے دی جاتی ہے ...... اور وہ ذات ...... ذاتِ معبود ہوتی ہے یا ذاتِ محبوب! ہم صرف اپنے محبوب کی خوشنودی چاہتے ہیں۔ کسی دلبر کا حوالہ نہ ہو' تو کسی کو دل سے معاف نہیں کر سکتے ...... محبوب کی خوشنودی مطلوب نہ ہو تو ہماری معافیاں مشروط اور وفاداریاں محدود رہتی ہیں۔ دلبر ہی وہ ذات ہے' جس کیلئے ہم مرتے ہیں ...... جس کی خاطر ہم جیتے ہیں۔ محبت کیا چاہتی ہے؟ ...... قربِ ذات؟؟ ...... قرب ...... قربانی سے ہے۔ معافی مانگنا اور معافی دینا دراصل قربانی دینے کا عمل ہے۔ قربانی کیا ہے ...... ارادتاً اپنے حق کو چھوڑ دینا۔

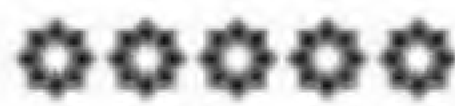
معاف کرنے اور معافی مانگنے کے عمل کو ایک رواج دے دیا جائے تو معاشرے میں سکون ایک سُبک خرام ہوا کی طرح چارسُو چلنے لگے۔ جہاں معافی چاہنے کا چلن عام ہو جائے' وہاں لوگوں کی عزتِ نفس بحال ہونے لگتی ہے۔

یوں تو ہر کس و ناکس سے معافی مانگنا ایک احسن عمل ہے مگر اپنے سے کم مرتبہ لوگوں سے معافی مانگنا مستحسن ترین ہے۔ مرتبے میں کوئی جتنا کم ہو' اس سے اتنا ہی اہتمام سے معافی مانگنا واجب ہے۔ لوگوں کا کم مرتبہ رہ جانا ...... کچھ بلند مرتبہ لوگوں کی غفلت کے سبب

ہوتا ہے۔ دراصل اپنے مرتبے میں مشغول رہنا' اردگرد سے غافل کر دیتا ہے۔ جب تک اپنے مرتبے کے خول سے باہر نہ نکلیں' ہم خود کو دوسروں کیلئے فائدہ مند نہیں بنا سکتے۔ ہم اپنے ماتحت لوگوں کو قانون اور ضابطوں کے حوالے کر دیتے ہیں اور اپنے مرتبوں میں اپنے لیے اِستثنا ڈھونڈتے رہتے ہیں۔ پسماندہ رہ جانے والے لوگوں کو معاشرے کا ایک فعال اور کارآمد فرد بنانے کیلئے لازم ہے کہ اُن کی عزتِ نفس بحال کی جائے...... اُن سے اُن سب زیادتیوں کی معافی مانگی جائے جن کی اُنہیں بھی خبر نہیں۔ معافی مانگنے سے اپنی عزت کم نہیں ہوتی لیکن جس سے معافی مانگی جاتی ہے' اُس کی عزت ضرور بڑھ جاتی ہے...... خود اپنی نظر میں ...... اور پھر معاشرے بھر کی نظر میں !!

جب لوگوں کو گھر بیٹھے عزتِ نفس ملنے لگے تو وہ جرم کرنے کے قابل نہیں رہتے۔ دراصل لوگوں کو روزگار دینے سے بہت پہلے اُن کو عزتِ نفس کی چادر دینا ضروری ہے۔ عزت کی روٹی میں...... روٹی سے پہلے عزت ہے۔

معافی مانگنے سے اور معاف کرنے سے انکار کرنے والا شخص غرورِ نفس کا شکار ہوتا ہے۔ غرور کا سر اِس لیے نیچا ہوتا ہے کہ مغرور شخص خود کو اتنی پستی میں گرالیتا ہے کہ وہ سر اٹھانے کے قابل نہیں رہتا...... اہلِ عجز کے سامنے...... اہلِ دل کے سامنے !! دراصل قول واصفؒ قولِ فیصل ہے'' غرور کسی انسان میں اس وقت تک نہیں آسکتا جب تک وہ بدقسمت نہ ہو''...... اِس تناظر میں دیکھا جائے تو معافی خوش نصیبی کا باب ہے اور معافی سے اِنکار بدقسمتی کا !! ظاہری باطنی نقصان کی تلافی...... معافی سے ممکن ہے۔



غصہ اور برداشت !!

غصہ...... کسی ناپسندیدہ واقعے پر اپنی ناپسندیدگی کا ایک بے ڈھب اظہار ہے...... اور یہ اظہار بجائے خود ناپسندیدہ ہے۔ غصہ...... بشری جبلتوں کے جنگل میں بھڑک اُٹھنے والی ایک آگ ہے...... ایسی آگ جو تہذیب کی بستیاں ویران کر دیتی ہے۔ غصہ وجود کی ایک کششِ ثقل ہے۔ غصہ انسان کو لطافت کی بہشت سے ہبوط کر کے اسے کثافت کی زمین میں حنوط کر دیتا ہے۔

غصہ اپنی توقعات کے مسخ ہو جانے پر پیدا ہوتا ہے...... یعنی اگر اپنی توقعات کی اِصلاح کر لی جائے تو غصے کی اصلاح ممکن ہے۔ توقعات پر قابو پانے سے غصے پر قابو پایا جا سکتا ہے۔ توقعات کی کہانی عجب ہے...... انسان رہتا زمین پر ہے اور لوگوں سے توقعات آسمانی قائم کر لیتا ہے۔ ہر شخص اپنی استعداد کے مطابق توقعات بڑی فراخدلی سے قائم کرتا ہے...... حالانکہ لوگوں کا عمل اُن کی اپنی استعداد اور استطاعت کے مطابق ہوتا ہے۔

غصہ ہمیں لوگوں کے اعمال پر آتا ہے یا اُن کے خیال پر...... حالانکہ لوگ اپنے مرتبۂ علمی کے مطابق درست عمل کرتے ہیں۔ گویا لوگوں کے عمل کی اصلاح سے پہلے اُن کے علم کی اصلاح کی ضرورت ہے۔ بدعلمی بدعملی پیدا کرتی ہے...... اور بے علمی صرف بے عملی !! لوگوں کا اپنے ماحول، علم اور مزاج کے مطابق عمل کرنا عین فطرت ہے...... اور اُن کے عمل پر

غصہ کرنا بدعلمی بھی ہے اور بدمزاجی بھی!!

غصہ ہمیں دوسروں کی نیت پر بھی آتا ہے...... حالانکہ نیت باطن کی کہانی ہے۔ جب تک زندگی کا سانس جاری و ساری ہے' باطن زیرِ ترتیب ہے ......اور جب تک کہانی کا اختتامیہ ظاہر نہ ہو جائے' اس کے اچھا یا برا ہونے کے بارے میں رائے قائم کرنا جلد بازی ہے۔ ظاہر کے پلیٹ فارم پر کھڑے انسان کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ دوسروں کی نیت کے متعلق ایک اچھی رائے کے علاوہ کوئی اور رائے بھی قائم کرے۔ انسان کی نیت...... مخفی اسرار میں سے ایک راز ہے۔ نیت...... ربّ اور بندے کے درمیان ایک رمز ہے۔ ربّ کی ذات چاہے تو مخفی کو آشکار کرے، چاہے تو ستارُالعیوبی کی چادر سے ڈھانپ دے......اور خفی کو مخفی ہی رہنے دے۔

ہر شخص کو اپنی فہم و فراست اور شعور کے مطابق سوچنے کا اور پھر اُس سوچ پر عمل کرنے کا حق حاصل ہے...... جب تک وہ کسی دینی اصول یا ملکی قانون کو پامال نہیں کرتا۔ اِسی طرح ہر شخص کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ ہمارے بارے میں اپنی مرضی کے مطابق رائے قائم کرے۔ جھگڑا اُس وقت پیدا ہوتا ہے جب فکر و عمل کا یہ حق ہم خوش دِلی سے لوگوں کو دینے پر آمادہ نہیں ہوتے۔ ہمارے باہمی جھگڑوں کا ابتدائی جملہ ہی یہ ہوتا ہے ''تم نے مجھے سمجھا کیا تھا؟......اب میں تمہیں سمجھتا ہوں!'' ...... یہ جملہ نہیں' بلکہ حملہ ہے...... دوسروں کی عزتِ نفس پر!! یہ الفاظ اُن تیروں کی مانند ہیں جن کے سَر غرور اور تکبر کے زہر میں بجھے ہوتے ہیں۔ ہمیں یہ حق حاصل نہیں کہ ہم دوسروں کی رائے کو بزورِ قوت متاثر کرنے کی کوشش کریں...... یہ انہیں غلام بنانے کی کوشش ہے...... اور میدانِ فکر و عمل میں یہ ایک کھلی جارحیت ہے۔ خدمت اور محبت کے بغیر دوسروں کو متاثر کرنا دراصل دہشت زدہ کرنا ہے۔

غصہ...... غرور کا ایک اظہار بھی ہے۔ ہم اپنے تئیں کچھ اصول وضع کرتے ہیں اور

لوگوں کے اعمال و افکار کو انہی اصولوں پر جانچنے کی کوشش کرتے ہیں۔خود شناسی سے ڈوری کے سبب ہم اپنے غرورِ نفس کو کسی ''اصول'' کا سہارا دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ جب لوگ اُس ''معیارِ افکار و کردار'' پر پورا اُترنے میں ناکام رہ جاتے ہیں تو ہم اِسے اپنی توہین سمجھ لیتے ہیں۔ دراصل لوگ ناکام نہیں ہوتے بلکہ حقائق کی دنیا میں ہم ناکام ٹھہرتے ہیں ...... یعنی ہم لوگوں کے متعلق حقائق جاننے میں ناکام رہ جاتے ہیں۔مہذب دُنیا میں غصہ اِس لیے بھی ناقابلِ قبول ہے کہ غصے کے ساتھ عام طور پر غرور بھی شامل ہو جاتا ہے...... اور غرور اپنے مخاطب کی توہین سے کم پر مطمئن نہیں ہوتا۔ غصے پر ضبط تہذیب کی پہلی نشانی ہے۔ایک مہذب انسان اپنے غصے پر اُسی طرح قابو رکھتا ہے جس طرح وہ محفل میں اپنے بول و براز پر!! صرف ایک وحشی آدمی اپنے غصے پر قدرت نہیں رکھتا...... وہ اپنے اندر موجود جنگل کے درندے لے کر شہر میں آوارہ گھوم رہا ہوتا ہے۔ طاقت' اختیار اور دولت کسی بھی قیمت پر تہذیب کا بدل نہیں ہو سکتے۔

غصہ...... جہالت کی نشانی ہے۔ غصے کا اظہار کرنے والا یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ ابھی علم کی دُنیا میں داخل نہیں ہوا۔ حقائق سے لاعلم انسان مجبور ہے کہ جا بجا غصے کا اظہار کرتا پھرے۔ حقائق کا عالم' واقعاتِ عالم کو مشیت کے تناظر میں دیکھتا ہے۔حقائق کو وسیع تر منظر میں دیکھنے والا بظاہر غلط نظر آنے والے منظر کے اندر بھی تعمیر کی صورت دریافت کر لیتا ہے۔ گویا مشیّت کی نگاہ سے دیکھنے والا صرف ناظر ہی نہیں ہوتا بلکہ وہ صاحبِ تدبّر بھی ہوتا ہے اور تدبیر بھی!

غصے اور غیرت میں فرق ہوتا ہے...... وہی فرق جو زمینی کلام اور آسمانی الہام میں ہوتا ہے۔ غیرت ایک فطری جذبہ ہے...... ماں کی مامتا اور باپ کی شفقت کی طرح!! جب دینِ فطرت کا کوئی اصول پامال ہوتا ہے' تو کوئی بندہ صحرائی یا مردِ کوہستانی فطرت کے

مقاصد کی نگہبانی پر اُتر آتا ہے...... اپنی ذاتی اَنا کو خود پامال کرتا ہوا...... لیکن اُس کی آنکھوں میں خون نہیں اُترتا، بلکہ اُس کا دل خون کے آنسو روتا ہے۔ اِس کے مقابلے میں غصہ اپنی اَنا کی لٹھ لے کر خودساختہ اصولوں کی چوکیداری کرنے کا عمل ہے۔

غصے اور سرزنش میں بھی فرق ہے۔ اِس لیے سرزنش میں غصہ شامل نہیں ہونا چاہیے ...... وگرنہ سرزنش اور ڈانٹ ڈپٹ اپنی افادیت کھو بیٹھتی ہے۔ دراصل سرزنش' ڈسپلن قائم رکھنے کی غرض سے کی جاتی ہے...... جبکہ غصہ ذاتی اَنا کا اعلان ہے' طاقت کے بل بوتے پر!! کسی کام کے کرنے کی تحریک' یا دوسروں سے کام لینے کا محرک' محبت کا جذبہ ہونا چاہیے، غصہ نہیں۔ غصہ ایک ردِ عمل ہے...... اور کوئی اچھا عمل' ردِ عمل سے شروع نہیں ہوتا۔ دوسروں سے کام لینے کیلئے بھی محبت کی طاقت کو استعمال میں لانا چاہیے...... محبت کی طاقت دیر سے کام کرتی ہے مگر دیرپا ہوتی ہے۔ غصہ ایک شعلے کی طرح بھڑکتا ہے اور وہیں پر ڈھیر ہو جاتا ہے ...... راکھ کا!! دفتروں' مکانوں اور کارخانوں میں ایک دوسرے سے کام لینے کیلئے محبت کی ٹائی (tie) باندھنا چاہیے...... غصے کی ناٹ (knot) نہیں!

غصہ فضائی آلودگی کی طرح ہے۔ غلطی خواہ کسی کی ہو' فضا سب کیلئے مسموم ہو جاتی ہے۔ غصہ یکطرفہ ہو تو بھی دوطرفہ دل شکنی کرتا ہے۔

منافقت کی طرح غصہ بھی ہر مفاد پرست کی مجبوری ہے۔ مفاد پرست اپنا مفاد حاصل ہونے سے پہلے منافقت کا طور طریقہ اختیار کرتا ہے اور مال اور مفاد حاصل ہونے کے بعد اُس کی چوکیداری اِس طرح کرتا ہے' جس طرح ایک کتا روٹی کا ٹکڑا حاصل کرنے کے بعد اِس کی حفاظت میں غُراتا ہے...... وہ بات بات پر بپھر جاتا ہے۔ جھگڑا اُس کا ہتھیار ہے' جس کے ساتھ وہ اپنے مفادات کے دفینے پر پہرہ دینے کیلئے کمربستہ رہتا ہے۔ لالچ کا لقمہ مزاج میں غرور اور اِظہار میں غصہ ضرور پیدا کرے گا۔

صرف بندۂ اِخلاص ہے' کہ ہر حال میں غصے سے پاک ہے۔ دراصل پاک وہ ہے' جو ہر مفاد سے پاک ہے۔ غصے سے پاک ہونے کیلئے ذہن کا مفاد سے پاک ہونا ضروری ہے۔ مفاد...... لالچ کے کچرے میں جنم لیتا ہے...... اور غصہ مفاد کی گود میں آنکھ کھولتا ہے۔ لالچ زدہ آدمی کے مفاد کی پوشاک پر جونہی کوئی قدم رکھتا ہے' وہ آپے سے باہر ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس اِخلاص والا صاحب اپنے کام سے کام رکھتا ہے ...... وہ جانتا ہے کہ درحقیقت کوئی کام اُس کا ذاتی کام نہیں...... اگر کوئی کام اُس کا ذاتی بھی ہے تو اُسے اپنے کام اور کلام کی وجہ سے دوسروں پر غصہ کرنے کا کوئی حق نہیں۔ وہ جانتا ہے کہ اگر وہ فی سبیل اللہ کام کر رہا ہے تو اِس کام کی وجہ سے غصہ کرنا فساد فی الارض کے مترادف ہے ...... کہ اُس کا غصہ مخلوقِ خدا کو راہِ خدا سے دُور کرنے کا سبب بن سکتا ہے۔ دِینی کام میں ذاتی غصہ اُسے دنیاوی کام کے درجے پر لے آتا ہے۔ دراصل کوئی کام دِینی یا دُنیاوی نہیں ہوتا بلکہ اُس کام کو کرنے والا دینی یا دنیاوی ہوتا ہے۔ اگر کوئی کام مبنی بر اِخلاص ہے تو وہ دُنیاوی نہیں رہتا، بلکہ جلد یا بدیر اُس میں رُوحانی حوالہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اِس کے برعکس اگر کوئی کام مبنی بر مفاد ہے تو وہ عالمِ معانی میں دنیاوی کام ہی کہلائے گا...... خواہ الفاظ اور عنوان میں مذہبی رنگ ہی نمایاں کیوں نہ ہو!!

غصہ...... دوسروں کے نامناسب عمل کا ایک فوری ردِّعمل ہے...... اور یہ ردِّعمل بجائے خود ایک نامناسب عمل ہے۔ دوسروں کے عمل پر غیر مناسب اور غیر متناسب ردِّعمل ہمیں بداخلاقی کے کٹہرے میں لا کھڑا کرتا ہے۔ جس طرح برائی کے جواب میں برائی کرنے سے برائی ختم نہیں ہوتی ' اسی طرح غصے کے جواب میں غصہ کرنے سے بھی غصہ ختم نہیں ہوتا۔ اپنے سے چھوٹوں پر غصہ اِس لیے نہیں کرنا چاہیے کہ چھوٹوں کے کردار میں جھول کی ذمہ داری بڑوں کی ہے...... غصہ کرنے سے پہلے اپنے کردار کا جائزہ بھی لینا چاہیے' کہیں اپنا

کردار ہی چھوٹوں میں منعکس نہ ہو رہا ہو۔ کردار ایک خاموش تبلیغ ہے...... چلتے پھرتے ہوتی رہتی ہے۔ بُرا کردار نسلوں میں سایہ بن کر پیچھا کرتا ہے۔ بڑوں پر تاؤ اِس لیے بھی نہیں آنا چاہیے کہ بڑوں کی اِصلاح کی ذمہ داری چھوٹوں پر نہیں ہے...... وہ اپنے حصے کا نصاب مکمل کر چکے ہیں...... اب وہ جانیں اور اُن کے نصاب کا حساب اُن کے اپنے بڑے جانیں!!

غصہ تو ویسے بھی نہیں کرنا چاہیے...... اور غصہ ایسے بھی نہیں کرنا چاہیے۔ جو شخص پہلے ہی غصے کی حالت میں ہو اُس پر تو بالکل ہی غصے میں نہیں آنا چاہیے...... کیونکہ وہ ایک اذیت میں گرفتار ہے...... اور جو شخص اذیت میں گرفتار ہو' اُس پر غصہ نہیں بلکہ رحم آنا چاہیے۔ اگر کوئی شخص اپنا ''غلط'' عمل نہیں چھوڑتا تو ہم اُس کے ردِعمل میں اپنا صحیح اور صالح عمل کیوں ترک کریں! صالح عمل...... صلح جُو ہوتا ہے۔ درحقیقت ردِعمل ایک ردّی عمل ہے۔ عمل اور ردّ عمل ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہے...... اور یہ کسی کو اپنے عمل پر نظرثانی کرنے کی مہلت نہیں دیتا۔ کسی آدمی کو بہر حال اِبتدا تو کرنا ہوگی...... اصلاحِ احوال کی...... اور وہ آدم ہم خود ہی کیوں نہ ہوں!!

غصہ ایک زہر ہے اور اِس کا تریاق خاموشی ہے۔ خاموشی...... قوتِ برداشت کا سب سے پہلا مظاہرہ ہے۔ خاموشی کسی غیر مہذب عمل کا مہذب ترین جواب ہے۔ اخلاق کی خشتِ اوّل...... برداشت ہے۔ اخلاقیات کا آدھا راستہ اپنے غصے پر قابو پا لینے سے طے ہو جاتا ہے۔ اگر کوئی شخص اپنے مخالف کو برداشت نہیں کرتا تو وہ اخلاق کے کسی پیمانے پر پورا نہیں اُترتا۔ برداشت کی قوت ہی ایک صاحبِ کردار انسان کی حقیقی قوت ہے...... باطنی قوت ہے...... اور اسی قوت کا حصول اُسے بہادری اور جواں مردی کے ذائقے سے آشنا کرتا ہے۔ ایک معروف حدیث کا مفہوم ہے کہ بہادر' وہ نہیں جو کشتی میں مخالف کو پچھاڑ دے' بلکہ بہادر وہ ہے' جو اپنے غصے پر قابو پا لے۔

حضرت واصف علی واصفؒ فرماتے ہیں: ''سب سے بڑی قوت' قوتِ برداشت ہے''۔ دراصل غصہ اپنی برداشت کے کم پڑ جانے پر رُونما ہوتا۔ گویا اگر برداشت بڑھ جائے تو غصہ کم ہو جاتا ہے۔ جو شخص برداشت نہیں کرتا' وہ غصہ کرتا ہے...... اور غصہ کرنے والا فلاح کا کوئی کام نہیں کرسکتا...... نہ اپنے لیے اور نہ دوسروں ہی کیلئے۔ غصہ کرنے والا شخص طاقت میں بھر پور ہو' تو بھی کمزور پڑ جاتا ہے...... اخلاقی طور پر...... شعوری طور پر!! اپنے غصے پر ضبط کرنے والا شخص ہی واقعاتِ عالم کا صحیح اِدراک کرسکتا ہے۔ اِخلاقیات کے تمام سُوتے برداشت سے پھوٹتے ہیں۔ برداشت میں کمی اِخلاق میں کمی کا پتہ دیتی ہے۔ برداشت کی قوت بااخلاق ہونے کی سند ہے۔ جس کی برداشت جتنی زیادہ ہوگی' وہ اتنا ہی بااخلاق ہوگا۔ برداشت ثمر بار کرتی ہے...... صبر اسے میٹھا کرتا ہے!!

برداشت دراصل ضبط ہے...... اور اِس ضبط کا صلہ ربط ہے...... ربطِ معنوی! ربط کم پڑ جائے تو رابطے کمزور پڑ جاتے ہیں۔ دراصل ضبط اور ضابطوں میں کمزور پڑنے سے انسان ربط اور رابطوں میں کمزور ہو جاتا ہے...... یعنی زندگی میں معنویت کے گُم ہونے سے انسان لایعنیت کی بھیڑ میں گُم ہو جاتا ہے۔

حضرت واصف علی واصفؒ کا قول ہے: ''غصہ اعتماد میں کمی کا نام ہے''...... ظاہر ہے ایک بااعتماد شخص اپنی توقعات باندھنے میں حقیقت پسند ہوتا ہے۔ حقیقت شناسی اِنسان میں اعتماد کی کیفیت پیدا کرتی ہے۔ نادان شخص کا ''اعتماد'' اس کی بےخبری کا اظہار ہوتا ہے' یا پھر اس کی بیوقوفی کا اعلان۔ ایک دانا شخص حقیقت کے قریب ہوتا ہے اور غصے سے دُور نادان غصے کی آگ میں بار بار جھلستا رہتا ہے۔ دانا آدمی اپنی توقعات کی حقیقت سے بھی آگاہ ہوتا ہے اور کسی دوسرے کی اپنی توقع پر پورا اُترنے کی اہلیت سے بھی بخوبی واقف ہوتا ہے...... اس لیے وہ غصے سے دُور رہتا ہے اور غصہ اُس سے دُور!!

غصہ ظاہر کرنے سے ختم نہیں ہوتا۔ غصہ اس وقت تک ختم نہیں ہوتا جب تک معاف نہ کر دیا جائے۔ برداشت کرنا ابتدا ہے...... معاف کرنا انتہا!! برداشت ظاہر میں کی جاتی ہے، معافی دل سے دی جاتی ہے۔ دراصل جب ہم کسی کو معاف کرتے ہیں تو اِصلاح کا ایک موقع فراہم کرتے ہیں۔

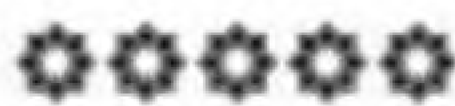
غصے کی آگ بجھانے کیلئے پانی پینے کا حکم ہے۔ پانی بمنزلۂ علم ہے...... اور علم کا تعلق حلم سے ہے۔ غصے پر فتح پانا دراصل خیال کا کثافت سے لطافت کی طرف ہجرت کرنا ہے۔

غصے سے بچنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ غصے کے جواب میں ایک مسکراہٹ دے کر راستہ دے دیا جائے۔ راستہ دینے کا عمل دراصل راستہ لینے کا عمل ہے۔ غصہ...... سدِّ راہ ہے...... مسکراہٹ راستے کشادہ کرتی ہے۔ مسکراہٹ...... اپنے چہرے کی خوبصورتی کا صدقہ ہے...... اور یہ صدقہ غصے جیسی بلا کو ٹال دیتا ہے۔ جب غصہ آنے لگے تو راستہ بدل لینا چاہیے۔ اِس سے راستے کُھلے رہتے ہیں...... واپسی کے!! دِل اور ہاتھ کُھلا رہے تو راستے بھی کُھلے ملتے ہیں۔ معاف کرنا دَریا دِلی ہے...... غصے سے کام لینا طبیعت کا ایک بُخل ہے۔ درگزر کرنے سے راستے واگزار ہو جاتے ہیں۔ درگزر کرنے والے پر کوئی دَر بند نہیں ہوتا ...... سوائے دَرِ مذلّت کے!! غرور اور غصہ کرنے والے پر سب دَروازے کُھل سکتے ہیں سوائے عزّ و شرف کے!!

غصے کی حالت میں اِنسان اپنا شرفِ انسانی کھو بیٹھتا ہے۔ انسان جب آگ بگولہ ہوتا ہے تو اپنے خاکی جوہر سے کنارہ کش ہو جاتا ہے۔ انسانی جوہر عاجزی اور انکساری ہے۔ جب اِنسان غصے کی حالت میں ہوتا ہے تو حالتِ انسانیت سے نکلتا ہوا آگ کی لَپٹ میں داخل ہو جاتا ہے...... اور آگ کی لَپٹ اپنی لپیٹ میں آنے والی ہر شئے کو بھسم کر ڈالتی ہے' خواہ وہ کوئی شرف ہی کیوں نہ ہو!! آدم کا خمیر مٹی سے اُٹھایا گیا اور مٹی کی طینت عاجزی

ہے......اس لیے اِبنِ آدم کی اخلاقی معراج یہ ہے کہ وہ بچھ بچھ جائے۔ انکساری...... انسانی شرف کی بلندی ہے۔ تکبر اور استکبار آگ کی سرشت میں سرِ فہرست ہیں۔ آگ ربوبیت نہیں کرسکتی...... کہ وہ اپنے سوا کسی چیز کو خاطر میں نہیں لاتی......اُس میں کسی غیر جنس کو برداشت (accommodate) کرنے کی صلاحیت نہیں......اس لیے وہ کسی بھی شے کو اُس کی قدرتی ہیئت میں نہیں رہنے دیتی۔ ربّ العالمین نے آدمؑ کو اپنا نائب بنایا...... کیونکہ ربوبیت کا معجزہ آدم کے اندر ہی موجزن ہوسکتا ہے۔ اپنے سے مختلف مزاج اور عناصر کو برداشت کرنے کے سبب وہ بندہ نواز ہوا...... داتا ہوا......غریب نواز ہوا۔ یہ مظاہرِ انسانِ کامل ﷺ...... کوہِ صفا کی بلندیوں سے نزولِ عروج کرتے ہوئے مخلوقِ خدا کی یاوری کو پہنچے...... انہوں نے عاجزی کی عبا زیبِ تن کی ...... اِنکسار کا خرقہ لیا......تواضع کا دسترخوان بچھایا......اور اُس مخلوق کی ربوبیت میں مشغول ہوئے' جو آدمیت کے ہجے بھی نہ جانتی تھی۔ دراصل کوئی مردم بیزار اور مردم آزار شخص کسی کی پرورش نہیں کرسکتا...... نہ ظاہری' نہ باطنی! چھوٹا دِل اور دسترخوان رکھنے والا' درویش نہیں ہوسکتا۔ درویشی...... دریا دِلی ہے......مخلوقِ خدا کی بےلوث دستگیری ہے۔ بےلوث ہونا باہمت ہونا ہے......اور یہ ہمت' ملامت کا بوجھ اُٹھانے کا ثمر ہے۔ نرگسیت کی چوٹی پر ڈھونی رمائے بیٹھ رہنے والا رُوحانی نہیں' بلکہ نفسیاتی کیفیت میں گرفتار ہے...... کہ عرفانِ نفس غرورِ نفس نہیں ہوتا۔

یہ راز ہی رہے گا...... جب تک کوئی قدم نہیں اُٹھاتا...... کہ ''تُو'' کے حرم میں داخل ہونے سے پہلے ''مَیں'' کے پندار سے نکلنا ہوگا!!



''پاکستان نور ہے......نور کو زوال نہیں''

دَر مناقبِ علی کرم اللہ وجہہ الکریم' یہ ذِکر ملتا ہے کہ اصحابِ رسول ﷺ کسی شخص کے مومن یا منافق ہونے کا تعین اُس کے سامنے ذکرِ علیؓ سے کیا کرتے ۔ اگر ذکرِ علیؓ مخاطب کے چہرے پر سرشاری کی کیفیت پیدا کرتا تو سمجھ لیا جاتا کہ وہ صاحبِ ایمان ہے، اگر مخاطب کے چہرے پر انقباض ظاہر ہوتا تو انہیں اُس کے منافق ہونے کی خبر مل جاتی ۔ یہ فارمولہ ایک کائناتی کلیے کی طرح آج بھی نافذ العمل ہے ۔ سرزمین پاک سایۂ بوترابؓ ہے ۔ اس لیے پاکستان کے حال اور مستقبل کے بارے میں ہر اچھی خبر اہل ایمان میں سرشاری کی کیفیات پیدا کرتی ہے' اور یہی خبریں جب اہل ظن وگمان تک پہنچتی ہیں' تو اُن کی طبیعت کا اِنقباض اُن کے تبصروں، تجزیوں اور چہروں سے ظاہر ہونے لگتا ہے ۔ وہ اُمید کی بجائے مایوسیوں کا درس دینے لگتے ہیں ۔ مایوس ہونے اور مایوس کرنے کیلئے زمینی حقائق کی تلاش گویا اُن کیلئے آسمانی فریضہ بن جاتا ہے ۔ عجب روشن خیالی ہے کہ پاکستان کے حوالے سے ہر تاریک بات پر روشنی ڈالنا ہی اپنا فرضِ منصبی سمجھتے ہیں ۔ وہ اَرضِ پاک کے متعلق خوش خبریوں کو خوش گمانیوں پر محمول کرتے ہیں...... حالانکہ خوش گمانی' بدگمانی سے بہر طور بہتر ہے ۔

مریض آپریشن تھیٹر میں ہے ۔ آپریشن طویل ہے ۔ کئی ناسُور نکالے جاچکے ہیں...... رِستے ہوئے ناسُور' ہر کس وناکس کو نظر آرہے ہیں، مگر مریض کی قوتِ مدافعت صرف صاحبانِ نگاہ کی نظر میں ہے ۔ باہر کا منظر اور ہے...... اندر کا منظر نامہ کچھ اور...... باہر مریض

کے لواحقین اُس کے جانبر ہونے یا نہ ہونے کے متعلق بحث کر رہے ہیں۔ اُن کے تبصرے در اصل مریض کے ساتھ اُن کے تعلق کی نوعیت کو ظاہر کرتے ہیں۔ گِدھوں کیلئے بیمار کا وادیٔ ہلاکت میں اُتر جانا ایک ''خوش خبری'' سے کم نہیں۔

معالجین' بروزنِ ناقدین' قوم کو بداعمالی کی عبرت سے ڈراتے ہیں ...... بداعمالی دُور نہیں کرتے۔ یہ کیا طریقۂ علاج ہے کہ مریض کو شفا اور شفاعت کے تصور سے دُور کر دیا جائے۔ معالج کا کام علاج کرنا ہے' ناں کہ مریض کو دہشت زدہ کرنا۔ قوم کو رحمت اور شفاعت کے تصورات سے دُور لے جانا ایک فکری دہشت گردی ہے۔ بداعمالی اگر شرّ ہے' تو شرّ کی اشاعت شر پسندی ہے۔

بداعمالی کے باوجود اُس کی رحمت سے بددل نہیں ہونا چاہیے۔ بداعمالی قابلِ توبہ ہے ......اور بددِلی قابلِ مواخذہ...... کیونکہ بددِلی کی حدیں مایوسی کو چھونے لگتی ہیں۔ دینِ رحمت میں مایوسی کی گنجائش نہیں۔ مایوسی ...... سدِ راہ ہے۔ اُمید راستے کھولتی ہے۔ اِنتظار کرنے سے راستہ ملتا ہے۔ جلدی مچانے سے بھیڑ اور بھگدڑ سے واسطہ پڑتا ہے۔ گنہگار اگر رحمت کا دَر کھٹکھٹانے میں ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کریں' تو اُن پر عاقبت اور عقوبت کا دَروازہ کھل جاتا ہے۔ درحقیقت رحمت ہر گنہگار کی راہ تک رہی ہے ...... بجز اُن کے جو مایوس ہو گئے۔ کیا خوب کہا حضرت واصف علی واصفؒ نے ...... **''رحمت تو ہوتی ہی گنہگاروں کیلئے ہے''** ......اور یہ کہ **''حال کی غلطی جو مستقبل میں اپنے لیے سزا مرتب کر چکی ہے' اُس سے بچانے والی شئے رحمت کہلائے گی''**

زندگی صرف دو جمع دو کا فارمولہ نہیں' اِس میں زندگی کے خالق کی منشا ہمہ وقت کار فرما رہتی ہے۔ یہاں عالمِ صفات میں رائج خودکار قوانینِ فطرت کے ساتھ ساتھ ذاتی سطح پر بھی فیصلے صادر ہوتے رہتے ہیں۔ اِس میں رحمت اور مغفرت کے ابواب کھلتے رہتے ہیں۔

مایوس ہونا دراصل خالق و مالک کی قدرتِ کاملہ کا انکار کرنا ہے۔ اگر سب نتائج اعمال اور اسباب ہی کے ذمے ہیں تو عبد اور معبود کا راز و نیاز کیا ہے؟

اَعمال و اَسباب کے زور اور زعم میں تو لوگ اپنی کشتیاں خود ہی کنارے پر کھیت لیا کرتے ہیں...... اس میں مبلغ کا کیا کمال؟

دین رحمت کا مبلغ...... اُمید کا پیامی ہوتا ہے۔ مایوسی پھیلانے والا کس ''دین'' کی تبلیغ کر رہا ہے؟ وہ ذات لامحدود ہے...... اُس کے پاس رحمت و بخشش کے خزانے بھی لامحدود ہیں...... اور اُن تک رسائی کے امکانات بھی لامحدود!

مایوسی ایک بیماری کا نام ہے...... اور مصلح ایک مسیحا ہے۔ مسیحا کا کام یہی ہے کہ وہ اپنے بیمار کو درِ رحمت پر لے جائے۔ درِ رحمت...... رسول رحمت ﷺ کا دَر ہے۔ اِسی دَر کے بارے میں حکم خداوندی ہے: ''اور اگر جب وہ اپنی جانوں پر ظلم کریں تو اے محبوب ﷺ تمہارے حضور حاضر ہوں اور پھر اللہ سے معافی چاہیں اور رسول ﷺ اُن کی شفاعت فرمائیں تو ضرور اللہ کو بہت توبہ قبول کرنے والا اور مہربان پائیں'' (سورۃ النّساء، ۶۴)

اِسلام...... دین رحمت ہے...... اور اِسلام اور پاکستان لازم وملزوم ہیں۔ پاکستان بچانے کیلئے اِسلام ضروری ہے...... بغیر کسی تشریح کے!! درحقیقت اِسلام کو صرف ایک ہی تشریح کی ضرورت ہے اور وہ ہے صداقتِ کردار!! اسلام...... دین صداقت ہے۔ صداقتِ کردار نہ ہو' تو دین صداقت نفع نہیں دیتا۔ صداقتِ کردار نہ ہو' تو دِین کا عالم بھی منافق کہلاتا ہے۔ دراصل کوئی علم منافق کو مومن نہیں بنا سکتا...... کہ ایمان دلیل کا نہیں' دِل کا سودا ہے۔ علم...... منافق کے خلاف ایک فردِ جرم بن جاتا ہے۔ نفاق...... مفاد کا متلاشی رہتا ہے اور اخلاص...... ذات کا۔ اخلاص کے سوا ہر رشتہ...... منافقت کا رشتہ ہے۔ منافق...... مفاد کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا اور کسی موقع پر مفاد سے دست

بردار نہیں ہوتا۔ مفاد پرست اور موقع پرست جب دین کی تشریح کرتا ہے' تو اپنے لیے علیحدہ استحقاق کی شق پیدا کر لیتا ہے ...... اس طرح دینِ حق میں ایک فرق رُونما ہو جاتا ہے ...... یہی فرق فرقے کی اساس ہے۔ فرقہ ...... فرق سے ہے ...... اور اسلام میں فرقے کی گنجائش نہیں۔ حضرتِ واصفؒ نے کیا خوب کلیہ دیا ہے: ''اسلام + فرقہ = صفر'' ...... ظاہر ہے صفر کے ہر سفر کا نتیجہ صفر ہوگا۔ اسی مضمون میں ایک جگہ آپؒ فرماتے ہیں: ......

''فرقہ پرست' حق پرست نہیں ہو سکتا''۔

اپنے وقت کے صاحبِ حال حضرت واصف علی واصفؒ ایک اور صاحبِ حال کی صداقتِ کردار کی تصدیق کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''صاحبانِ حال کے سلسلے میں قائدِ اعظمؒ کی مثال سب سے اہم ہے۔ وہ استقامت اور صداقت کا پیکر قائدِ اعظمؒ کہلانے کیلئے کوشش نہیں کر رہا تھا۔ وہ مسلمانوں کی خدمت کے جذبے سے سرشار تھا۔ اُس کے خلوص کو فطرت نے قبول کیا۔ اُسے صاحبِ حال بنا دیا۔ فتویٰ اُس کے خلاف تھا لیکن فطرت اور حقیقت اس کے ساتھ تھی۔ اسے قائدِ اعظم رحمۃ اللہ علیہ بنا دیا گیا۔ اہلِ شرع کا ایک گروہ اس بات کو اور اس واردات کو نہ پہچان سکا، معترض رہا۔ اہلِ باطن پہچان گئے کہ یہ کسی کی نگاہ کی بات ہے۔ یہ فیض ہے کسی ذات کا، یہ نصیب کا فیصلہ ہے۔ اہلِ باطن قائدِ اعظمؒ کے ساتھ ہو گئے، منزل مل گئی۔ ملک بن گیا۔ فتویٰ دینے والے آج تک نہ سمجھ سکے کہ یہ کیا راز تھا۔ قائدِ اعظمؒ دلوں میں اُتر گئے اور مخالفین دلوں سے اُتر گئے''۔

پاکستان، اسلام اور قائدِ اعظمؒ کے درمیان معنوی ربط کی تفسیر بیان کرتے ہوئے آپؒ لکھتے ہیں:

''پاکستان بچانے کیلئے ہمیں اتنا ہی اِسلام درکار ہے جتنا قائدِ اعظمؒ کے پاس تھا''

...... ظاہر ہے قائدِ اعظمؒ کے پاس اِسلام کی عملی تفسیر تھی ...... یعنی صداقتِ کردار! قائدِ اعظمؒ

ؒ کے پاس امانت اور صداقت تھی...... یعنی کردارِ نبوی ﷺ کا حقیقی اتباع !!

قائدوہ ہے' جو قیادت کی اہلیت رکھتا ہو...... اور اہلیت صرف صلاحیت ہی کا نام نہیں ...... امانت، دیانت اور صداقت بھی اہلیت کا لازمہ ہے۔ دین صداقت کی نسبت صادقؐ اور امینؐ کے ساتھ ہے...... صداقت اور امانت کا جوہر جس شخص میں جس درجۂ کمال پر ہوگا' دین صادقؐ سے اُس کی نسبت اُسی قدر مستحکم ہوگی۔امانت' دیانت اور صداقت کے بغیر دین صادقؐ سے ہماری کیا نسبت؟ ''دل دریا سمندر'' کے ایک مضمون ''قیادت'' میں آپؒ لکھتے ہیں:

''اِسلام میں قیادت تقویٰ سے مشروط ہے''

ساٹھ کی دہائی میں صدر ایوب نے پاکستان کے سرکاری نام سے ''اسلامی'' کا لاحقہ حذف کرنا چاہا' تو ایک مردِ درویش نے عجب وارفتگی کے عالم میں دُہائی دی:

''ہم پاکستانی صرف اِس وجہ سے بنے کہ ہم مسلمان تھے، اگر افغانستان، ایران، مصر، عراق، اور ترکی اسلام کو خیر باد کہہ بھی دیں تو پھر بھی وہ افغانی، ایرانی، مصری، عراقی اور تُرک ہی رہتے ہیں، لیکن ہم اِسلام کے نام سے راہِ فرار اختیار کریں تو پاکستان کا اپنا الگ کوئی وجود قائم نہیں رہتا'' ("شہاب نامہ" از قدرت اللہ شہابؒ)

پاکستان کے وجود سے اِسلامی تشخص کا لباس اُتار دیا جائے تو یہ ملک بھانت بھانت کی نسلوں کا ایک ایسا ہجوم بن کر رہ جاتا ہے' جسے کچھ سیاسی اور استحصالی مجبوریوں نے جکڑ باندھ دیا ہو!! درحقیقت اِس اَنبوہِ بے مایہ کو گنجِ گراں مایہ بنانے کی ایک ہی ترکیب ہے...... اور وہ ترکیبِ خاص' یہ ہے کہ ایک کلمے کے سائے تلے ہم سب خود کو ذہنی اور قلبی طور پر قومِ رسولِ ہاشمی ﷺ قرار دیں...... اور اِس اقرار کی عملی تصدیق بھی کریں۔ کسی بھی قسم کا نسلی، لسانی، علاقائی، سیاسی اور صوبائی تعصب' اس اقرار کی نفی میں شامل ہے۔ کلمہ توحید عبارت ہے' پہلے نفی سے' پھر اقرار سے!! خود کی نفی اور خدائے واحد کا اقرار!!

درجنوں قومیتوں پر مشتمل خطے میں آباد کلمہ گو ایک قوم بن سکتے ہیں' اگر انہیں ایک کلمۂ وحدت کی طرف راغب کرلیا جائے۔ کلمہ تو ایک ہے' قوم ایک کیوں نہیں؟...... دراصل کلمے کی تشریح وحدتِ کردار سے محروم لوگ کر رہے ہیں۔ وحدتِ فکر سے عاری مبلغ ایک طرف کلمۂ وحدت کی ترجمانی کرنے سے قاصر ہے اور دوسری طرف قوم کے اجتماعی شعور اور ذوق کو وحدت کی خوشبو سے آشنا کروانے کی صلاحیت سے یکسر محروم!! درحقیقت یہ قوموں کی امامت کرنے والا کوئی امام ہوتا ہے جو بکھرے ہوئے دانوں کو ایک تسبیح میں اکٹھا کر لیتا ہے...... دانہ دانہ...... اور پھر اُن سب کا شمار رکھتا ہے۔

قومیں طرزِ فکر سے بنتی ہیں۔ لباس اور رسوم ورواج سے نہیں۔ یہ طرزِ فکر ہے' جو قوموں کو علیحدہ تشخص دیتا ہے۔ یہاں مشرق ومغرب کی تخصیص نہیں' بلکہ یہ مادّی اور رُوحانی طرزِ فکر ہے جو قوموں کو الگ الگ پہچان دیتا ہے۔ متفرق طرزِ فکر رکھنے والے ایک گھر میں رہتے ہوئے' ایک دوسرے سے اجنبی رہتے ہیں۔ ایک ملک میں رہنے والے اگر ایک طرزِ فکر نہ اپنائیں تو ہم وطن کیسے کہلائیں!!

''تہذیبوں کے تصادم'' کے تصور نے دیگر حقائق کے علاوہ یہ بھی واضح کر دیا کہ اب مغرب بھی دوقومی نظریے کا قائل ہونے کو ہے...... کہ زبان رنگ اور نسل نہیں' بلکہ تہذیب قوموں کو ایک دوسرے سے جدا کرتی ہے۔ تہذیب...... صدیوں کے طرزِ فکر سے جنم لیتی ہے۔ ہمارا طرزِ فکر کلمۂ طیبہ پر مبنی ہے۔ پاکیزگی نہ سہی' پاکیزگی کی تمنا تو ہمارے طرزِ فکر کا حصہ ہے۔ پاکستان...... پاکیزگی کی تمنا رکھنے والوں کے ایک اجتماعی فیصلے کا نتیجہ ہے۔ پاکستان برّصغیر میں ملتِ اسلامیہ کا ایک متفقہ اجتہاد ہے...... اور اصول اجتہاد میں یہ شامل ہے کہ جس اَمر پر ایک مرتبہ اجتہاد ہو چکا ہو' اُس پر دوبارہ نہیں ہوتا۔

پاکستان ایک رُوحانی راز ہے...... اور یہ راز بھی اپنے انکشاف کیلئے بیدار مغز اور

بیدار رُوح انسانوں کا منتظر ہوتا ہے۔ مادّی اور جدلیاتی فکر میں محبوس ذہنوں کی مجبوری ہے کہ وہ پاکستان کو کبھی انگریز کی سازش کا کرشمہ جانیں اور کبھی کانگرس کی ہٹ دھرمی کا نتیجہ سمجھیں...... اور کچھ بن نہ پڑے تو قائدِ اعظمؒ کی جلد بازی کا شاخسانہ قرار دیں۔ اپنے مشاہیر کی دانائی اور فہم وفراست کو غیر کی نگاہ سے دیکھنا ذہنی طور پر مفلس ہونے کی نشانی ہے۔ ایک قوم کا ہیرو' اُس کی دشمن قوم کا وِلن ہوتا ہے۔ ایسے میں مستعار لی گئی نظر سے کیا دکھائی دے گا؟ قائدِ اعظمؒ ایسے کھرے اور بے باک انسان کو انگریز کی سازش کا حصہ سمجھنا اُس پاک سرشت رہبرِ ملت پر ایک بہتانِ عظیم ہے۔ دراصل غلام کی نشانی یہ ہوتی ہے کہ اُس کا طرزِ فکر بھی اُس کا آقا متعین کرتا ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ غلام جب اپنے آقا کے ذہن سے سوچتا ہے تو ربِ موسیٰؑ اور ہارونؑ پر ایمان لانے کے بعد بہت جلد سامری کی مُرلی پر سر دُھننے لگتا ہے۔

ہم پاکستان کو اُولیاءاللہ کی نظر سے کیوں نہ دیکھیں؟ درحقیقت ایک ولی کی نظر ہی علیؑ کو دیکھ سکتی ہے...... اور ''محمد علیؒ'' کے نورِ فراست کا معترف ہونے کیلئے تو قلب ونظر کا کافی تزکیہ چاہیے۔ کتابُ اللہ سے ہدایت پانے کیلئے اگر تقویٰ شرط ہے تو کتابِ مشیت کی تلاوت کرنے کیلئے بھی قلب ونظر کا باوضو ہونا ضروری ہے۔

پاکستان کا قیام مشیتِ خداوندی کا ایک جغرافیائی اظہار ہے۔ اسلام ایک حقیقت ہے تو پاکستان اس حقیقت سے جڑی ہوئی وہ حقیقت ہے جس کا اظہار ہجرتِ مدینہ سے تیرہ سو چھیاسٹھ (۱۳۶۶ھ) برس بعد ہوا۔

جناب اشفاق احمدؒ جیسے صالحین اُمت نے پاکستان کو ناقۂ ثمود قرار دیا ہے۔ جس نے اسے اپاہج کرنا چاہا' اُس نے اپنی نسلوں پر قہرِ خداوندی کو دعوت دی۔

؎ جس نے محبوب وطن کی ہے اُڑائی مٹی واصفؔ اُس شخص کی ہو' ساری کمائی مٹی

اہل اللہ کی نظر میں پاکستان شعائر اللہ میں شمار ہوتا ہے۔ پاکستان کی توہین شعائر اللہ کی توہین ہے اور پاکستان کا احترام شعائر اللہ کا احترام ہے۔ ایک محفل میں حضرت واصف علی واصفؒ سے سوال کیا گیا کہ اسلام تو ایک آفاقی دین ہے' زبان، رنگ، نسل اور خطے کی حدود و قیود سے آزاد پیغام ہے اور پاکستان ایک جغرافیائی خطہ ہے، آپ پاکستان کو اسلام کے ساتھ اور اسلام کو پاکستان کے ساتھ کیسے لازم وملزوم بیان کرتے ہیں؟ آفرین ہے' اُس سرچشمۂ فہم وفراست پر...... وہ ''سلونی سلونی'' کا جلترنگ یوں گویا ہوا کہ نکتہ درنکتہ منکشف ہونے لگا...... فرمایا...... **''جب کسی مادّی شئے کو ایک روحانی نسبت دے دی جاتی ہے تو وہ شعائر کا درجہ اختیار کر لیتی ہے، جیسے ایک قطعہ زمین کو جب مسجد کے نام سے منسوب کر دیا جائے تو وہ واجب الاحترام قرار پاتا ہے' اب اس قطعۂ زمین کا احترام عین مسجد کا احترام ہے۔ اسی طرح مسلمانانِ ہند نے پاکستان کی صورت میں دین اسلام کے نام پر ایک جغرافیائی خطہ حاصل کیا ہے، اب یہ خطہ شعائرِ اسلام میں داخل ہے۔ جس نے اِس ملک کی خدمت کی اُس نے اسلام کی خدمت کی''۔**

فرمانِ رسول ﷺ ہے: ''مومن کی فراست سے آگاہ ہو جاؤ، وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے'' ...... ظاہر ہے نور سے دیکھنے والا ہی نور دیکھے گا...... اور پھر پکار اُٹھے گا:

''پاکستان نور ہے......اور نور کو زوال نہیں''۔ یہ مکالمہ نہیں' مشاہدہ ہے۔

؎ تقدیرِ اُمم کیا ہے؟ کوئی کہہ نہیں سکتا مومن کی فراست ہو تو کافی ہے اِشارا

اِس حقیقت کی طرف اقبالؒ کی فراست نے بھی اشارہ کیا ہے۔ اِنسانیت جس اِخلاقی اور رُوحانی اِنقلاب کی تمنا میں ہے' وہ اِسی خطے سے رونما ہوگا۔ یہ وہی خطہ ہے جہاں سے میرِ عرب ﷺ کو ٹھنڈی ہوا آئی ۔ یہ وہی سرزمین ہے جس کے بارے میں آقا کریم ﷺ نے فرمایا ''میں عرب ہوں لیکن عرب مجھ میں نہیں، میں ہند میں نہیں لیکن ہند

مجھ میں ہے''۔ مدینہ منورہ سے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کو اِسی خطے کی طرف والیٔ ہند بنا کر بھیجا گیا۔ بابا فرید الدین گنج شکرؒ نے اَجودھن کو ''پاک پتن'' کیا...... گویا کتابِ پاکستان کا دیباچہ تحریر کر دیا۔

ع اِس وطن کا نقشِ اوّل ''خطۂ شہرِ پتن'' (واصفؒ)

سندھ کو محمد بن قاسم نے کہاں' حضرت عبداللہ شاہ غازیؒ نے فتح کیا...... ہند کو محمود غزنوی نے نہیں بلکہ حضرت علی ہجویری المعروف داتا گنج بخشؒ نے فتح کیا۔ وہ خزانہ لُوٹنے آیا اور لَوٹ گیا، یہ خزانے تقسیم کرنے پر مامور ہوئے ......اور تا حال یہیں مقیم ہیں۔ شہاب الدین غوری تو شکست کھا کر واپس لوٹ چکا تھا، خواجہ خواجگان حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ نے غوری کو واپس بلوایا اور پرتھوی کو اِس کے سپرد کیا۔ گزشتہ صدی میں اِقبالؒ اور موجودہ صدی میں واصف علی واصفؒ جیسے سفیرانِ مدینہ کی سفارت اِسی خطے کو مدینۂ ثانی بنانے کیلئے تھی۔ ان رُوحانی سفیروں کی ایک کہکشاں ہے کہ سلسلہ در سلسلہ آسمانِ فکر کو منور کرتی چلی جا رہی ہے۔ مادّے میں نور پیدا کر رہی ہے' اور جغرافیائی حقیقت کو ایک رُوحانی حقیقت بناتی جا رہی ہے۔ عرض سے جوہر کی دریافت ہی اہلِ فکر کی معراجِ فکر ہے۔

علاّمہ اقبالؒ نے غلام قوم کو آزادی کا خواب دیا، قائدِ اعظمؒ نے اِس خواب کو تعبیر سے ہمکنار کیا...... تعبیر' تعمیر تک نہ پہنچی تھی کہ ہدی خوان رخصت ہو گئے۔ لوگ راستے میں خرید و فروخت میں مشغول ہو گئے...... مفادات کی منڈیاں لگ گئیں ...... موقع پرستوں نے جا بجا اپنی منڈلیاں لگا لیں ...... اور قوم کا مستقبل داؤ پر لگا دیا۔ راہبروں کے رُوپ میں راہزن میرِ قافلہ ہوئے۔ لٹیروں نے چرب زبانی سے قوم کو متاعِ وحدتِ فکر سے محروم کیا۔ وحدتِ فکر نہ ہو' تو وحدتِ عمل کیسے پیدا ہو؟ ......اور وحدتِ عمل نہ ہو تو ایک مضبوط اور توانا پاکستان کی تعمیر کیسے ممکن ہو......؟ تعمیرِ پاکستان ابھی زیرِ تکمیل ہے...... یعنی تکمیل پاکستان ابھی

زیرِتعمیر ہے...... کہ نصف صدی تمام ہوئی...... اور بقول حضرت واصف علی واصفؒ "چاروں صوبے ابھی چاروں عناصر کی طرح ظہورِ ترتیب میں ہیں"۔

اَرضِ پاک کے منتشر اور مضمحل اجزاء اپنے ظہورِ ترتیب کیلئے ایک مربوط فکری نظام کا تقاضا کرتے ہیں۔ وحدتِ فکر ہمیں جسدِ واحد بنائے گی۔ ایک طرزِ فکر ہمیں ایک قوم بنائے گا۔ فکری ربط...... استحکام کی شرطِ اوّل ہے۔ ایک مستحکم پاکستان کیلئے ہمیں ایک ایسے فکری سرمائے کی ضرورت ہے جو دانش کی سطح پر بھی ذہنوں کو یکجا کر سکے اور رُوحانی سطح پر بھی دلوں کو موہ کر وحدت کی ایک مالا بنا دے۔ وہ اہلِ فکر و نظر جنہوں نے پاکستان کی رُوحانی سطح پر تشریح کی ہے' ان کے کام اور کلام کو یکجا کرنے کی ضرورت ہے تاکہ خواب اور تعبیر کے بعد تعمیر کا مرحلہ طے ہو۔ حضرت واصف علی واصفؒ ان صاحبانِ فکر و فن کے سرخیل اور امام ہیں جنہوں نے اپنے قلم اور کلام سے استحکام پاکستان کیلئے شبانہ روز جدّ و جہد کی' فکری انتشار کو اتحاد میں ڈھالنے کی سعی کی' اور وحدتِ ملّی کیلئے فکر سازی کی۔ خوش قسمتی سے ہمارے پاس فکرِ واصفؒ کی صورت میں ایک ایسا طرزِ فکر موجود ہے' جو اسلوب میں جدید ہے اور تاثیر میں قدیم...... اور جس کے اندر روحِ دِین نفخ کی ہوئی ہے۔ فی زمانہ یہ واحد فکری نظام ہے' جو سب مکتبہ ہائے فکر کیلئے بیک وقت قابلِ قبول ہے۔ جامعہ پنجاب کے طالب علم ہوں یا لمز (LUMS) کے فارغ التحصیل...... جامعہ اشرفیہ کے طالبعلم ہوں' جامعہ نعیمیہ کے معلّم ہوں یا پھر جامعہ المنتظر کے متعلّم...... ہر طرز اور فکر کا نوجوان طبقہ اقوالِ واصفؒ سے متاثر بھی نظر آتا ہے اور اِن کا منتظر بھی!!! اہلِ فکر کا یہ ایک مسلسل مشاہدہ ہے کہ جس نوجوان کی رغبت واصفی فکر کی طرف ہو جاتی ہے' وہ اپنی گروہی اور مسلکی عصبیتوں سے باہر نکل آتا ہے۔ فرقہ واریت کی گمراہی کے اِس دَور میں فکرِ واصفؒ قوم کیلئے ایک آسمانی تحفے سے کم نہیں۔ تعلیماتِ واصفؒ ہمیں برداشت' رواداری' تحمل اور دوسروں کو فراخ دلی

سے معاف کرنے اور معافی مانگنے کا اسلوب سکھاتی ہیں ...... اور ہمارے قلب ونظر میں دینی' اخلاقی اور رُوحانی قدروں کی قدردانی کا ذوق پیدا کرتی ہیں۔

نظم ہو یا نثر ...... ہر پیرے اور پیرائے میں ...... وطن کا دَرد اور دَرد کا درماں بیان کرنا کلامِ واصفؒ کا وہ وصف ہے' جو آپؒ کے ''مصلحِ پاکستان'' ہونے کا مظہر ہے۔ پاکستان اور پاکستان سے محبت کا درس آپؒ کی طریقت کا نشانِ اِمتیاز ہے۔ آپؒ کی رُوحانی ذمہ داریوں میں سب سے اہم ذمہ داری استحکام پاکستان کیلئے اہل فکر و دانش میں شعور کی بیداری ہے۔ درحقیقت ایک عظیم رُوحانی انقلاب کیلئے آپؒ کی تحریریں میدانِ فکر و عمل تیار کر چکی ہیں۔

مجددِ طریقت حضرت واصف علی واصفؒ قوم کو ایک مشترک رُوحانی پلیٹ فارم پر لانے کیلئے اہل فکر کو تجدیدِ فکر کے ایک مرحلے سے گزارتے ہیں ...... فرماتے ہیں:

''جس طرح ہمارے ہاں طریقت کے سلاسل ہیں' چشتی، قادری، نقشبندی، سہروردی وغیرہ اور ہر سلسلے کا کوئی بانی ہے' اسی طرح قائدِ اعظمؒ سے ایک نئی طریقت کا آغاز ہوتا ہے اور وہ طریقت ہے ''پاکستانی''۔ اس طریقت میں تمام سلاسل اور تمام فرقے شامل ہیں۔ ہر ''پاکستانی'' پاکستان سے محبت کو ایمان کا حصہ سمجھتا ہے۔ ہمارے لیے ہمارا وطن خاکِ حرم سے کم نہیں۔ اقبالؒ نے مسلمانوں کو وحدتِ افکار عطا کی، قائدِ اعظمؒ نے وحدتِ کردار''۔

قوم میں شعورِ وحدت پیدا کرنے کیلئے حضرتِ واصفؒ لائحہِ عمل دے رہے ہیں:

''قوم میں وحدت کا شعور پیدا کرنے کے لیے ہر سکول میں سندھی، بلوچی، پشتو اور پنجابی زبانیں لازمی کر دی جائیں۔ انگریزی سکولوں اور دینی مدرسوں کا نصاب یکساں کر دیا جائے۔ ورنہ وہی کچھ ہوتا رہے گا' جو ہو رہا ہے''۔

موجودہ دَور میں اندرونی اور بیرونی نامساعد حالات میں اضطراب ہمارا ایک اجتماعی رویہ بن کر سامنے آیا ہے۔ اس رویے کو بعض لوگ ڈیپریشن اور بعض فرسٹریشن کا نام

دیتے ہیں۔ کسی کمزوری کو ممکنہ طاقت کی شکل دینا صرف صاحبانِ تصرف ہی کا کام ہوتا ہے۔ اضطراب کی اِس تنگنائے کو قلزمِ وحدت سے ہمکنار کرنے کا سبق دیتے ہیں:

''اضطراب ایک قوت ہے۔تشخص کا ایک مقام ہے۔ پہچان کا ایک زاویہ ہے۔شخصیت کا ایک پہلو ہے۔مضطرب قومیں اپنے لیے نئے سورج تراش لینے میں اکثر کامیاب ہوتی ہیں''

اِس گھٹا ٹوپ صورتِ حال میں ایک روشن مستقبل کی نوید دینا اہلِ سخن نہیں بلکہ اہلِ مشاہدہ کی قدرت ہوا کرتی ہے۔فرماتے ہیں:......

''حال کے بدحال ہونے کے باوجود مستقبل کے خوش حال ہونے کی اُمید ترک نہیں کرنی چاہیے''

''اِنتظار ترک نہ کیا جائے...... رحمت ہوگی......اُمّید کا چراغ جلے گا''

اور یہ کہ...... ''ہم جسے تاریکی سمجھ رہے ہیں......یہی صبحِ کاذب تو صبحِ صادق کا آغاز ہے''

اِس قوم کو دنیا کی عظیم قوم بنانے کیلئے آپؒ اخلاقیات کا نصاب مرتب کر رہے ہیں:

''ہم ایک عظیم قوم بن سکتے ہیں' اگر ہم معاف کرنا اور معافی مانگنا شروع کر دیں''

''وحدتِ عمل اور وحدتِ کردار......یہی اور صرف یہی ہمارے لیے راہِ نجات ہے''

''اب وقت آ گیا ہے کہ ہم اپنی صفوں میں اتحاد پیدا کریں......اپنے اعمال اور اپنے مال میں سب کو شریک کریں......دوسروں کی عزت کریں تا کہ ہماری عزت محفوظ ہو!!''

آزادی ایک مسلسل نگہبانی چاہتی ہے۔ جو قومیں خود پر نگہبان نہ ہو سکیں' اُن پر دوسری قوموں کو نگہبان کر دیا جاتا ہے۔آزاد ہو جانے کے بعد آزادی کیسے برقرار رکھی جا سکتی ہے......اس پر قوم کو ایک لائحۂ عمل سے روشناس کرواتے ہیں::

''آزادی کی صرف ایک ہی قیمت ہے......مستقل اور مسلسل بیداری!

غلام قومیں سوتی ہیں اور آزاد قومیں بیدار رہتی ہیں''

اس بدنظمی کے دَور میں حضرت واصف علی واصفؒ کی نظم اہلِ فکر کی روح میں

ایک عجب سرمستی و سرشاری پیدا کرتی ہے...... اور سرمستی سے پیدا ہونے والا نظم ہمہ حال ہوتا ہے...... کہ وہ قیل وقال نہیں' بلکہ نتیجۂ حال ہوتا ہے۔

؎ دیوانگی کے بعد ملی مجھ کو آگہی　　　میرے جنوں نے مجھ کو دیا اِذنِ پیرہن

(واصفؒ)

حمدِ ربِ العلیٰ ہو، نعتِ خیرالوریٰ ﷺ ہو، منقبتِ شیرِ خداؓ ہو' یا مدحتِ اولیاءؒ ہو...... ارضِ پاکستان پر کرم کی درخواست آپؒ کے کلام کی پہچان ہے۔ آپؒ نے اپنے شعری کلام میں لفظ ''پاکستان'' جس تواتر سے قلم بند کیا ہے' اُردو اَدب کے محققین کیلئے وہ بجائے خود ایک مکمل موضوع ہے۔ بارگاہِ صمدیت میں یوں گویا ہوتے ہیں:

تُجھے ہے واسطہ تیری بقائے مُطلق کا　　　مرے وطن کی بقا کا بھی کچھ تو ہو سامان

بارگاہِ نبوی ﷺ میں عرض گزار ہیں:

کرم ہو ارضِ پاکستان پہ یا رحمتِ عالم　　　سلامی دے رہا ہے سبز پرچم یارسول اللہ

خاکِ وطن کی نسبت دُرِ نجف سے کرتے ہیں' اور اِسے خوشبوئے ختن کرتے ہیں:

ہے شہیدوں کی سرزمیں یہ وطن　　　اب سلامت رہے گا یہ گلشن
اس وطن پر نگاہ ہے اُس کی　　　یہ زمیں جلوہ گاہ ہے اُس کی
دین کو جس نے نُورِ عین دیا　　　یعنی اپنا جگر حسینؓ دیا

حضرت داتا علی ہجویریؒ کی شان میں منقبت پیش کرتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ وطن کا استغاثہ پیش کرتے ہیں:

ملتِ بے مایہ کو گُم کر گئی کم مائیگی　　　ایک ہم ہیں اور ہے اُفتادِ پیہم، السلام
کیا قیامت ہے کہ پاکستان ہے زیرِ عتاب　　　ہم تماشا ہیں تماشائی دو عالم، السلام

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے معروف اور زبان زدِ عام شعر........ ''گنج بخش فیض

ِ عالم مظہرِ نُورِ خدا...... ناقصاں را پیرِ کامل' کاملاں را راہنما''...... کی زمین میں منقبت قلم بند کرتے ہیں' اور اِس میں بھی سرزمین وطن کا اِستغاثہ رقم ہے۔ یہ منقبت جہاں حضرت داتا گنج بخش فیض عالمؒ کی شان میں کہا گیا اُردو اَدب کا ایک نادرِ رُوزگار کلام ہے' وہاں یہ لوح سفید پر ثبت دربارِ اقدس کے مشرقی برآمدے میں نصب' وطن کے حوالے سے ایک نقش فریاد بھی ہے:

یہ زمیں تیری ہے' تیرے چاہنے والوں کی ہے   ابتدا ہے لاالٰہ اس کی' یہی ہے انتہا
آج پھر ملّت کو ہے اندیشۂ کم مائیگی   آیۂ لاتقنطو کی شرح ہوجائے ذرا
اب ضرورت ہے شرابِ شوق کی اِس قوم کو   جامِ اِلّا اللہ کو ساقی ذرا گردش میں لا

خواجۂ خواجگان حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی شان میں منقبت کہتے ہوئے بھی وطن کی حالتِ زار کا بیان اصل ''حرفِ مدّعا'' ہے:

منزلیں گُم ہوگئیں' رستے فضا میں کھو گئے   شاہبازوں کے علاقے لے گئے زاغ و زغن
آگیا ہے لب پہ آخر آج حرفِ مدّعا   اپنے سرمستوں کو خواجہؒ دیجیے اِذنِ بزن

''بھرے بھڑولے'' حضرت واصف علی واصفؒ کے پنجابی کلام کا مجموعہ ہے، یہاں بھی لفظوں کے سب بھڑولے وطن کے درد سے بھرے ہوئے ہیں:

ساڈی دھرتی نظرِ کرم دی ہے محتاج قدیمی   ساڈی فریاداں نوں مولا بخشو فیض اثر دا

پیر وارث شاہؒ کے حضور ''چادر'' نذر کرتے ہیں اور وطن کی خیر کی دُعا بھی پیشِ نظر ہے:

منگو پاک وطن دی خیر واصفؔ' دیوے سب مصیتاں ٹال چادر
بنے بات جے کرے قبول سوہنا' وارث شاہؒ میاں لجپال چادر

......اور پھر وطن ہی کے حوالے سے ''سرِ عرش نعرہ بپا ہوا''......

نہ امیر ہیں' نہ فقیر ہیں،کوئی راہبر ہیں' نہ پیر ہیں
یہاں بوترابی فقیر ہیں' کہ ہے ملک اب بھی بچا ہوا

یہ خدا کے نور کا نور ہے ، ابھی منزلوں سے ہی دُور ہے
ہوا ہر قدم پہ قصور ہے، کہ حجاب سا ہے پڑا ہوا
یہ پلٹ کے جھپٹے تو قہر ہے ، یہی قوم حاصلِ دہر ہے
پڑی ساحلوں پہ یہ لہر ہے کہ ہے اس پہ جادو کیا ہوا

......اور ''دُور کی آواز'' سننے والا صاحب مشاہدے کو مکالمہ بنا رہا ہے :

جو سنا تھا' سنا دیا میں نے یعنی سب کچھ بتا دیا میں نے

اور یقیناً...... ''دُور سے آنے والی آواز بھی اندھیرے میں روشنی کا کام کرتی ہے''

آنے والے کمال کے دن ہیں عظمتِ ذوالجلال کے دن ہیں

قطبِ ارشاد حضرت واصف علی واصفؒ کی شخصیت اور تحریر دونوں کا وصفِ خاص یہ ہے کہ مایوسیوں کے پاتال میں گر جانے والوں کو سطحِ اُمید پر لے آنے میں یدِ طولیٰ رکھتی ہیں۔ پاکستان کے حوالے سے جس شخص کا سفینۂ فکر کبھی تذبذب کے بھنور میں 'گھر گیا' آپؒ کے ارشادات کے طفیل اور تصرف سے یقین کے ساحل پر ضرور لنگر انداز ہوا۔ قومیں فکری تذبذب سے نکل جائیں تو عمل راست کی شاہراہ پر گامزن ہو جاتی ہیں۔ آپؒ کا ارشاد ہے: ''قوم کو تذبذب میں مبتلا کرنا ایک ظلمِ عظیم ہے''۔ اِس طوفانی دَور میں جب ایسے ظالموں کی تعداد اور تعدّی دونوں بڑھتے چلے جا رہے ہیں' صد شکر کہ ہمارے پاس فکرِ واصفؒ کی صورت میں ایک ایسا سائبان میسر آ چکا ہے' جو ہمیں مایوسیوں کے دشتِ کرب میں دھکیلنے والوں کے سبّ و شتم سے محفوظ و مامون کرتا ہے۔

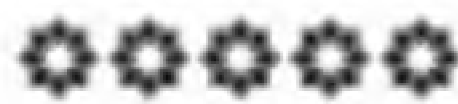
جان کاشمیری نے ایک سیمینار میں کیا خوب کہا تھا:

؎ واصفی فکر سے ہر سوچ سجی لگتی ہے
یہ صدی حضرتِ واصفؒ کی صدی لگتی ہے

حضرت واصف علی واصفؒ کے مضامین' نثر پارے اور نظم کے تمام پیرائے قوم کیلئے دَرُون خانہ ''افلاک سے آتا ہے نالوں کا جواب آخر'' کا سامان لیے ہوئے ہے، آپؒ کی تعلیمات کو نصاب کا حصہ بنانے کی ضرورت ہے ...... تاکہ نوجوانانِ ملّت ایک رُوحانی طرزِ فکر لے کر میدانِ عمل میں آئیں اور اپنے قوتِ کردار سے نہ صرف یہ کہ پاکستان بلکہ کل عالمِ انسانیت کو ایک عظیم روحانی انقلاب سے رُوشناس کروا سکیں۔

حضرت واصف علی واصفؒ کا فکری اَثاثہ دراصل ایسے مردانِ کار و اَفکار تیار کرتا ہے' جو پاکستان کی خاطر کچھ کر گزرنے اور اِس پر تن من دھن نثار کرنے کا جذبہ ہی نہیں' داعیہ بھی رکھتے ہیں۔فکرِ واصفؒ ایک ایسی شاہراہِ عمل بھی متعین کرتا ہے جس پر گامزن راہروانِ منزل بمنزلہ سنگِ میل ہو جاتے ہیں۔فکرِ واصفؒ ملت کیلئے ایک عطیہ خُداوندی ہے۔ خودشناس واصفؒ 'خداشناس واصفؒ ......قوم کو خود سے یوں روشناس کروا رہا ہے:

لے آیا ہوں اَفلاک سے ملّت کا مقدّر
کیا کیجئے مقدور کا شکوہ میرے آگے
واصفؔ ہے مرا نام مگر راز ہوں گہرا
ذرّے نے جگر چیر کے رکھا میرے آگے



حسّیات سے احساس تک!

انسان اگر خود کو مجموعۂ حسیات سمجھے' تو وہ صرف پانچ حواس کا مالک ہے ...... اور یہی انسان خود کو مرقعٔ احساس تصور کرے' تو ماورائے حسیات ہے۔ احساس ...... اپنے درد کو بھول کر دوسروں کا درد محسوس کرنے کی صلاحیت کا نام ہے ...... اور بے حسی صرف اپنے مفادات اور حسیات کے دائرے میں زندگی بسر کرنے کا عمل ہے۔ احساس سے محروم آدمی بے حس ہوتا ہے ...... ہر چند کہ بقائمی ہوش وحواس لکھا جاتا ہے۔ درحقیقت انسان احساس کی دنیا میں اُس وقت داخل ہوتا ہے' جب وہ اپنے حواس کی دنیا سے کنارہ کش ہو جاتا ہے۔ جب تک اِنسان حسیات کی دنیا میں قید ہے' اپنی اَنا میں مخمور ہے ...... نشاطِ رنگ و بو میں محصور ہے۔

یہ آدمی کی خواہش ہے جو اُسے حسیات کی قید و بند برداشت کرنے پر مجبور کر دیتی ہے ...... اور حسیات کی یہ قید' عمر قید ہے!! عالم رنگ و بو سے وہی بے نیاز ہو سکتا ہے' جو خواہش سے نجات پالیتا ہے۔ دراصل ہر خواہش کا ایک رنگ ہوتا ہے اور رنگ رنگ کی خواہش ہوتی ہے۔ خواہش ایک خودرَو پودے کی طرح ہوتی ہے ...... جب تک اسے دل کی زمین سے جڑوں سمیت نکال باہر نہ کیا جائے' تلف نہیں ہوتی۔ درحقیقت خواہش لباس اور چہرے بدل بدل کر دھوکا دینے کے فن میں یدِ طولیٰ رکھتی ہے۔ خواہش سے نجات کا راستہ

صرف تسلیم کے باب سے گزرتا ہے۔ تسلیم کا مطلب اُمر کو تسلیم کرنا ہے ...... اور اُمر کسی صاحبِ اُمر کا ہوتا ہے۔ جب تک انسان کسی صاحبِ اُمر کو تسلیم نہیں کرتا' وہ بابِ تسلیم سے نہیں گزر سکتا۔ تسلیم کے اس بہشتی دروازے سے گزرنا دراصل ایک صاحبِ اَمر کے زیرِ سایہ آنے کا نام ہے۔ یہ حسابی کتابی بات نہیں' بلکہ عملی بات ہے...... اور عمل کرنے سے بات بنتی ہے!!

اپنی خواہش کا اَسیر شخص دوسروں کا دُکھ سُننے اور دَرد محسوس کرنے سے معذور ہوتا ہے۔ جو آدمی خود ہی اپنی خواہش کے ہاتھوں پریشان ہو' وہ کسی پریشان حال کی طرف مدد کا ہاتھ کیسے بڑھا سکتا ہے۔ ظاہر ہے' دوسروں کی مدد کو پہنچنا صرف ایک مردِ آزاد کا کام ہے۔ مردِ بیمار اور مردِ آزار...... خواہشاتِ نفس کے عارضے میں مبتلا ہوتا ہے...... اور جسے یہ عارضہ لاحق ہو جائے' وہ مزید مزید پکارتا ہوا' ہلاکت کو پہنچ جاتا ہے...... ہاں! اگر قسمت یاوری کرے تو کوئی مسیحا و خضر' راہ میں توبہ کا رستہ دکھا کر اُسے ہلاکت کی وادی میں گرنے سے بچا سکتا ہے۔

حیات کی دنیا...... عمل اور ردِّ عمل کی دنیا ہے۔ ہر عمل ایک ردِّ عمل رکھتا ہے...... اور کوئی بھی عمل جب اپنے ردِّ عمل کی زد میں آتا ہے تو ردّی کی ٹوکری میں چلا جاتا ہے۔ ہر اچھا عمل اپنے ردِّ عمل کے سبب برائی کی شکل اختیار کر جاتا ہے۔ جب تک اِنسان حیات کی دنیا میں قید رہتا ہے' اُس کا ہر عمل اپنے ہی ردِّ عمل کا شکار ہو کر بے اثر ہوتا رہتا ہے۔ جب تک انسان بے ریا ہو کر عمل نہیں کرتا' وہ اپنے عمل کے ردِّ عمل میں گرفتار رہے گا...... یعنی حسنِ عمل سے محروم رہے گا۔ حسنِ عمل' اپنے عمل کے ردِّ عمل سے نجات حاصل کرنا ہے۔ خود غرض آدمی جسے نیکی کے نام سے موسوم کرتا ہے' وہ اُس کے مزاج اور مفاد کی تسکین کا نام ہوتا ہے اپنے مزاج کا اَسیر...... لازم ہے کہ حیات کی دنیا کا اَسیر ٹھہرے۔ اپنے مزاج

اور مفاد کے دائرے میں زندگی بسر کرنے والا ایک محدود منظر کا اُسیر ہوتا ہے...... خواہ وہ سَیر و سیاحت کی دنیا کا اُمیر ہی کیوں نہ ہو۔ اس کائنات کا سب سے بڑا سیاحتی عجوبہ حضرت انسان کی زیارت کرنا ہے۔ کسی انسان سے مکالمہ کرنا ایک ایسا معنی خیز عمل ہے، جس پر سینکڑوں کتابیں قربان ہیں...... کتاب ایک خاموش داستان ہے اور انسان ایک بولتا ہوا سفرنامہ ہے۔ وہ شخص جو اپنے مزاج سے ہجرت نہیں کرتا، وہ کسی بھی انسان کی زیارت و قربت کے شرف سے محروم رہ جاتا ہے!!

اپنے مزاج کی دنیا میں بسر کرنے والا...... حق پر ہوتے ہوئے بھی دوسروں کے حق میں ظالم ہو جاتا ہے...... کیونکہ اپنے مزاج کا برملا اظہار ایک درجۂ غرور بھی ہے...... اور غرور کا کوئی بھی اظہار توہینِ انسان سے کم پر ختم نہیں ہوتا۔ احترامِ انسانیت یہ ہے کہ ہر شخص کی رائے کا احترام کیا جائے...... خواہ وہ کمزور ہے، یا طاقتور۔ اپنی رائے پر اِصرار کرنے والا دوسروں کی رائے کو معتبر نہیں جانتا...... اور اس سے اُس کا اپنا اعتبار جاتا رہتا ہے۔ جو شخص اپنے سے کمزور شخص کی رائے کا احترام نہیں کرتا، اُسے طاقتوروں کی رائے رام کر لیتی ہے...... اور یہ تکریمِ انسانیت کی نفی ہے۔ اپنی رائے دوسروں پر ٹھونسنا غیر مہذب ہونے کی دلیل ہے۔ رائے تو بس ایک رائے ہے...... اور اختلافِ رائے پر تیغ پا ہونا دراصل علم سے دُور ہونے کی نشانی ہے۔ اس کائنات میں سب بڑا ظلم انسان کی تکریم سے غافل ہونا ہے...... اور یہ ظلم اوزون (ozone) کی پرت ختم ہو جانے سے پہلے اس دنیا کو ختم کر سکتا ہے...... توہینِ انسان کے اثرات سے گلوبل وارمنگ سے بہت پہلے انسان کا گلوب چیخ سکتا ہے۔ پس امنِ عالم کیلئے اپنے مزاج پر فتح پانا لازم ہے۔ اپنے مزاج پر فتح ایک فتحِ عظیم ہے۔

یہ صرف اِحساس کی دنیا ہے جہاں تکلیف جھیلی جاتی ہے...... اور پہنچائی نہیں

جاتی ...... یعنی دوسرے کا رڈِ عمل بھی اپنے سَر لے لیا جاتا ہے...... اور خود کسی ردّ عمل کا مظاہرہ نہیں کیا جاتا۔ احساس کی دنیا کا سفیر معاشرے میں ایک 'شاک ابزاربر' کا کام کرتا ہے...... وہ ہر قسم کے دھکے کو اپنے اوپر لے لیتا ہے اور اپنے آگے اور پیچھے کسی کو ویسا ہی دھکا دینے کا قائل نہیں ہوتا۔ خود تکلیف اُٹھا کر دوسروں کو تکلیف سے محفوظ رکھنا بڑے لوگوں کا کام ہے...... اور ظاہر ہے' کام ہی بتاتا ہے کہ کون کتنا بڑا ہے۔ چھوٹا آدمی بہت جلد گلے اور تقاضے پر اُتر آتا ہے۔ بڑا آدمی' چھوٹے آدمی کو برداشت کرتا ہے۔ خوش مزاج آدمی بدمزاج کو برداشت کرتا ہے۔ کسی بدمزاج شخص کو برداشت کرنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ اس کے سامنے اپنی رائے کا اظہار نہ کیا جائے' اور اپنی خاموشی کے سائبان تلے اُسے ایک روسٹرم فراہم کر دیا جائے' جس پر کھڑا ہو کر وہ اپنی بدمزاجی کا مظاہرہ کرتا رہے۔ خاموشی ...... کسی بھی تکلیف کو برداشت کرنے کا پہلا مرحلہ ہے...... اور یہ مرحلہ جو طے کر لیتا ہے' اس کیلئے باقی مراحل آسان ہو جاتے ہیں۔ خاموشی ...... ایک قوتِ برداشت ہے۔ گلہ اور تقاضا...... خودغرضی کا اندھا مظاہرہ ہے...... دوسروں کو ذہنی تکلیف پہنچانے کے ہتھیار ہیں۔ گلہ اور تقاضا کرنے والا اپنی وقتی آسودگی کیلئے دوسروں کو دائمی دِقت میں مبتلا کر دیتا ہے۔

حسیات کے دائرے کا اَسیر خودغرضی سے باہر نہیں نکل سکتا۔ آزاد فضا میں سانس لینا صرف انہیں ہی نصیب ہوتا ہے جو اپنی اغراض سے رہائی حاصل کر لیتے ہیں۔ اغراض انسانی ...... محسوساتی بھی ہوتی ہیں اور غیرمحسوساتی بھی۔ محسوس ہونے والی اغراض حواسِ خمسہ سے متعلق ہوتی ہیں ...... اور غیرمحسوساتی اغراض کا تعلق ہماری اَنا سے ہے ...... مثلاً غرور' تعصب' کینہ اور حسد وغیرہ!!

اخلاص ...... ایک ایسا شعور ہے جو ہر کس و ناکس کی پہچان میں نہیں آتا۔ ایک خود

غرض آدمی کیلئے یہ تصور کرنا محال ہے کہ دنیا میں کوئی انسان کسی ذاتی غرض کے بغیر بھی کام کرسکتا ہے۔ جب تک ذاتی غرض نہ نکل جائے ...... ذات کو انسان سے کیا غرض ہے' سمجھ میں نہیں آسکتا۔ صرف ایک بے ریا شخص ہی فراغت کی حالت میں ہوتا ہے...... اس لیے وہ خود سے مکالمہ کرسکتا ہے...... اور جو خود کلامی کرنے پر قادر ہو' وہی اپنے ہم مشربوں سے بھی تبادلۂ خیال کرسکتا ہے۔ ہم خیال ...... ہمہ حال ہم کلام رہتے ہیں۔ خودغرض آدمی مصروف ہوتا ہے...... اسے بولتے رہنے سے فرصت نہیں ...... اُسے ہر وقت اپنے کسی مفاد کی نگہداشت مطلوب ہوتی ہے۔ وہ جانتا ہے کہ جس لمحے وہ خاموش ہوا' اس کی چوری پکڑی جائے گی۔ اسے فراغت ہو تو وہ خود سے ہم کلام ہو۔ جسے خود سے ہم کلام ہونے کی فرصت نہ ہو' وہ خدا سے ہم کلام کیسے ہوگا!!

خودغرض آدمی اپنے دائرۂ حیات سے باہر نہیں نکل سکتا ہے۔ صرف اخلاص میں یہ قوّت موجود ہوتی ہے' جو انسان کو اس کے وجود کے جمود سے باہر نکال سکتی ہے۔ وجود کا جمود ایک زبردست کشش ثقل ہے...... اس سے آزاد ہونا کسی سلطان کی دستگیری کے بغیر ممکن نہیں۔

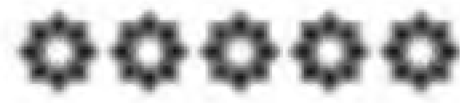
مفاد کے تحت شروع کیا گیا عمل بالآخر اختتام کو پہنچ جاتا ہے...... کیونکہ مفاد بھی ختم ہو جاتا ہے۔ بے ریا کام جب شروع ہو جاتا ہے تو جاری رہتا ہے...... بہتے ہوئے پانی کی طرح ...... کہ اخلاص میں کوئی تعطل ہے' نہ تعطیل!!

اِخلاص ایک وادیٔ بے گماں ہے...... یقین کا چہرہ اسی وادی میں باغ فردوس کی ہوا بن کر ملتا ہے۔

جب تک دراحساس وانہیں ہوتا احساس زیاں جنم نہیں لیتا۔ جسے احساسِ زیاں میسر آجائے' وہ گھاٹے میں نہیں رہتا ...... وہ حق اور صبر کے دائرے میں آجاتا ہے۔ وہ

جاگ اٹھتا ہے...... اور دوسروں کو جگانے لگتا ہے۔ بقول مرشدِ صادق حضرت واصف علی واصفؒ ''جسے احساس نہ جگائے' اسے کون جگا سکتا ہے!'' پس جگانے کا عمل احساس بیدار کرنے کا عمل ہے۔ جب تک درِ احساس وانہیں ہوتا...... علم، خیال اور جستجو کا کوئی باب نہیں کھلتا۔

وہ مطمئن کہ زیاں جو ہوا' ہوا واصفؔ
مجھے یہ فکر کہ ہو کیسے وا ' درِ احساس



ایک بد اخلاق شخص اِس بات کا دہرا مستحق ہے کہ اُس سے خوش اخلاقی سے پیش آیا جائے ...... تب ہی تو اِسے اپنے اخلاق کے عالم کا اِحساس ہوگا۔ اگر بد خلقی کے جواب میں بد خلقی ہی برتی جائے' تو اِحساس کا زیاں دو طرفہ ہو جاتا ہے۔ اِحساس ہی تو زندگی ہے...... اِحساس کا ضیاع' زندگی کا ضیاع ہے...... جو شخص احساس سے محروم ہے' وہ زندگی سے محروم ہے۔

(دلِ ہر قطرہ)

طاقت کی محبت اور محبت کی طاقت!

جب سے انسان اپنے اختیار اور شعور کے عقد میں آیا ہے...... وہ بنیادی طور پر دو عقیدوں میں سے ایک کا معتقد رہا ہے۔ ایک عقیدہ طاقت کی محبت کا قائل ہے...... اور دوسرا محبت کی طاقت سے گھائل۔ آدم تا ایں دم...... ابنِ آدم دو نظریاتی گروہوں میں منقسم ہے ...... ایک کی سربراہی ہابیل کے پاس ہے اور دوسرا قابیل کے نقشِ قدم پر ہے۔ ہابیل محبت کی طاقت کا قائل تھا اور قابیل طاقت ہی کو اپنا کارساز اور عُقدہ کشا سمجھتا تھا۔ محبت کو طاقت سے حاصل کرنے کی تمنا بھی درحقیقت طاقت سے محبت رکھنے کی دلیل ہے۔ قابیل کے قبیل سے تعلق رکھنے والے لوگ اس کائنات میں ہونے والے ہر واقعے کو محض طاقت کے ہونے یا نہ ہونے کا نتیجہ جانتے ہیں۔ جبکہ ہابیل کے فکری قبیلے سے تعلق رکھنے والوں کا اندازِ فکر جدا ہے ...... وہ محبت کو اس زندگی کا سب سے معتبر محرک تصور کرتے ہیں۔

یہ انسان کا اندازِ فکر ہے جو اُس کی زندگی کی تمام جزئیات کو ایک عنوان کے تحت سمیٹ لیتا ہے۔ محبت کی طاقت اور طاقت کی محبت میں وہی فرق ہے جو حاصل کرنے کی خواہش اور ایثار کرنے کی تمنا میں ہوتا ہے۔ ایک سوچ مادے کی دلدل کی طرف دھکیل دیتی ہے اور دوسرا خیال مادیّت سے نجات کی راہ دکھاتا ہے۔ ابتدائے آفرینش ہی سے انسانی فکر انہی دو دائروں میں سرگرداں ہے۔ ایک اندازِ فکر ایمان کی جانب لے جاتا ہے ......

اور دوسرا انداز' راستی سے دُور لے جاتا ہے...... راست نہ ہونے کے سبب!!

انسانیت کیلئے صد افتخار ہیں وہ لوگ جو محبت کی طاقت پر یقین رکھتے ہیں...... ......اور باعثِ ننگ و عار ہیں وہ' جو طاقت کی محبت میں گرفتار ہیں۔ جونہی طاقت کا پلڑا بدلتا ہے' وہ بھی بدل جاتے ہیں۔ عجب بات ہے...... اندر کی دنیا بدلنے میں نہیں آتی...... اور باہر کی دنیا ٹھہرنے کی نہیں۔ باہر کی دنیا متغیر رہتی ہے' اندر کی دنیا متحیر!! باہر کی دنیا میں انقلاب کا نعرہ ہوتا ہے...... اندر کی دنیا میں انقلاب برپا ہوتا ہے۔ تغیر و تبدل کی اس دنیا میں یہ صرف محبت کا منظر ہے جسے کبھی بھی نہ بدلنے کا اِذن حاصل ہے۔ محبت نہیں بدلتی...... اس لیے کہ محبوب نہیں بدلتا...... اور محبوب نہیں بدلتا...... کہ محبوب ایک ہی ہوتا ہے...... واحد ہوتا ہے...... یکتا ہوتا ہے۔ دلبر ایک ہی ہوتا ہے...... کہ اُز روئے قرآن انسان کے پہلو میں ایک ہی دل رکھا گیا ہے۔ محبوب ہر آن قائم رہتا ہے...... وہ جیسا تھا' ویسا ہی رہتا ہے۔ محبوب کے جلوے بدلتے ہیں' محبوب نہیں بدلتا۔

اِس کائنات میں سب بڑی طاقت کشش کی طاقت ہے...... اور کشش کسی طاقت کا نتیجہ نہیں...... بلکہ کشش اعجازِ محبت ہے۔ محبت ایک جذبِ دروں ہے...... اندروں بینی کے شغل سے آشنا کرتی ہے...... انسان کو ظاہر سے بے نیاز کرتی ہے اور باطن میں محوِ نیاز کرتی ہے۔ محبت انسان کو اندر کی دنیا سے متعارف کروانے کا ایک معتبر ذریعہ ہے۔

طاقت کی محبت میں مبتلا انسان صفات کے دائرے سے نہیں نکل سکتا...... اور محبت کی طاقت کی زد میں آنے والا' ذات کے حصار سے باہر نہیں آ سکتا ہے۔ محبت ایک مرکز مائل قوت ہے اور طاقت مرکز گریز رہتی ہے...... قوت مِل جانے کے بعد بھی۔ طاقت کے حصول کی تمنا انسان کو ظاہر پرست بناتی ہے۔ ظاہر پرست انسان باطن سے بے گانہ ہوتا ہے جبکہ باطن شناس یگانہ ہوتا ہے۔ ظاہر پرست اپنی باطنی قوتوں سے بے خبر' ظاہری قوتوں کی کاسہ

لیسی میں مشغول رہتا ہے۔

طاقت کی محبت میں مبتلا انسان اگر کفر میں مبتلا نہ بھی ہو تو منافقت کے گھیرے میں ہوتا ہے۔ اس کا ہر قول اور ہر فعل قدم قدم پر یہ ثابت کرتا ہے کہ اُس کے نزدیک ظاہر کی اہمیت زیادہ ہے...... بہ نسبت باطن کے...... جبکہ اہلِ محبت کی نسبت باطن سے طے ہے...... اُن کا ہر قدم ظاہر سے باطن کی جانب اُٹھتا ہے۔ اُن کی زندگی قدم قدم قربانیوں کی داستان ہوتی ہے۔ وہ باطن کو ظاہر کی قیمت پر اُٹھا لیتے ہیں...... بظاہر نقصان اُٹھاتے ہیں...... لیکن خسارے سے بچ جاتے ہیں...... اور شکر ادا کرتے ہیں کہ اُن کی قربانی قبول ہوئی۔

اہل محبت اور اہل طاقت کے درمیان وہی فرق ہوتا ہے...... جو بُعد المشرقین ہوتا ہے...... یعنی جو دین دار اور دنیا دار کے درمیان ہوتا ہے۔ ایک کی طاقت محبت ہے' جو ماسوائے محبوب کے سب سے بے نیاز ہے...... اور دوسرے گروہ کی طاقت مادّی اُسباب کی محتاج ہے...... یعنی سراپا احتیاج ہے۔

محبت پر یقین رکھنے والا طاقت کی بالادستی پر یقین نہیں رکھتا...... اس لیے زیردست ہوتے ہوئے بھی اپنے گرد و پیش سے بالا رہتا ہے...... یقین کی قوت سے!!

اہل محبت سے انسانیت محفوظ و مامون ہے اور اہلِ طاقت سے غیر محفوظ اور ہر لحظہ لرزہ براندام...... اس لیے کہ محبت صرف اہل تک پہنچتی ہے جبکہ طاقت نااہل کی دسترس میں بھی آ جاتی ہے۔ محبت میں مبتلا انسان اپنے اندر کے جھگڑے سے فارغ ہو چکا ہوتا ہے...... اس لیے وہ باہر کسی جھگڑے میں مبتلا نہیں ہوتا۔ صاحبِ محبت جہاد کرتا ہے' جھگڑا نہیں کرتا۔ اس کی جد و جہد مظلوم کو ظالم کے ظلم سے بچانے کیلئے ہے۔ معصوموں کو درندوں سے بچانے کیلئے اس پر جہاد فرض ہے...... اور یہ محبت کا اُس پر قرض ہے۔ محبت والا جب لڑتا ہے تو بھی تعلق منقطع نہیں ہونے دیتا...... آدمیت کا...... انسانیت کا...... مکالمے کا۔ غصہ اُس کی زبان

پر ہوسکتا ہے' دل میں نہیں۔ دوسری طرف طاقت کو اپنی جائے پناہ جاننے والا جب لڑنے پر اُتر آتا ہے تو سب سے پہلے تعلق کی چادر تار تار کرتا ہے۔ وہ زندگی میں صرف ایک ہی منظر دیکھنے کی صلاحیت رکھتا ہے...... اور وہ اس کے ذاتی مفاد کا ایک پس منظر ہوتا ہے۔

محبت والے کے پاس جب طاقت پہنچتی ہے تو مخلوقِ خدا کیلئے رحمت بن جاتی ہے ...... کہ وہ طاقت کو اپنی ذات تک محدود رکھنے کا قائل نہیں ہوتا۔ دوسری طرف طاقت کی رتھ پر سوار کوئی سورما اگر محبت کرنے لگے تو انسانیت کو خطرہ لاحق ہو جاتا ہے...... جنگیں برپا ہو جاتی ہے...... برسرِ تاریخ غارت گری کا بازار گرم ہو جاتا ہے...... اس لیے کہ وہ محبت کو اپنی جاگیر سمجھتا ہے...... اور ملکیت کے زعم میں مبتلا ہونے کے سبب...... کئی ممالک تاراج کرتا ہے...... پہلے اپنی مملکتِ وجود...... پھر دوسروں کا وجودِ مملکت!!

زندگی میں تعمیر و تدبیر کا تمام تر عمل' تدبر و تفکر سمیت' اہلِ محبت کے ذمہ رہا ہے اور تخریبی قوتوں کے ہاتھوں میں کھیلنا اور تعمیر و تعمیرات سبوتاژ کرنا' طاقت کے پجاریوں کا پیشہ رہا ہے...... ہر چند کہ وہ روزِ اوّل سے یہی کہتے چلے آرہے ہیں کہ: ''ہم ہی تو ہیں اصلاح کرنے والے''۔ طاقت کے زور سے اصلاح کرنے کی کوشش کرنے والا درحقیقت طاقت کا پجاری ہے...... خواہ کسی عبادت گاہ میں معتکف ہی کیوں نہ ہو...... خواہ گروہِ مصلحین میں معتبر ہی کیوں نہ ہو۔ اس کے برعکس اہلِ محبت اصلاح کیلئے فقط محبت ہی کو دَوا سمجھتے ہیں...... وہ بگاڑ کو مرض سمجھتے ہیں اور اِس کا درماں محبت کے دارُو سے کرتے ہیں۔

طاقت کثرت کی قائل ہوتی ہے اور محبت مائل بہ وحدت ہوتی ہے۔ پس وحدتِ عمل اور وحدتِ فکر پیدا کرنے کیلئے انسانی قلب میں محبت کی رُوح پھونکنے کی ضرورت ہے تاکہ اس کا قالب قبلہ رُو ہو جائے۔ درحقیقت محبت ایک کایا کلپ ہے...... فکر و نظر کی ...... قلب و جاں کی...... اور اِخلاق و کردار کی!!

طاقت کے پجاریوں کی لغت الگ ہوتی ہے...... اور محبت کے معبد میں مراقب اہلِ جنوں کا صحیفہ جدا۔ طاقت کی لغت میں رحم، احساس، احسان، اخلاص، اخلاق، ایثار، اور قربانی جیسے الفاظ متروک ہیں...... اور اِن کے معانی معدوم!! صحیفۂ محبت کی تلاوت کرنے والے اِن تمام جمالیاتی الفاظ کو معانی سمیت اپنے دل میں محفوظ کرنے کی رسم نبھاتے چلے آتے ہیں...... اور وقت پڑنے پر اِن پرانے لفظوں اور جذبوں کے رنگ و آہنگ کو اپنے خونِ جگر سے نکھارتے رہتے ہیں۔

طاقت پر یقین رکھنے والا عجز و انکسار کے مفہوم سے ناآشنا ہے۔ اس لیے وہ عجز کو کمزوری سمجھتا ہے اور انکساری کو سادہ لوحی سے تعبیر کرتا ہے۔ وہ غرور کو طاقت کا منطقی نتیجہ سمجھتا ہے۔ یہ صرف محبت ہے جس پر عجز و انکسار کا مفہوم منکشف ہوتا ہے۔ طاقت عجز کا بوجھ نہیں اُٹھا سکتی...... کہ جھکنے سے قاصر ہے۔

عجز...... عافیت ہے اور غرور...... عفونت!! عجز...... آزادی ہے...... شہنشاہی ہے...... اور غرور ایک قید خانہ...... اپنے وجودی صفات کے دائرے کا!! طبِ روحانی میں غرور ایک زہر ہے' جو اِنسانی روح کو مسموم کر دیتا ہے۔ اس زہر کا تریاق محبت ہے...... قلب و نظر کو شفایاب کر دیتی ہے۔

طاقت...... چھوٹے آدمی کا خیال نہیں رکھ سکتی' بڑائی میں مبتلا ہونے کے سبب۔ جبکہ محبت کی طاقت اپنے سے کمزور کی طرف سب سے پہلے متوجہ ہوتی ہے...... لباسِ انکسار زیبِ تن کیے ہوئے...... عجز کی پوشاک زیبِ من کیے ہوئے!!

طاقت اس وقت تک جھکنے میں نہیں آتی جب تک شکست نہ کھا جائے...... جبکہ محبت کا پہلا قدم ہی بارگاہِ تسلیم کی طرف اُٹھتا ہے۔ اس لیے طاقت کے پجاریوں کا سجدہ منافقت کے باب میں آئے گا۔ طاقت کی محبت میں مبتلا آدمی لاکھ عبادت گاہیں تعمیر کرے...... رہے گا

وہ فرعون کے نقشِ قدم پر...... طاقت کے قلعے میں محصور و نظر بند!!

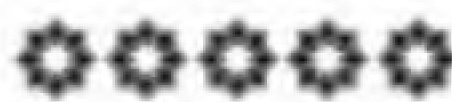
طاقت کے پجاریوں کا فکری جدِّ امجد وہی ہے جو مسلسل حالتِ انکار میں ہے...... جس نے اُس خاکی صورت کے سامنے جھکنے سے انکار کر دیا تھا جسے خالق نے اپنی صورت پر تخلیق کیا۔ طاقت پر گھمنڈ کرنے والے نے دلیل یہ دی کہ وہ آگ کی لپٹ سے پیدا ہوا ہے، اور آگ کی لپٹ خاکی طینت سے طاقت میں اعلیٰ ہے۔ اِس طرح آگ کی لپٹ سے پیدا ہونے والا غرور کی لپیٹ میں آ گیا۔ دراصل طاقت جمال کے پہلو سے نا آشنا رہتی ہے اور جلال ہی کو کمال جانتی ہے۔ طاقت کا کمال...... ایک شعلۂ نار کے سوا اور کیا ہے!

طاقت کی دلیل سے مرعوب ہونا جہالت ہے۔ طاقت کی دلیل کے کمزور ہونے کیلئے یہی کافی ہے کہ حق و باطل کے کسی معرکے میں حق کے برحق ہونے کا فیصلہ کبھی طاقت نے صادر نہیں کیا۔ درحقیقت محبت کا میزان ہی حق و باطل کا فرقان ہے۔ طاقت جغرافیے پر قبضہ کرتی ہے اور محبت تاریخ فتح کرتی چلی جاتی ہے۔ اگر طاقت کی دلیل کافی ہوتی تو نمرود، فرعون، ہامان اور ابوجہل کامیاب ٹھہرتے' لیکن کاروانِ محبت کے آگے طاقت کے سب سورما کھیت رہے...... تاریخ گواہ ہے!!

طاقت کی دلیل دنیا فتح کر سکتی ہے' دل فتح نہیں کر سکتی...... اور محبت بغیر طاقت ہی کے فتح کرتی رہتی ہے...... انجانے میں...... دل کی دنیا...... دنیا کا دل!!

محبت کے مقابلے میں اگر طاقت وقتی طور پر غالب آ جائے تو بھی زمانے کی نظر میں مغلوب ہے...... کہ مغضوب ہے...... اور بالآخر معتوب ہے۔ محبت مصلوب بھی ہو جائے تو مقبول ہے...... بلکہ منصور ہے۔

محبت میدانِ کربلا میں بھی سُرخرو ہے...... ہمیشہ ہمیشہ کیلئے!!



تعلیم، علم اور عمل

علم کا موتی ڈھونڈنے کیلئے عمل کا سفر اختیار کرنا پڑتا ہے...... اور علم و عمل کے اِس سفر میں خیال اور اخلاص زادِ راہ ہیں۔ صرف خیال کو اِذن حاصل ہے کہ وہ علم کی جانب عازمِ سفر ہو...... اور صرف اخلاص کو اجازت ہے کہ وہ علم کے دروازے پر دستک دے۔

وقت اور مادّے کی سنگلاخ وادیٔ اسباب و عِلل میں علم کی آبجو تک پہنچنا ...... جوئے شیر لانا ہے۔ جامِ علم کی طرف اُٹھنے والا ہاتھ ...... لازم ہے کہ عمل کا پیمانہ ہاتھ سے نہ چھوڑے۔ علم کے شیریں چشمے تک رسائی اسی کا حصہ ہے جو اپنے ہاتھ سے تیشۂ عمل نہ چھوڑے ...... یہاں تک کہ کھوج ڈالے چشمۂ علم ...... سرچشمۂ حیات ...... حیاتِ ابدی!

ہر علم ایک عمل کا تقاضا کرتا ہے ...... اگر یہ تقاضا پورا کردیا جائے تو ٹھہر جاتا ہے ...... بصورتِ دیگر ایک وہم بن کر قصۂ پارینہ بن جاتا ہے ...... دلوں کی بجائے کتابوں میں جمع ہوتا رہتا ہے ...... اور یادوں کی بجائے یادداشتوں میں جگہ پاتا ہے ...... یعنی محو ہو جاتا ہے۔ علم اور عمل کے درمیان فرق کا نام نفاق ہے ...... یہ فرق دانستہ رکھا جائے تو بغاوت ہے ...... اگر نادانستہ ہو رہے تو مہلت ...... اور مہلت بھی صرف مہلتِ عمل!!

علم پر عمل کرنے سے علم وجود کا حصہ بن کر اَمر ہو جاتا ہے۔ علم اَمر سے ہے ...... اور اَمر تسلیم سے۔ مان لینا ...... عمل ترک کرنا نہیں، بلکہ عمل پیرا ہونا ہے ...... یعنی تسلیم محض قول نہیں ...... عمل ہے ...... اور یہ عمل ...... ظاہر اور باطن دونوں جہاں میں نافذ العمل ہے۔

باطن میں اس عمل کا نام خود احتسابی ہے...... اور ظاہر میں عملِ صالح۔ عمل صالح ...... صلح کُن ہوتا ہے...... صلح جُو ہوتا ہے۔ یہ عمل ظاہر میں امن کہلائے گا...... اور باطن میں سکون!!

عمل کے بغیر علم ...... طاق میں لگی ہوئی ایک بند کتاب ہے...... اور علم کے بغیر عمل ...... فساد فی الارض ہے۔ علم ...... خودشناسی اور پھر خداشناسی کی منزلوں کی ہم راہی کرتا ہے۔ خودشناسا انسان دوسروں کے لیے منفعت بخش نہ بھی ہو سکے تو کم اَز کم بے ضرر ضرور ہو جاتا ہے...... اس کے برعکس نورِ علم سے محروم شخص ظلمتِ نفس کا شکار ہو جاتا ہے...... وہ اپنے ساتھ بھی ظلم کرتا ہے...... اور دوسروں کے حق میں بھی ظالم ٹھہرتا ہے۔ ظلم ...... عدل کے مقابلے میں ہے۔ عدل ہر شے کو اس کے درست مقام پر رکھنے کا نام ہے۔ کائنات میں سب سے انمول شے انسان ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ کائنات کی قدر و قیمت انسان کے دم قدم سے ہے۔ انمول شے اسے کہتے ہیں جس کی قدر تو ہو...... مگر قیمت نہ ہو۔ فکری سطح پر سب سے بڑا ظلم یہ ہے کہ اشیاء کو انسانوں پر ترجیح دی جائے اور یوں کائنات کے انمول شاہکار کی قیمت لگانے کی کوشش کی جائے۔ دراصل انسان جب خود سے غافل ہوتا ہے تو اپنے اِردگرد انسانوں سے بھی غافل ہو جاتا ہے۔ جب انسان کائنات میں اپنے نام اور مقام کی پہچان سے خود کو محروم کر لیتا ہے تو یہ بھی خود پر ایک ظلم ہے۔ گویا خودشناسی عین عدل ہے...... اور خود سے غافل ہونا ظلم ہے۔

عمل اور فعل میں فرق ہے۔ ہر ذی روح کسی نہ کسی فعل میں مشغول ہے۔ فعل کے محرکات ظاہر ہیں...... کسی ظاہری فائدے کا حصول اور کسی ظاہری نقصان سے بچاؤ۔ عمل کو فعل سے ممیّز کرنے والی ''شے'' اس کا محرک ہے۔ عمل نیت کے ساتھ مشروط ہے...... اس لیے عمل کے محرکات باطن میں پوشیدہ ہوتے ہیں۔ جائے عمل پر کھڑا ہونے کیلئے نیت کا باوضو ہونا شرط ہے۔ نیک نیتی سے کیا گیا عمل ...... بظاہر غلط ہو' تو بھی علم سیکھنے کا سبب ہو جاتا ہے۔

بد نیتی پر مبنی عمل' جہالت پر مبنی ہوتا ہے۔ عمل ...... علم کا راستہ کھولتا ہے...... اور نیت عمل کو سمت عطا کرتی ہے ۔ اگر عمل کی سمت ...... جانبِ رضائے الٰہی ہو' تو انسان سود و زیاں کے اندیشوں سے نکل جاتا ہے۔ عمل کا جانبِ رضائے الٰہی ہونا...... منجانبِ منشائے الٰہی ہوتا ہے ...... اسی کا نام توفیقِ الٰہی ہے۔ اندیشہ ہائے سود وزیاں سے نکل کر جو عمل کیا جائے وہی عمل بااخلاص ہے۔ گویا اخلاص سے کیا گیا عمل ہی عمل کہلائے گا۔ ریاکاری پر مبنی ''عمل'' محض ایک فعل ہے...... مفادات کے پیشِ نظر کیا گیا...... سود وزیاں کو مدّ نظر رکھ کر کیا گیا۔

ہر عمل درحقیقت ایک کوشش ہوتی ہے...... اور کوشش قبول نہیں ہوتی' بلکہ کوشش کے پسِ پشت ایک نیت ہے جو بارگاہِ قبولیت میں باریاب ہو جاتی ہے۔ کوشش کی شاہراہ...... بالآخر ایک دوراہے پر تمام ہوتی ہے...... ایک راستہ تسلیم کی طرف جاتا ہے ...... دوسرا بغاوت کی جانب! تسلیم کا راستہ سلامتی کی طرف لے کر جاتا ہے...... اور بغاوت کا راستہ شور اور شورش کی طرف!! تسلیم کا ایک درجہ قوانینِ فطرت کا احترام ہے...... اور یہ احترام ہمیں فطرت کا شعور دیتا ہے۔ خودسری اور شوریدہ سری میں شور اور شورش کے سوا کچھ نہیں۔ قانونِ فطرت سے بغاوت کرنے والا انسان اپنے اندر ہی اندر ایک شکست سے دوچار ہو جاتا ہے...... اور جسے گھر میں مات ہو جائے' وہ باہر کی دنیا میں کامیابی کے جھنڈے گاڑتا پھرے؟ ...... آخر کس کام کے؟؟ کامیابی کی ناکامی تو یہ ہے کہ انسان اپنی کامیابی سے خود لطف اندوز نہ ہو سکے اور باہر اُس کی کامیابی کی خبریں شائع ہوتی رہیں۔

تعلیم ہمیں قوانینِ فطرت سکھاتی ہے...... اور تہذیب قوانینِ فطرت کا احترام۔ جب تک تعلیم اور تہذیب کا بندھن نہیں ہوتا...... تعلیم یافتہ لوگ بھی فکری انتشار کا شکار رہتے ہیں۔ فکری انتشار وحدتِ عمل سے دور لے جاتا ہے۔ وحدتِ فکر اور وحدتِ عمل میسر نہ ہو تو وحدتِ کردار کا تصور ایک خواب رہے گا۔ تہذیب سے بیگانہ تعلیم ہمیں ایک دوسرے

سے بیگانہ کر رہی ہے۔ ماضی اپنے حال سے بیگانگی کی حالت میں ہے ...... اور حال اپنے ماضی سے بغاوت کی حالت میں !! اگر باطن کی اصلاح کا عمل ساتھ ہی ساتھ جاری نہ ہو' تو ظاہری تعلیم ...... باطنی تخریب پیدا کرسکتی ہے۔ ظاہر اور باطن میں فرق ایک فساد ہے ...... اور باطن کا فساد ظاہر ہو کر رہتا ہے ...... بحر و برّ میں !

حضرت واصف علی واصفؒ فرماتے ہیں: '' تعلیم ضرورت کا علم ہے ...... ضرورت کا علم اور چیز ہے' علم کی ضرورت کچھ اور شے ہے'' اگر ضرورت کا علم' علم کی ضرورت پیدا نہ کرے تو تعلیم' معلم اور متعلم کی تکون خطرے میں ہے۔ درحقیقت ہر شعبے کی تعلیم' درپردہ معاشیات کی تعلیم بن کر رہ گئی ہے۔ معیشت کو سونا کرنے کے گھن چکر میں ہم معاشرت کی چاندنی بچھانا بھول گئے ہیں۔ مضبوط معیشت کمزور معاشرت کی علامت بن کر رہ گئی ہے۔ تعلیم وہ ہے جو علم کے راستے کی طرف لے کر جائے اور علم کو جنت کے راستوں کا نشان کہا گیا ہے۔ جنت' ایک جائے اَمن ہے۔ اَز روئے قرآن جنت میں ہر طرف سلام سلام کی صدائیں سنائی دیں گی۔ سلام کا مطلب سکون' سلامتی اور اَمن ہے۔ طرفہ ستم ہے کہ تعلیم کے نام پر انسان کو جنگل کا قانون پڑھایا جا رہا ہے ...... حالانکہ انسان ہونے کے ناطے اِس کا حق تھا کہ اسے انسانیت کی تعلیم دی جاتی۔ تعلیمی اداروں میں مروّجہ تعلیم طالب علموں کی سماعتوں میں survival of the fittest اور cut throat competition جیسے نعرے گھول رہی ہے ...... اور یوں انسانی معاشروں میں خودغرضی اور عدم برداشت کو فروغ دے رہی ہے۔ یہ تعلیم عدم برداشت کی طرف لے جاتی ہے ...... اور عدم برداشت شدت پسندی کا پہلا سبق ہے۔ تہذیب کی عمارت کی تعمیر میں جس ستون نے سارا بوجھ اٹھایا ہوا ہے' اسے برداشت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اخلاص اور اخلاق ...... تہذیب کو ترتیب دیتے ہیں۔ خودغرضی اور عدم برداشت ...... تہذیب کو بے ترتیب کر دیتے ہیں۔ جنگل سے نکل کر

شہر آباد کرنے کیلئے انسان نے تہذیب کی عمارت صدیوں کی محنت سے اٹھائی ہے...... مگر اسے برباد کرنے کیلئے عدم برداشت کا ایک ڈائنامائٹ کافی ٹھہرتا ہے۔ تعلیمی اداروں کے سربراہوں اور تعلیمی نصاب ساز اداروں کا فرض ہے کہ وہ اِس امر کا خیال رکھیں کہ تعلیم صرف مشینیں ہی نہ بنائے ...... انسان سازی بھی کرے۔ تعلیم جب تک انسان سازی کا عمل نہیں کرے گی' انسانی معاشرے امن' سکون اور سلامتی سے میلوں دُور خانہ بدوشوں کی طرح ''آباد'' اور برباد ہوتے رہیں گے۔

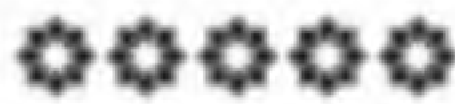
تعلیم کے نصاب میں اگر تہذیب اور تسلیم کے باب شامل نہیں' تو سمجھ لینا چاہیے کہ ہم آنے والی نسلوں کو تعلیم کے نام پر بدعلمی کا سبق دے رہے ہیں۔ بدعلمی کا سبق سیکھ کر آنے والے ...... سبق سکھانا شروع کر دیتے ہیں۔ بے علمی ...... غفلت ہے۔ بدعلمی ...... جہالت ہے۔ غفلت کو مہلت ہے ...... اور جہالت کو سزا ...... کہ جہالت نور کے مقابلے میں کھڑی ہو جاتی ہے ...... سرشتِ ابوجہل بن کر!!

اگر انسان تعلیم کی مدد سے تعمیر اور تنظیم کے مراحل سے نہیں گزرتا' تو علم کی راہ نہ پائے گا۔ تنظیم سے مراد تنظیمِ اُفکار ہے ...... اور تعمیر سے مراد تعمیرِ کردار!! تعلیم ...... دراصل کردار سازی کا عمل ہے۔ کردار سازی کا عمل ہی حیوان ناطق کو دائرۂ آدمیت میں داخل کرتا ہے۔ کردار سازی کے بغیر تعلیمی ڈگری ہاتھ میں دینا گویا بندر کے ہاتھ میں بندوق دینا ہے۔

کردار سازی تہذیبِ نفس ہے ...... اور تہذیبِ نفس کا روحانی نام تزکیہ ہے۔ تزکیۂ نفس اخلاقِ رذیلہ سے نکل کر اخلاقِ حسنہ تک پہنچنے کا عمل ہے۔ تزکیۂ نفس ...... خود کو اخلاص اور اخلاق سے متصف کرنے کا نام ہے۔ اصل تعلیم وہ ہے جس کی اصل تزکیہ ہے۔ تزکیہ نیکی کا ذوق پیدا کرنے کا عمل ہے۔ تزکیہ ...... اصلاح نفس ہے ...... اور اصلاح لینے

کیلئے پھر تسلیم کرنا پڑتا ہے ...... دانا انسانوں کو اپنے سے بہتر ...... کچھ انسانوں کو اپنے سے دانا !! تاریخِ انسانی گواہ ہے کہ انبیاء کرام سب سے دانا و بینا تھے ...... انبیاء کے وارثین علمائے ربانیین ہیں ۔ اِنہیں صوفیاء اور اصفیاء کہا جاتا ہے۔ تسلیم اور یقین کی اقامت گاہیں ساتھ ساتھ ہیں ...... یقین ایک درجۂ علم ہے ...... اور شک ایک شعبۂ جہالت ہے۔

تعلیم ...... معلم دیتا ہے' کمپیئر یا کمپیوٹر نہیں ...... اس لئے معلم کیلئے باکردار ہونا اتنا ہی ضروری ہے جتنا ڈگری یافتہ ہونا ۔ ایک باکردار معلم ہی کردار سازی کرسکتا ہے۔ تعلیم کا تعلق معلم سے ہے ...... اور معلم جب تک معلمِ اخلاق ﷺ سے وابستہ نہ ہو' اپنے متعلم کو اخلاقِ حسنہ سے متصف نہ کرسکے گا۔ علم کے باب میں جو طالبِ علم ہوتا ہے ...... وہ باب العلم تک پہنچتا ہے اور بابُ العلمؑ تک پہنچنے والا ...... شہرِ علم ﷺ تک رسائی پالیتا ہے۔ معلمِ اعلیٰ تک رسائی ہی علم تک رسائی ہے ...... اور علم ہی علیؑ ہے !!



حقائق جمع کرنے کا خوگر ...... حقیقت تک نہیں پہنچتا۔
تعلیمی حقائق اور ہیں ...... اور حقائق کی تعلیم کچھ اور ...... !!
(دلِ ہر قطرہ)

کام، دام اور دوام

کام میں اخلاص یہ ہے کہ اسے اپنی ذات کا حصہ بنالیا جائے ...... مگر اپنی اَنا کا نہیں۔ کام میں اِخلاص کا تقاضا یہ ہے کہ جب سونپ دیا جائے تو اِسے قبول کرنے میں متامّل نہ ہو...... جب واپس لے لیا جائے تو مزاحم نہ ہو...... اور جب اپنے سے بہتر انسان میسّر آجائے تو اُس کے سپرد کردینے میں متردّد نہ ہو۔

جس کام میں اِخلاص نہ ہوگا' اُسے دوام حاصل نہ ہوگا...... کہ دوام صرف اِخلاص کا نصیبہ ہے۔ مفادات کے زیرِ اثر کام کرنے والا' کوئی کام مدام نہ کر سکے گا...... کہ مفادات کو عارضی ہونے کا عارضہ لاحق ہوتا ہے...... وہ تغیر پذیر ہوتے ہیں...... اس لیے ترجیحات کی دنیا میں ایک دوسرے کیلئے جگہ خالی کرتے رہتے ہیں۔ مفادات کی دنیا کھلونوں کی دنیا ہے...... اور کھلونوں سے کھیلنے والا شعوری اعتبار سے ایک طفلِ ناداں نہ بھی ہو تو طفلِ مکتب ضرور ہے۔

مخلص ہونا نہایت آسان ہے' اِس میں صرف اپنا مفاد ترک کرنا پڑتا ہے۔ جو اپنے مفاد کی بُو بُو میں رہتا ہے' وہ اِخلاص کی خوشبو کو نہیں پہنچ سکتا...... نہیں پہچان سکتا۔

کام...... ایک واقعہ ہے...... اُس کے اَمر سے وقوع پذیر ہوتا ہے۔ جب تک اپنے مزاج اور مفاد سے نجات حاصل نہ کر لی جائے' کوئی واقعہ اپنے صحیح تناظر میں نظر نہیں آتا...... کہ مزاج کسی واقعے کا پس منظر بدل دیتا ہے...... اور مفاد پیشِ نظر کو دھندلا دیتا

ہے۔ جو اپنے نفس کا غلام ہوتا ہے وہ کوئی کام نہیں کر سکتا...... کیونکہ اسے صرف اپنے نفس کو راضی کرنے سے کام ہوتا ہے۔ بندۂ نفس، خود غرض ہوتا ہے...... اور خود غرض، اپنی غرض کا قیدی ہوتا ہے۔ صرف بے غرض، بندۂ آزاد ہوتا ہے...... اور کام وہی کر سکتا ہے، جو آزاد ہو۔ اپنی اَنا کی قید و بند میں گرفتار شخص جب کوئی دینی کام کرتا ہے تو وہ اصل سے فرق کے ساتھ کرتا ہے اور یہی فرق جب خفی سے جلی ہو جاتا ہے تو چلتے چلتے ایک فرقہ بن جاتا ہے۔ اَنا پرست مفاد پرست ہوتا ہے اور مفاد پرست جمعیت میں تفریق کا باعث بنتا ہے۔ اَنا کی نفی کا حاصل...... وحدت ہے...... وحدتِ افکار اور وحدتِ کردار۔ تمام رُوحانی کام درحقیقت مجتمع کرنے کے کام ہوتے ہیں...... ظاہری طور پر بھی اور باطنی طریق پر بھی! ظاہری طور پر مجتمع کرنا اور رکھنا اِخلاق کے بل پر ممکن ہوتا ہے اور باطنی طریقے پر جمعیت میں رہنا اور رکھنا اِخلاص کی کرامت ہوا کرتی ہے۔

کام اگر دام کیلئے کیا جائے تو یہ بہت کم مول کا سودا ہے...... کہ دام کا بندہ تو بندۂ بے دام ہوتا ہے۔ وہ کام کیسے دوام پکڑ سکتا ہے جس کے دام پکڑ لیے جائیں۔ بات واضح ہے...... کہ دام گنتی کے ہوتے ہیں اور گنتی میں آنے والی ہر شئے ختم ہو جاتی ہے۔ کام کا مدعا اگر نام کا حصول ہے تو یہ دام پکڑنے سے بہر طور بہتر ہے مگر اس سے انسان ایک اور دام میں آ جاتا ہے...... یہ کام کا وہ مول ہے جو اِسے انمول نہیں رہنے دیتا۔ انمول کام وہ ہوتا ہے جس کا مقصد...... کام عطا کرنے والی ذات کی رضا کا حصول ہو۔ اپنے ربّ کی رضا حاصل کرنے کی تمنا دل میں پالنے کیلئے بھی کم سے کم شرط اخلاص ہے...... اور اخلاص اپنے مزاج اور مفاد کی نفی کا نام ہے۔

انسان اپنے لیے خود سے کوئی کام منتخب نہیں کرتا...... کہ یہ خودساختہ کام ہوتا ہے...... کام لینے والا اپنے بندوں میں سے خود ہی کسی بندے کا انتخاب کر لیتا ہے۔ منتخب

وہ ہوتا ہے جو کسی کام کیلئے منتخب ہوتا ہے...... اور جسے کسی کام کیلئے منتخب کرلیا جائے اُسے اُس کام کا شعور بھی ودیعت کر دیا جاتا ہے۔ ہر کام کا ایک مدعا ہوتا ہے...... اگر مدعا تک حصول نہ ہوتو کچھ حاصل وصول نہیں ہوتا...... ممکن ہے کہ کام ودیعت کرنے کا مقصد ہی دائرۂ شعور کو وسعت سے ہمکنار کرنا ہو۔

کام کرنے سے کام کی نئی جہتیں کھلتی ہیں۔ اُمید کی...... امکانات کی...... تخلیق کی! کام ترک کرنے سے صرف مایوسی کی طرف راستہ نکلتا ہے...... اور مایوسی کا راستہ کسی طرف بھی نہیں نکلتا۔ کام ترک کرنے والا ایک بندگلی میں آ نکلتا ہے۔ جو شخص کام سے منہ موڑتا ہے' کام اُس سے منہ موڑ لیتا ہے۔ جو شخص کام نہیں کرتا' وہ صرف تنقید کرتا ہے'' فتوے'' صادر کرتا ہے...... اور'' فتویٰ'' صادر کرنے کیلئے جس زعم کی ضرورت ہوتی ہے' اُس کی حدیں غرور سے جاملتی ہیں...... یعنی'' میں...... سب سے اعلیٰ''...... اور'' میں...... سب سے بہتر'' جانتا ہوں۔

کوئی کام شروع کرنے سے پہلے ایک کام کرنا پڑتا ہے...... اور وہ ہے' اپنے ذاتی کاموں کی فہرست کو ہمیشہ کیلئے لپیٹ کر رکھ دینا۔ کسی کام کیلئے ہمارے پاس وقت ہے یا نہیں...... اِس کا تعلق وقت کے کم ہونے سے کم...... اور ہماری ترجیحات کی فہرست میں اس کام کے سرِ فہرست ہونے سے زیادہ ہوتا ہے۔ جو کام پہلی ترجیح ہوتا ہے اس کیلئے وقت' ہر وقت موجود ہوتا ہے کیونکہ وہ کام نقطۂ شعور میں ہمہ وقت جگمگا تا رہتا ہے...... نکتہ یہ ہے کہ ترجیحات میں سرِ فہرست کام کیلئے کبھی وقت نکالنا نہیں پڑتا...... بلکہ خود نکلنا پڑتا ہے۔

یہ دنیا دار العمل ہے۔ ہر عمل کا ایک دائرہ ہے...... اور ہر دائرۂ عمل پر وقت کا ایک دائرہ محیط ہے۔ جس طرح کوئی عمر اپنی مہلتِ عمر سے باہر نہیں نکل سکتی' اس طرح کوئی عمل اپنے دائرۂ وقت سے باہر نہیں نکل سکتا ہے۔ جب اِنسان اپنے ذمے آنے والا ہر کام

بروقت سرانجام دینے لگتا ہے تو وقت کی تمام تر قوتیں اُس کی معاونت کرنے لگتی ہیں۔ وقت کا پابند ہونا دراصل وقت کا احترام کرنا ہے۔ جو وقت کا احترام کرتا ہے' وقت اُسے محترم جانتا ہے...... اسے اپنے راز سے آشنا کر دیتا ہے...... اس کی ساعتیں نوائے سروش سے شناسا ہونے لگتی ہیں۔ کائنات میں سب سے بڑا راز وقت ہے۔ عروسِ حقیقت کے چہرے پر جو پردہ ہے' اسے وقت کہتے ہیں۔ وقت' حجابِ حقیقت بھی ہے...... اور کاشفِ حقیقت بھی۔ وقت ہی محجوب کرتا ہے اور وقت ہی مکشوف۔ جو اپنے کام کو اپنے وقت پر سرانجام دیتا ہے' اُس کیلئے وقت کا پردہ اُٹھنے لگتا ہے۔ جب وقت کا پردہ اُٹھتا ہے تو آغاز اپنے انجام سے واصل ہونے لگتا ہے۔ اپنے تفویض شدہ کام کو معیّن وقت پر کرنے والے کا وقت خود معین ہو جاتا ہے...... بصورتِ دیگر وقت ایک قیامت بن کر ٹوٹتا اور سب حجاب پھاڑ ڈالتا ہے ...... بھرم ٹوٹ جاتے ہیں...... کرم پھوٹ جاتے ہیں۔

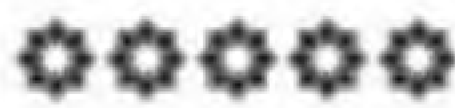
وقت کے حصار سے نکلنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ خود کو محصور کر لیا جائے...... نظم و ضبط کے دائرے میں۔ نظم و ضبط خود کو کسی ضابطے میں مقید کرنا ہے...... اور اس کا انعام وقت کے جبر سے رہائی ہے۔ جسے نظم و ضبط کا یارا نہ ہو وہ ظاہری کام کیلئے بھی موزوں نہیں ٹھہرتا...... اور باطنی کام کیلئے معتبر ٹھہرنا تو پھر ایک کارِ دگر ہے۔ قاعدہ یہ ہے کہ ہوا کی زَد میں آنے والا وقت کے ہاتھوں پِٹ جاتا ہے۔ کلیہ یہ ہے کہ لذّت کام و دہن میں گرفتار آدمی روحانی کام سرانجام دینے سے معذور سمجھا جاتا ہے۔

کامل اِخلاص' مکمل اِستعداد اور اکمل استقامت کے ساتھ اپنے کام کی بجا آوری انسان کو یہ استحقاق دیتی ہے کہ اُسے رازہائے فطرت سے آشنا کر دیا جائے...... یہ اصول انفرادی ہی نہیں' اجتماعی بھی ہے...... تاریخ عالم میں اقوامِ عالم اِس اصول کا مظاہرہ کرتی چلی آ رہی ہیں۔ خود کو منظم کرنے والی قوم غیر منظم قوموں پر حکمرانی کا حق حاصل کر لیتی ہیں۔

اخلاص، نیت کا عمل ہے...... استعداد، وسائل پر عبور ہے...... اور استقامت، نظم وضبط کا پہرہ ہے۔

کام کا سونپے جانا ایک اعزاز وتکریم ہے ...... نمائندگی ہے ...... نیابت ہے ...... حقیقی خلافت ہے...... کہ فاعل حقیقی کا ہر کام اُسی کے ذریعے آغاز اور پھر انجام پاتا ہے جسے خلیفۃ اللہ کہتے ہیں۔ سنتِ الٰہیہ یہی ہے کہ وہ اپنے سب کام اپنے **خلیفة فی الارض** کے توسط سے کرتا ہے...... اور **سنت اللّٰه** کبھی تبدیل نہیں ہوتی۔ افعالِ الٰہی کا مرجع ومنبع خلیفۃ اللہ ہے۔ خلیفۃ اللہ وہ نقطۂ وسط ہے جس کے توسط سے منشائے ایزدی کا ظہور ہوتا ہے...... اور جس کے توسل سے مخلوق اپنے ربّ کے حضور درخواست گزار ہوتی ہے۔

کام کی تقسیم شوق اور شعور کے تناسب سے ہے۔ ہر کام کا ایک مقصد ہوتا ہے...... جو شخص جس مقصد کے ساتھ جس قدر زیادہ شعوری تمسک رکھتا ہے، اسے اتنا بڑا کام سونپ دیا جاتا ہے۔ آدمؑ کا نائب ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ آدمؑ شعوری طور پر مقصدِ تخلیقِ کائنات سے آگاہ تھے۔ یہی وہ شعوری آگہی ہے جس کا شکر اُسے اُس کوئے ملامت تک لے آتا ہے، جہاں وہ اپنے گلے میں بصد تسلیم ورضا ''**ظلوماً جهولا**'' کا طوق پہنتا ہے ...... اور آج تک ''بصد سامانِ رسوائی سرِ بازار می رقصم'' کا نغمۂ جانفزا الاپتا جا رہا ہے۔ جو ملامت کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا...... وہ کسی کام کا بوجھ بھی نہیں اُٹھا سکتا۔ انسان کو بے لوث کام کرنے کی قدرت محبت کے ذریعے حاصل ہوتی ہے...... اور محبت کو یہ قدرت حاصل ہے کہ ملامت کا بوجھ اٹھا سکے !!



تعریف، تنقید اور توصیف

کوئی انسان اس وقت تک کسی کی تعریف نہیں کر سکتا جب تک وہ خود بھی اس تعریف کا اہل نہ ہو جائے۔ کسی کی عظمت کا معترف ہونے والا خود بھی ایک عظمت کا حامل ہوتا ہے...... اور کسی انسان کی عظمت کا منکر دراصل خود کسی تعریف کے قابل نہیں ہوتا۔ جو کسی انسان کا معترف نہیں ہوتا' وہ خود معتبر نہیں ہوتا۔

بات تعریف سننے کی نہیں...... تعریف کرنے کی ہو رہی ہے۔ تعریف کرنے کا مدعا اگر ذاتی مفاد ہے تو یہ خوشامد ہے۔ وہ تعریف جس میں علم اور محبت شامل حال نہ ہو' جھوٹ کے زمرے میں آتی ہے...... اور جھوٹی تعریف ہی خوشامد کہلاتی ہے۔ اگر تعریف کا تعلق مخاطب کی اصلاحِ احوال سے ہے' تو یہ اَز خود قابلِ تعریف ہے۔ ہر اصلاح کرنے والے کو یاد رکھنا چاہیے کہ اصلاحِ احوال کی ابتدا تعریف سے ہوتی ہے۔ ایک بخیل شخص کسی کی اصلاح کر سکتا ہے' نہ تعریف۔ کسی کی تعریف کرنے کیلئے حوصلہ چاہیے...... اور یہ حوصلہ کسی مفاد پرست اور انا پرست میں نہیں ہوتا۔ ایک حوصلہ مند ہی دوسروں کو حوصلہ عطا کر سکتا ہے۔ تعریف حوصلہ افزائی کا سبب بنتی ہے اور تنقید بالعموم حوصلہ شکن ہوتی ہے۔ تنقید...... تنقیص ہے...... ''تُو'' کے نقص بیان کرتی ہے۔ تعریف...... ستائش ہے...... صفت بیان کرتی ہے...... اور ''تُو'' کو ''ہم'' بنانے کی راہ ہموار کرتی ہے۔ نکتہ یہ ہے کہ نکتہ چیں...... نکتہ داں نہیں ہو سکتا۔

تنقید...... تعریف کا اُلٹ ہے۔ اس لیے تنقید سے کوئی کام سیدھا نہیں ہوتا۔ تنقید

اصلاح نہیں کرتی ...... صرف محبت اصلاح کرتی ہے۔ محبت ...... ایک ہمہ وقت اور ہمہ صفت کام ہے...... اس لیے محبت کی نظر تنقید کی فرصت ہی نہیں پاتی ...... جبکہ تنقیدی سوچ میں مبتلا ذہن' محبت کی راہ نہیں پاتا۔ تعمیری تنقید نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ تعمیر کے نام پر کی جانے والی تنقید بھی تعمیری نہیں ہوتی کہ تعمیر سے بہت پہلے یہ تخریب کا عمل کر چکی ہوتی ہے۔ تنقید ان معانی میں تخریب کاری ہے کہ یہ تعلق پر ایک ضربِ کاری لگاتی ہے...... جبکہ اصلاح کیلئے سب سے پہلی شرط تعلق کا قائم کرنا اور پھر قائم رکھنا ہے۔

تعمیرِ اخلاق قوم کی ہو یا فرد کی ...... محبت اور خدمت سے بڑھ کر کوئی چیز کارگر نہیں ہوتی۔ اصلاحِ معاشرہ کی مہم دراصل محبت اور خدمت کی صورت میں مکمل ہوگی ...... بصورتِ دیگر جبر کے تازیانے صرف باہر سڑکوں پر ڈسپلن قائم کرتے ہیں اور باطن کے آنگن میں وہی وحشی جذبے بے لگام دوڑتے پھرتے ہیں۔ جو خدمت کرنا جانتا ہے' وہ تنقید کرنا نہیں جانتا ...... اور جو خدمت نہیں کرنا چاہتا وہ صرف تنقید کرتا ہے۔

تنقید کا عمل ماحول کو خوبصورت نہیں رہنے دیتا...... جبکہ اصلاح احوال کیلئے اندر اور باہر کے ماحول کا خوب ہونا ضروری ہے۔ محبت خود میں خود کو توڑتی رہتی ہے...... لیکن باہر سب کو جوڑ دیتی ہے۔ اصلاح باہم جڑنے اور جوڑنے کا عمل ہے۔ بگاڑ قطعِ تعلق سے پیدا ہوتا ہے۔ تنقید کا عمل بسا اوقات محض خودنمائی کا ایک اشتہار ہوتا ہے۔

تنقید...... ایک لاتعلقی کا اظہار بھی ہے۔ تنقید کرنے والا تنقید کے ساتھ ساتھ دوسروں کو حقیر بھی سمجھ رہا ہوتا ہے...... اور دوسروں کو حقیر سمجھنے والا' لازم ہے کہ خود کو برتر سمجھے۔ اسی رویّے کا نام غرور ہے۔ ایک مغرور شخص دوسروں پر تنقید کیے بغیر رہ نہیں سکتا۔ وہ اپنی برتری کی سند دوسروں کی تحقیر میں ڈھونڈتا ہے۔ کسی کی غلطی پر اسے تنقید کا نشانہ بنانا آسان ہے...... یہ عام کام ہے...... بلکہ عامیانہ پن ہے۔ محبت سے اپنا لینا بڑا کام ہے......

بڑا پن ہے۔ عام لوگ عام کام کرتے ہیں ...... بڑے لوگ بڑا کام!!

انسان صرف جسم اور روح کا مُرکّب ہی نہیں ...... بلکہ ایک مزاج اور کیفیت کا مُرکّب بھی ہے...... یہ اپنی پشت پر کسی کو ہاتھ نہیں رکھنے دیتا...... سوائے اُس سائیس کے جو تعریف وتوصیف کی سائنس جانتا ہو۔

کسی انسان سے محبت کرنے کیلئے یہی ایک جواز کافی ہے کہ وہ صورتِ آدم ہے ...... اور آدم کو خالق نے اپنی صورت پر خلق کیا ہے۔ توہینِ آدم دراصل توہینِ خالقِ آدم ہے۔ خالق نے ہر انسان کو ایک ایسی صفت سے ممتاز کیا ہے کہ وہ کلّ یوم هو فی شان کی تفسیر کا مظہر بن سکے۔ یہ انسان کی خود سے غفلت اور اپنے گردوپیش سے تغافل ہے ...... جو اُس صفت کو ظہور پذیر نہیں ہونے دیتی۔ کسی حاملِ صفت کی توصیف سے گریز کرنا از خود توہینِ موصوف ہے۔ جس طرح ماں کی عظمت کیلئے اس کا ماں ہونا کافی ہے' اس طرح کسی انسان کی تکریم کرنے کیلئے اس کا انسان ہونا ہی کافی ہے۔ انسان کی کوکھ میں عظمت کے لاتعداد جوہر ہیں جو بیجوں کی طرح اس کی زمینِ وجود میں موجود رہتے ہیں ...... اور وہ کسی وقت میں بارآور ہو سکتے ہیں۔ انہیں سینچنے کیلئے خارج میں جن عوامل کی ضرورت ہوتی ہے وہ وقت' تربیت اور توصیف ہیں۔

جب سے انسان توصیفِ انسان سے دُور ہوا ہے...... وصفِ انسانیت سے دُور ہو گیا ہے۔ توصیفِ انسان ...... انسان کو سراہنے کا عمل ہے۔ یہ انسان میں خوداعتمادی بخشتا ہے۔ انسان میں موجود انسانیت کے کسی بھی شرف کو سراہا جائے تو وہ شرف اپنی تکمیل کو پہنچتا ہے ...... سراہنے والے میں بھی اور سراہے جانے والے میں بھی! گویا انسان میں شرفِ انسانیت اجاگر کرنے کا ایک کارگر نسخہ یہ ہے کہ اس کی تکریم کی جائے ...... اسے چاہا جائے ...... اور پھر سراہا جائے۔ انفرادی طور پر کسی انسان کیلئے برائی کی سزا تجویز نہ کرنی

چاہیے ...... صرف اس کے اندر بھلائی کو سراہتے جاؤ ...... برائی وہ خود ہی ترک کر دے گا۔ اچھی بات ایک اچھے انسان ہی کو اچھی نظر آتی ہے۔

ایک فنکار اپنا فن پارہ اُسی کے سامنے رکھتا ہے جو اس کی تعریف کرنے کی اہلیت رکھتا ہے۔ کسی فن پارے کی تعریف دراصل فن کار کی تعریف ہے۔ ایک تخلیق کار جب تخلیق کرتا ہے تو وہ اپنے سینۂ تخیّل میں مخفی تصویر کو پردۂ شہود پر اُتارتا ہے۔ اُدھر تصویر کا مشاہدہ کرنے والا جب کمالِ اخلاص سے تعریف کرتا ہے تو وہ مصوّر کے دل میں اُتر رہا ہوتا ہے ...... اور یہاں دوئی وحدت میں ڈھلنے لگتی ہے۔

یہ کائنات بھی ایک فن پارہ ہے ...... ہر روز نئے رنگوں سے آراستہ ...... اور نیرنگ زاویوں سے پیراستہ ہونے والا ایک شہ پارہ ...... اِس کا مصور ''المصوّر'' ہے ...... وہ ایسا خالق ہے کہ خلّاق بھی ہے ...... وہ ایسا عالم ہے کہ علّام بھی ہے ...... وہ جانتا ہے ...... اور سب جاننے والوں کو جانتا ہے ...... وہ جانتا ہے کہ کون اُس کی تعریف کرسکتا ہے۔ اِس لیے اُس نے اپنے پیغمبر اور کتابیں صرف انسانوں کی دنیا میں اُتاریں۔ اس نے انسان ہی کو وہ آنکھ عطا کی ہے جو کائنات کا عین اسی طرح مشاہدہ کرسکتی ہے جس طرح وہ بنائی گئی ...... بے شک اس نے انسان کو عین اپنی صورت پر خلق کیا۔ خالقِ ارض وسماء حضرتِ انسان سے شعوری اِدراک اور اعتراف چاہتا ہے۔ شعور کی سطح پر ہی انسان خالق کی ذات اور صفات کا معترف ہوتا ہے۔

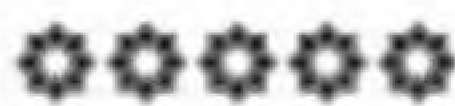
خالقِ کائنات کی تعریف کو حمد کہتے ہیں۔ حمد وہ تعریف ہے جس میں معرفت شاملِ حال ہوتی ہے۔ ذکر ...... تعریف ہے یا اعتراف!! انسان کا ذکر ...... فکر کے بغیر نامکمل ہے۔ دراصل فکر ایک خاموش ذکر ہے ...... اور ذکر ایک فکر ہے ...... با آوازِ بلند!!

''اللہ اکبر'' کہنے والا اس تعریف اور عرفان کے سبب باقی سب مخلوقات سے ممتاز

ہوجاتا ہے...... لیکن وہ اِس امتیاز کا اعلان اَز خود نہیں کرتا...... بلکہ **فاذکرونی اذکرکم** کے فیصلے کے تحت مخلوق خدا اُس کے ذکرِ خیر میں مشغول ہوجاتی ہے...... اور اُس کی معرفت لوگ خدا کا عرفان پانے لگتے ہیں۔

خالق کی یکتائی...... بندگی کی دوئی چاہتی ہے۔ کائنات اور خالقِ کائنات کے درمیان ایک بامعنی رشتہ ہے...... اور اس کی معنویت کا معین اِسمِ محمد ﷺ ہے...... کائنات اِسمِ محمد ﷺ کی تشریح ہے...... اور موجودات محوِ نعت ہیں۔ ''نعت'' کے لغوی معنی وصف بیان کرنے کے ہیں' خصوصاً جب توصیف میں مبالغے سے کام لیا جائے۔ جب نعت کی تعریف یہ ہے تو اُن ﷺ کی تعریف کا عالم کیا ہوگا' جن ﷺ کی تعریف کو نعت کہا جاتا ہے! درحقیقت اُن ﷺ کی تعریف میں کبھی غلو نہیں ہوسکتا...... کیونکہ اُن ﷺ کا تو نامِ نامی ہی ''سب سے زیادہ تعریف کیا گیا'' ہے۔ توصیفِ احمد ﷺ ...... ذاتِ احد کی معرفت کا واحد ذریعہ ہے۔ اُن ﷺ کی تعریف کی کوئی حد نہیں...... کیونکہ معرفتِ ذاتِ الٰہی کی کوئی حد نہیں۔ درحقیقت توصیفِ مصطفیٰ ﷺ ہی انسان میں اوصافِ انسانیت اُجالنے کا بہترین راستہ ہے...... کہ یہی تذکرہ' تزکیۂ نفس کرتا ہے...... اور تصفیۂ قلب بھی!! ذکرِ شۂ لولاک ﷺ ہی خاک کو رفعتِ افلاک عطا کرتا ہے...... سچ کہا واصفؒ حسنِ احمد ﷺ نے......

خاک کو رفعت ملے' بے بال و پر کو پَر ملے
نعتِ پیغمبر ﷺ سے جب عرفانِ پیغمبر ﷺ ملے



علم، حلم اور صبر

علم ...... ایک دشتِ بے اماں ہے ...... بے سرو سامانی کا عالم ہے ...... اس دشتِ بے اماں میں کسی جان کو امان اُس وقت تک نہیں ملتی جب تک وہ شہرِ علمؑ میں جا نہ بسے ...... یا اُس شہرؑ کی یاد ہی اُس میں آن نہ بسے!! دشتِ علم میں جب شہر آباد ہو جاتا ہے' تو جان کو بھی امان مل جاتی ہے اور جہان کو بھی۔ کُل جہان کا سرو سامان اور اِس کی امان ...... تہذیب، اخلاق اور تمدّن ...... سب شہرِ علمؑ کی دین ہے ...... اور شہرِ علمؑ کی اِس دین کو دِین کہتے ہیں۔

توحید کو اگر علم مان لیا جائے' تو ماننا پڑے گا کہ علم تک رسائی علم ہی کے ذریعے ممکن نہیں۔ علم ایک نور ہے ...... اور شعاعِ نور جب تک منعکس نہیں ہوتی حدِّ اِدراک میں نہیں آتی۔ آئینے میں عکس ...... برعکس نہیں ہوتا ...... بلکہ ہو بہو ہوتا ہے۔ علم تک رسائی حلم کے واسطے سے ہوتی ہے ...... اور حلم تک پہنچنے کیلئے صبر کا وسیلہ اختیار کرنا پڑتا ہے۔ علم کے میٹھے پانیوں تک پہنچنے کا راستہ حلم کی وادیوں سے گزرتا ہے۔ جو حلم کو پہنچ جاتا ہے ...... وہی علم میں بھی پہنچا ہوا ہوتا ہے۔ اگر علم جاننے کا نام ہے ...... تو علم کی قدر بھی حلم ہی جانتا ہے۔ حلم کا تمام علم ...... شہرِ علمؑ پر تمام ہے۔ حلم ...... خالق اور مخلوق کے درمیان ایک برزخ ہے۔ حلم کا سائبان میسر نہ آئے تو عالمِ خلق بے رُخ علم کی تمازت سے جھلس کر رہ جائے ...... یہ حلم کی کملی کا سایہ ہے' جس کے زیرِ سایہ زندگی نمو پاتی ہے' پروان چڑھتی ہے۔ درحقیقت علم اور حلم

آپس میں اس طرح ملے ہوئے ہیں جس طرح توحید اور رسالتؐ ...... اور حلم اور صبر ایک دوسرے کی اس طرح پہچان ہیں ...... جس طرح رسالتؐ اور ولایت۔

دین کی تعلیم اخلاق ہے...... اور اخلاق کا بہترین مظاہرہ صبر کی صورت میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ اخلاق کی تمام تفاسیر درحقیقت حلم اور صبر کی تدابیر ہیں۔ حلیم الطبع شخص بالعموم طویل عمر پاتا ہے...... اُس کی عمر کا طویل ہونا غالباً کوتاہ فکر اور کوتاہ عمل لوگوں کے ساتھ صبر کرنے کا ایک صلہ ہوتا ہے۔ عمرِ خضر پانے کیلئے سدا ہرا ابھرا رہنا ضروری ہوتا ہے ...... دوسروں کیلئے گھنی چھاؤں بننا پڑتا ہے۔ صبر کا پہلا سبق غصے اور اشتعال سے توبہ ہے۔ غصے کے عالم میں انسان خود کوئی علم سیکھ سکتا ہے، نہ کسی کو سکھا سکتا ہے۔ دراصل غصے اور علم میں وہی فرق اور فاصلہ ہے جو آگ اور پانی میں ہوتا ہے۔

صبر...... برداشت سے شروع ہوتا ہے اور احسان پر پہنچ کر ثمر بار ہوتا ہے۔ صبر کا گھونٹ تلخ ہوتا ہے مگر پھل میٹھا ہوتا ہے۔ صبر ظاہری قوت کی قربانی مانگتا ہے ...... اور اس کا صلہ باطنی قوت کی فراوانی ہے۔ ظاہری تکالیف پر منہ بند کرنے والا اپنے لیے باطنی خزانوں کے منہ بھرے ہوئے پاتا ہے۔ صبر کرنے کا پہلا مرحلہ خاموش ہونا ہے ...... اور دوسرا مرحلہ ظالم کو اپنی بددعا کی زد میں آنے سے بچانے کی تدبیر کرنا ہے۔

صبر کرنا ایک کارِ اخلاص ہے...... اور اخلاص اپنے مفاد کی نفی کا نام ہے۔ صابر ہونا، مخلص ہونا ہے۔ مفاد پرست منافق ہوتا ہے ...... اور منافق شخص صبر کے میدان سے بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔ منافق کے دل کا نفاق اس کی بے صبری سے ظاہر ہو جاتا ہے۔ اخلاق کے باب میں اگر ذاتی مفاد کا ایک لفظ بھی شامل کر دیا جائے تو یہ کتابِ اخلاص میں تحریف کے مترادف ہے۔ اخلاق - اخلاص = نفاق !! اخلاق ...... بلاغرض و غایت اور بلاتخصیص عام و خاص مخلوق سے خندہ پیشانی سے پیش آنے کا نام ہے۔ مخلوق کے ساتھ خوش اخلاق

ہونا گویا خالق کو احسان مند کرنا ہے۔ احسان بے غرض ہوتا ہے ...... بلکہ بلا غرض و غایت ہوتا ہے۔ خوش اخلاق ہونے کی شرط یہ ہے کہ اخلاق کا ہر حوالہ غیر مشروط ہو۔ خلقِ خدا سے خوش کردار اور خوش اطوار ہونے کا محرک اگر کوئی مفاد بن رہا ہے ...... تو سب کچھ بناوٹ' لگاوٹ، سب کچھ تکلف' تردّد! درحقیقت جہاں اپنے مفاد کا سایہ پڑ جاتا ہے' وہاں اخلاص کا شجرِ سایہ دار سوکھ جاتا ہے۔ دنیا دار کیلئے اخلاص محض ڈکشنری کا ایک لفظ ہے اور اہلِ محبت کیلئے اخلاص بجائے خود ایک مکمل لغت ہے ...... ایسا لغت جس میں ہر لفظ کا ترجمہ ہی نہیں' معانی بھی مل جاتے ہیں ...... تہہ در تہہ ...... سلسلہ در سلسلہ۔ صبر کے معنی پانے کیلئے بھی اخلاص کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ اخلاص ...... محبت کی عطا ہے۔ جب تک محبت کا حال طاری نہ ہو' انسان کے کردار میں اخلاص شاملِ حال نہیں ہوتا۔ دراصل سزاوارِ محبت ہی سزاوارِ صبر بھی ٹھہرتا ہے ...... ہر کس و ناکس صبر کے میدان کا شہسوار نہیں ہو سکتا۔ کمزور دل لوگ صبر کو کمزوری سمجھتے ہیں۔ حالانکہ صبر عالی ہمت اور عالی ظرف لوگوں کا cup of tea ہے۔ کم ہمت اور کم ظرف کیا جانے ...... صبر کیا ہے؟ یہ صرف صبر ہے' جو اخلاص کے ہمراہ چلنے کی سکت رکھتا ہے ...... اور علم کے دروازے پر جا دستک دیتا ہے۔ صبر کا میدان اتنا وسیع ہے کہ کئی فرات اور کئی صدیاں نگل لیتا ہے۔ صبر جب اپنی انتہا کو پہنچتا ہے تو رضا تک پہنچ جاتا ہے ...... یعنی میدانِ کربلا تک!! صبر کی انتہا ولایت کی ابتدا ہے۔

اِخلاص اور صبر کے سوا انسان کا ہر جو ہر زمین و زمن کے حصار میں ہے۔ زمانے کے خسارے سے بچنے کیلئے ایمان اور عملِ صالح کے ساتھ ساتھ حق اور صبر کی تلقین کو لازم قرار دیا گیا ہے۔ وتواصو بالحق وتواصو بالصّبر کے مصداق صبر اور حق لازم و ملزوم ہیں۔ اہلِ صبر ...... اہلِ حق ہیں۔ صبر کرنے والا اپنے اختیار سے برضا و رغبت دست کش ہونے کی قدرت رکھتا ہے۔ جب تک کوئی اپنے اختیار کے ساحل سے کنارہ کش نہ ہو ...... زندگی کے

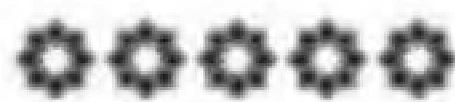
بحرِ تلاطم میں اپنے مالک کے دستِ قدرت کا مشاہدہ نہیں کرسکتا۔ صبر...... واقعاتِ عالم کو مالک کی منشاء کے مطابق ترتیب میں رکھنے اور دیکھنے کا نام ہے' صبر کرنے والا اشیائے عالم کی اصل حقیقت و ماہیت کا ادراک کرلیتا ہے۔ صبر کی آنکھ وقت اور مادے کے اندر تک دیکھ لیتی ہے۔ وقت ہی قوت ہے...... اگر ترتیب میں آجائے۔ وقت اور مادہ لازم وملزوم ہیں...... اس لیے مادے کی حقیقت جاننے کیلئے بھی وقت اور واقعات سے آزاد ہونا پڑتا ہے۔ جو وقت سے آزاد نہیں ہوتا' وہ مادے کی زد میں آجاتا ہے...... اور جو مادے کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہے' وقت کا گردشی پہیّہ اسے اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ خلاصۂ کلام یہ کہ مادے سے دست کش ہونے والا وقت کی دست برد سے آزاد ہوجاتا ہے...... سلطانِ زمانہ کی معیت میں آجاتا ہے...... اور زمین وآسمان کے حصار سے نکل جاتا ہے۔

کلام میں صبر اختیار کرنے کا ایک انعام تفکر ہے...... کیونکہ جب تک کوئی بول رہا ہے' سوچ نہیں سکتا...... اور جب کوئی سوچنا شروع کردے تو بول نہیں سکتا۔ کلام بھی ایک اِختیار ہے...... جب تک اس اختیار کو ترک نہ کیا جائے' نوائے سروش سنائی نہیں دیتی ہے۔ کلام میں صبر...... خاموشی سے شروع ہوتا ہے اور خوش خُلقی تک پہنچ جاتا ہے...... بے صبری کا اظہار بحث سے شروع ہوکر بدکلامی تک جاپہنچتا ہے۔ صبر جہاں انفرادی پختگی کو ظاہر کرتا ہے' وہاں معاشرے کی مجموعی بلوغت کا اظہار بھی ہے۔ درحقیقت صبر بالغ نظری ہے۔ جوشخص اپنے کام اور کلام میں صبر اختیار نہیں کرتا...... وہ ہر وقت ایک ہیجانی اور ہذیانی کیفیت میں ہوتا ہے۔ اس کا ہر عمل...... ردِّعمل ہوتا ہے...... اس لئے ردّی عمل ہوجاتا ہے۔ ردِّعمل تعلقات کو قطع کرنے کا باعث بن جاتا ہے۔ ردِّعمل کی زد میں آنے سے تعلقات کشیدہ ہوجاتے ہیں اور طبیعتیں کبیدہ۔ جوشخص اپنی رائے اور ردِّعمل ظاہر کرنے میں بے قرار ہوجائے' وہ تعلق برقرار رکھنے میں کامیاب نہیں ہوسکتا۔ گویا تعلق محفوظ رکھنے کا ایک

آسان طریقہ یہ بھی ہے کہ اپنی رائے محفوظ رکھی جائے۔ ردِ عمل میں گرفتار شخص ہر وقت عجلت میں ہوتا ہے۔ عجلت پسند دوسروں کو سزا دینے میں بھی عجلت اختیار کرتا ہے...... وہ کسی کو مہلت دینے کیلئے تیار نہیں ہوتا۔ سزا دینے میں عجلت کا مظاہرہ کرنے والا دوسروں پر اصلاح کے دروازے بند کر دیتا ہے۔ وقت مہلتِ عمل ہے...... اور عجلت پسند انسان وقت کی ناقدری کا مرتکب ہوتا ہے...... اس لیے اُس سے وقت واپس لے لیا جاتا ہے...... اُس کی مہلتِ عمل چھن جاتی ہے۔ جو کسی کو مہلت نہ دے، اُسے بھلا کون مہلت دے۔ مہلت دینا دراصل مہلت پانا ہے۔ مہلت دینا اصلاح کرنے کی ایک تدبیر ہے۔

صبر عظمت کے راستوں میں سے ایک راستہ ہے...... یہ انعام یافتہ لوگوں کا راستہ ہے۔ اِس راستے پر قدم رکھنا صرف راست باز انسانوں کا حق ہے۔ راستی پر پایۂ استقامت سے قیام کرنے والے ہی راہِ مستقیم پر متمکن ہیں۔ راہِ مستقیم استقامت کا راستہ ہی تو ہوتا ہے...... اُن لوگوں کا ساتھ دینے اور پھر نبھانے میں استقامت کا راستہ، جو ہم سے پہلے صراطِ مستقیم پر گامزن ہیں۔ اِس راستے کا دستور اگر کل تک موجود تھا، تو آج بھی بدستور موجود ہے...... راستہ موجود ہے، تو اُس راستے کے راہرو بھی موجود ہیں اور راہبر بھی!! درحقیقت موجود سے لاموجود تک لے جانے کیلئے یہی ایک راستہ ہے جو سیدھا ہے...... اور سیدھے راستے پر استقامت پانے والے ہی انعام یافتگان ہیں۔

کیا خوب قولِ برحق ہے اس ہستیؓ کا...... جس کی تمام عمر یہی بتانے میں تمام ہوئی کہ...... "سب سے بڑی قوت، قوتِ برداشت ہے"...... کتنی بڑی قوت ہوگی اس کردار کے پسِ پشت...... جو ہر ناقص و ناکس کی پشت پناہی کرتی رہی۔ سلام محبت ہے، اُس صاحبِ قوتؓ پر...... اور ہدیۂ دُرود ہے، اُس سچے صاحب ﷺ پر، جو سب قوتوں کا رزق تقسیم کرنے والا ہے...... اور سجدۂ تعظیم اُس مالک کیلئے، جو سب قوتوں کا خالق بھی ہے اور رازق بھی!!



باخدا دیوانہ باش' بامحمد ﷺ ہوشیار!!

ملکی اور بین الاقوامی منظر نامے میں آج کل نام و ناموسِ رسالت ؐ کی بابت کچھ ایسی آوازیں سننے میں اور ایسے مناظر دیکھنے میں آ رہے ہیں' جن سے صرفِ نظر کرنا اپنے ایمان کے تقاضوں سے نظر چرانے کے برابر ہے۔ کسی معاملے میں غیر جانبداری کا رویہ اختیار کرنا دراصل لاتعلقی کو ظاہر کرتا ہے۔ دین تو دین دینے والے کی ذات سے تعلق کا نام ہے۔ یہ تعلق جہاں کمزور پڑ جائے وہاں عبادت کفایت نہیں کر سکتی۔ رسول کریم ﷺ کل عالمین کیلئے جہاں رحمت کا باعث ہیں' وہاں آپ ؐ کی بعثت کل عالمِ انسانی کیلئے تا قیامت اتمامِ حجت بھی ہے۔ آپ ؐ کا ادب تمام انسانوں کیلئے ایک حجتِ تمام ہے۔ احترامِ رسول ختمی مرتبت کے حوالے سے کسی بھی قسم کی بے ادبی، زبان طرازی، بیان بازی قابلِ گرفت ہے۔ آپ ﷺ کے نام کا کلمہ پڑھنے والے اگر آپ ؐ کے نام کی بے ادبی پر خاموشی کا سمجھوتہ کر لیں تو یہ اَمر بجائے خود قابلِ گرفت ہے۔ ''آزادیٔ اظہار''، ''روشن خیالی'' اور ملکی و بین الاقوامی سیاست کے ''تقاضوں'' کے سبب توہین و تضحیک کے مرتکب افراد اور اقوام کی وکالت' بروزِ قیامت شفاعت سے محروم ہونے کا سبب بن سکتی ہے۔ تضحیک دراصل تکذیب ہے...... اور انبیاء کی تکذیب کرنے والی بستیاں تباہ ہو جاتی ہیں۔ وہ بستی دل کی بستی بھی ہو سکتی ہے اور دنیا کے سر د نقشے پر موجود مادی ترقی میں بدمست کوئی

ریاست بھی۔ مکذبین اور مکذبین کا ساتھ دینے والے ہلاکت کا شکار ہوتے ہیں۔ یہ تعزیر قرآن میں رقم ایک قانونِ فطرت ہے...... اور فطرت کی تعزیریں' زمانے کے بدلنے سے 'بدلنے کی نہیں!!

دیانت کیا ہے...... اور خیانت کیا ہے؟ دیانت کی ابتدا عمل سے پہلے قول سے شروع ہوتی ہے اور قول سے پہلے خیال سے۔ جو شخص خیال میں خیانت کا مرتکب ہوتا ہے' وہ کسی عمل اور عقیدے میں دیانتدار نہیں ہو سکتا ہے۔ لفظ کہنا ایک عہد کو دہرانے کے مترادف ہے...... وہ عہد جو انسان کسی عقیدے یا نظریئے سے کرتا ہے۔ ہر بولنے والے اور لکھنے والے کو پوری دیانت داری سے اس اَمر کا خیال رکھنا چاہیے کہ اس کا ایک ایک لفظ سننے اور پڑھنے والوں کی ذہن سازی کر رہا ہے۔ اگر ایک شخص کا قتل پوری انسانیت کا قتل ہے تو اسی قاعدے کے تحت ایک فردِ واحد کو گمراہ کرنا بھی پورے گروہِ انسانیت کو گمراہی کے راستے پر ڈالنے کے مترادف ہے، اور ایک فرد کو روشن رَوش پر ڈالنا گویا پوری انسانیت کی راہ روشن کرنا ہے۔

صادقؑ سے صداقت کا سبق پانے کیلئے پہلے اپنے اندر ایک گونہ صداقت کی روشنی کا موجود ہونا ضروری ہے...... کہ کوئی کتاب اندھیرے میں نہیں پڑھی جا سکتی...... اور وہ وجود جو **الکتاب** ہے ......لوح بھی ہے اور قلم بھی...... اُس کے ابجد سے شناسائی بھی ممکن نہیں جب تک کوئی من کی روشنی میں داخل نہ ہو۔ من کی روشنی میں داخل ہونے کیلئے تن کی تاریکی سے نکلنا پڑتا ہے۔ جس انسان میں امانت کا جوہر نہ ہو وہ الانسانؑ کی قدر کیسے کر سکے گا جو الامین بھی ہے۔ اندر کی روشنی میسر نہ ہو تو باہر روشن خیالی ایک خام خیالی ہے۔ روشن خیالی کی تاریک راہوں پر چلنے والے اپنے گھر کا رستہ بھول گئے۔ وہ یہ بھول گئے کہ یہاں اور وہاں' ہر دو جہاں لفظ لفظ کا آڈٹ ہوتا ہے۔ دراصل لفظ استعمال کرنے والا اپنے منہ سے یا

پھر مُوقلم سے جس قبیلے کی تعریف کرتا ہے' وہ اُسی قبیلے کا نمائندہ شمار ہوتا ہے۔ آج کے گلوبل ولیج میں نظریے کا نام قبیلہ ہے۔ کوئی جس قبیل کا نظریہ رکھے گا' اُسی قبیل سے اُس کا امام ہوگا۔ ''اُس دن اٹھائیں گے' ہم لوگوں کواُن کے اماموں کے ساتھ'' (القرآن 17:71) ...... یعنی ہر شخص اپنے نظریاتی گروہ کی عاقبت کا سزاوار ہے...... اور یہ عاقبت عقوبت بھی ہوسکتی ہے۔ ایک مؤثر اور صاحبِ رائے شخص جب کوئی رائے دیتا ہے تو وہ رائے عامہ ہموار کررہا ہوتا ہے، ایک کم مؤثر شخص بھی جب لفظوں کی شکل میں کسی مسئلے پر رائے ظاہر کرتا ہے تو وہ رائے عامہ میں ایک ووٹ کاسٹ کررہا ہوتا ہے۔ سیاسی اور سماجی مسئلہ ہوتو کوئی بات نہیں، لیکن اگر کوئی مسئلہ دینی پس منظر سے تعلق رکھتا ہو تو اس صورت میں غیر جانبدار رہنا منافقت کے زمرے میں آتا ہے۔ منافقت کا نام مفاہمت نہیں رکھا جاسکتا ...... اسی طرح مفاد پرستی کو حق پرستی نہیں کہا جاسکتا...... کہ یہ لفظوں کے ساتھ بددیانتی ہوگی ......اور لفظوں کی بددیانتی کو دوسرے لفظوں میں دھوکا کہتے ہیں۔

چند برس قبل وطنِ عزیز میں ایک بہت اہم واقعہ رونما ہوا، ایک صوبے کے گورنر کو اس کے باڈی گارڈ نے اپنی مشین گن سے فائرنگ کرکے گولیوں سے چھلنی کردیا۔ اس واقعے کی تشریح کیلئے آیا سیاست اور صحافت کا حوالہ ہی کافی ہے یا اسے کبھی روحانی اور دینی حوالے سے بھی دیکھا جائے گا؟ کیا ہماری شناخت اتنی کم قیمت ٹھہر چکی ہے کہ اس کیلئے سیاست اور دانشوری کا تمغہ ہی کفایت کرگیا ہے؟ کیا سیاسی وابستگی ہماری روحانی وابستگی پر غالب آچکی ہے؟ کیا بین الاقوامی دنیا میں اپنا امیج ''بحال'' کرنے کیلئے روحانی دنیا میں بدحال رہنا ہم نے قبول کرلیا ہے؟ ایک مادّی اور فانی دنیا کی ملامت کے ڈر سے ہم ایک روحانی اور ہمیشہ باقی رہنے والی دنیا کی شہادت کب تک چھپاتے رہیں گے؟

قرآن کا فیصلہ ہے کہ مخلوق کی آوازوں کا قد نبی ﷺ کی آواز سے بلند نہ ہو'

وگرنہ اعمال ضائع ہوجائیں گے اور اِس کا شعور تک نہ ہوگا۔ توہینِ رسالت ﷺ کا ارتکاب کرنے والے کیلئے توبہ نہیں ...... کہ توبہ تو وہ تبھی کر سکے گا جب اسے اپنے جرم کا شعور ہوگا۔

توہین رسالتؐ کی سزا کا قانون اَز روئے قرآن ثابت ہے...... قرآنی آیات کی ایک طویل فہرست پیشِ نظر ہے، تشریح نہیں' صرف ترجمہ ہی کافی ہے......(سورۃ الاحزاب' آیت ۵۳، ۵۷، ۶۱۔ سورۃ التوبہ' آیت ۳۰، ۶۱، ۶۵، ۶۶۔ سورۃ الذاریٰت' آیت ۱۰۔ سورۃ المائدہ' آیت ۳۳۔ سورۃ المجادلہ' آیت ۸۔ سورۃ الحجر' آیت ۹۵)۔

توہینِ رسالتؐ کی بابت قانون آج کے ''بنیاد پرستوں'' کی اختراع نہیں بلکہ گزشتہ چودہ صدیوں سے اُمتِ مسلمہ میں ایک مستقل دستور العمل ہے...... یہ الگ بات کہ اس قانون کو پاکستان کے نظامِ قانون کا حصہ بنے صرف دو دہائیاں گزری ہیں۔ مانا کہ ایک ڈکٹیٹر کے دور میں یہ دفعہ نافذ کی گئی لیکن ۱۹۹۲ء کی جمہوری پارلیمنٹ نے اسے قانون کا درجہ دینے کیلئے متفقہ طور پر قرارداد منظور کی تھی، اور اسی پارلیمنٹ میں محترمہ بینظیر بھٹو جیسی دانشور اور جہاں دیدہ سیاستدان بھی موجود تھیں۔

آزادیٔ اظہارِ کے لباس میں توہین رسالتؐ کے مجرموں کی عریانیٔ فکر ڈھانپی نہ جا سکے گی۔ دہشت گردی کی مذمت کی آڑ میں غیرتِ ایمانی قصہ پارینہ نہ بن سکے گا۔ اقوامِ عالم کو دہشت گردی کی تعریف متعین کرنا ہوگی' بصورتِ دیگر ہر گروہ اپنے مخالف گروہ کو دہشت گرد قرار دے کر ایک دوسرے پر چڑھ دوڑے گا۔ دہشت گردی کم سے کم تعریف یہ ہوگی کہ کسی بھی مذہب، رنگ، نسل، قوم اور قبیلے کو جسمانی اور ذہنی اذیت سے دوچار کرنے والا دہشت گرد ہے۔ راج پال دہشت گرد تھا' آزادیٔ رائے کا علمبردار نہ تھا۔ غازی علم دینؒ' شہید تھے...... اُن کے ردّعمل کا تعلق دہشت گردی سے نہیں جوڑا جائے گا۔ ناموسِ

کیلئے کوئی معافی نہیں۔ یعنی شرع کا قانون شروع سے یہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس مسئلے پر شیعہ، سنّی، وہابی، بریلوی سب کے سب متفق ہیں۔ تقریباً ایک ہزار سال گزرے، حضرت ابوالفضل قاضی عیاض مالکیؒ نے سیرت پر ایک کتاب مرتب کی جو ''الشفا...... بعریف حقوق المصطفیٰ ﷺ'' کے نام سے موسوم ہے۔ اسلامی تاریخ میں سیرت پر یہ ایک قدیم اور مستند کتاب ہے۔ اس کتاب میں ایک سو (۱۰۰) سے زائد صفحات پر مشتمل ایک پورا باب ہے، جو قرآن و حدیث اور فقہ کی اسناد اور حوالوں کے ساتھ توہینِ رسالتؐ کی تمام ممکنہ صورتوں اور اُن کی سزاؤں کی تفصیل میں لکھا گیا ہے۔ یہ کتاب تصوف کے حلقوں میں بھی مقبول و معروف ہے۔ اس کتاب کی جلد دوم کے باب چہارم بعنوان ''وجوہاتِ تنقیص وتوہین اور اس کے احکامِ شریعہ'' میں حضرت ابوالفضل عیاضؒ لکھتے ہیں: ''اُمت کا اس بات پر اجماع ہے کہ مسلمانوں میں جو شخص بھی حضور ﷺ کی تنقیص شان کرے، یا آپ ﷺ پر سبّ وشتم کرے، اُسے قتل کر دیا جائے''

بعض سادہ لوح لوگ سیرتِ پاک سے عفو و درگزر کی مثالیں دیتے ہیں اور اُمتِ مسلمہ کے اجتماعی ضمیر کو درگزر سے کام لینے کا ''حکیمانہ'' مشورہ دیتے ہیں...... وہ سادہ دل ایک سادہ سا نکتہ بھول جاتے ہیں کہ علم جس مرکز سے ملتا ہے اسی مرکز پر استعمال نہیں ہوتا۔ عفو و درگزر کا علم اس لیے دیا گیا ہے کہ اگر تم پر کوئی ظلم وزیادتی کرے تو اسے ذاتی سطح پر معاف کر دیا کرو۔ اس علم کا مدعا یہ ہرگز نہیں کہ اسی کلیے کو علم دینے والے ہی پر استعمال کرنا شروع کر دیا جائے۔ نبی کریم ﷺ کی شان میں گستاخی کرنے والے کو معاف کرنے کی سند پوری اسلامی تاریخ میں ڈھونڈنے سے نہیں ملے گی۔ جن اصحابِ رسول ﷺ نے گستاخانِ رسول ﷺ کے سر قلم کیے، کیا اُن پر کوئی حد جاری ہوئی؟ فتح مکہ کے موقع پر جب بدر اور اُحد کے قاتلوں کو بھی عام معافی دے دی گئی، دربارِ نبویؐ سے گستاخانِ نبوتؐ کے بارے میں

یہ حکم تھا کہ اگر وہ کعبہ کے پردوں کے پیچھے بھی چھپے ہوں تو انہیں ڈھونڈ کر قتل کر دیا جائے۔ گویا اپنے دشمن کو معاف کرنے کی تعلیم ہے، دشمنِ خدا کو نہیں ...... اور دشمن خدا کون ہے؟ جو خدا کے رسول ﷺ کو اذیت دے ...... رسولؐ خدا کو اذیت دینا اس کے سوا اور کیا ہو گا کہ منجانبِ الٰہی تفویض شدہ منصبِ رسالتؐ کی توہین کی جائے۔ درحقیقت جب کوئی توہین رسالت کا مرتکب ہوتا ہے تو وہ براہِ راست غیض وغضبِ الٰہی کو دعوت دیتا ہے۔ وہ خالقِ کائنات کی غایتِ تخلیق پر حملہ آور ہوتا ہے۔ نبی کریم ﷺ چونکہ سلسلۂ نبوت کی آخری کڑی ہیں، اس لیے یہاں توہین کا ارتکاب کرنے والا گویا مالکِ کائنات کے اِس عظیم منصوبے کو سبوتاژ کرنے کی کوشش کرتا ہے، جس کے تحت اس نے ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر اتارے۔ جو شہرِ علمؐ سے دُوبدو ہو جائے وہ ابوالحکم بھی ہو تو ابوجہل قرار پاتا ہے۔ یہ روز مرّہ کی حقیقت ہے کہ اِس شہر کے در کو پشت کرنے والے جہل اور گمان کی وادیوں میں بھٹکتے رہتے ہیں۔ شہرِ علمؐ تو دُور کی بات ...... شانِ رسالتؐ کی طرف بھی اگر کوئی اپنے گمان کی ٹیڑھی آنکھ سے دیکھے تو اُس کی فہم میں ٹیڑھ پیدا ہو جاتا ہے، اُس کی عقل کو گرہن لگ جاتا ہے ...... اُس کے ادراک کو گرہ لگ جاتی ہے ...... وہ دوست اور دشمن میں تمیز کرنے کی صلاحیت بھی کھو بیٹھتا ہے۔

جس قانون کا عنوان ''قانونِ تحفظِ ناموسِ رسالتؐ'' ہے اس قانون کا مضحکہ اُڑانا اور پھر علی الاعلان پبلک پلیٹ فارم پر نازیبا کلمات کہنا ...... اس قانون کو ''کالا قانون'' (معاذاللہ) قرار دینا، اگر توہین کے زمرے میں نہیں آتا تو پھر ادب کی سب کتابیں نئے سرے سے لکھنی پڑیں گی۔ جس طرح سیرت النبی ﷺ پر مرتب کی گئی کسی کتاب کو توہین آمیز الفاظ سے موسوم کرنا توہینِ رسالتؐ کے زمرے میں آتا ہے ...... (خواہ اس کتاب میں منقول واقعات کی صحت اور مؤلف کی علمی سطح قابل بحث بھی ہو) ...... اسی

طرح ایک قانون جسے شانِ رسالتؐ کے ساتھ ایک نسبت دے دی گئی ہو' اس کے متعلق توہین آمیز کلمات ادا کرنا توہینِ رسالت ﷺ ہی تصور ہوگا۔

توہینِ رسالتؐ کے قانون کے بارے میں کہا گیا کہ یہ قانون تو انسان کا بنایا ہوا ہے' اس لئے اِس کے بارے میں کچھ بھی کہا جا سکتا ہے۔ مان لیا کہ قانون انسان ہی کا بنایا ہوا ہے۔ مسجد انسان ہی بناتا ہے۔ کیا مسجد کی بے حرمتی کرنے والا اس لئے بری الذمہ ہے کہ مسجد انسان کی بنائی ہوئی ہے۔ قرآن پاک بھی انسانوں ہی کے پرنٹنگ پریس سے شائع ہو کر نکلتا ہے...... گویا اِس دلیل کی رُو سے کوئی قرآن کے اَوراق روندتا پھرے؟

کہا گیا کہ اس قانون میں سقم ہیں' لوگ ذاتی دشمنی کی بنا پر ایک دوسرے پر جھوٹے مقدمے درج کروا دیتے ہیں۔ اگر قانون کی کوئی دفعہ محض اس خدشے کے پیش نظر ختم کرنا ہی قرین دانش ٹھہرا' تو پاکستان پینل کوڈ میں درج سب دفعات کو دفع دور کریں...... کہ لوگ ذاتی دشمنی کی بنا پر قتل' چوری' ڈاکے' اغوا کے جھوٹے مقدمے بھی آئے روز درج کرواتے ہیں۔ کیا ہمیں اپنی عدالتوں پر اعتماد نہیں؟ عدالت کا کام ہے کہ سچ اور جھوٹ کی جانچ کرے، جرم ثابت ہونے پر سزا دے، بے گناہ کو بری کرے اور بہتان لگانے والے پر حد جاری کرے۔ عدالت عدل کرنے پر مامور ہے۔

ایک ٹاک شو میں گورنمنٹ کالج لاہور کے ایک طالب علم نے جب گورنر سے یہ سوال کیا کہ اللہ تعالیٰ تو قرآن پاک میں فرما رہا ہے: انّا کفینک المستھزئین (بے شک ان تمسخر کرنے والوں سے بدلہ لینے کیلئے ہم کافی ہیں) تو جنابِ گورنر آپ توہینِ رسالتؐ کے قانون کا انکار کیسے کرتے ہیں؟ اس کے جواب میں گورنر نے ہنسی اڑاتے ہوئے آن دی ریکارڈ کہا کہ جب اللہ کافی ہے تو پھر قانون بنانے کی کیا ضرورت ہے۔ (آف دی ریکارڈ ٹھٹھے مخول کا تو ذکر ہی کیا) گویا لوگوں کی یہ ''خوش فہمی'' بھی دُور ہوئی کہ شاید وہ اس

قانون کے خلاف نہیں' صرف اس کے پروسیجرل میکنزم procedural mechanism کے خلاف تھا۔ گورنر اور اس کا دفاع کرنے والوں کی دلیل کے مطابق جب توہین رسالتؐ سے نمٹنے کیلئے اللہ کافی ہے تو بین الاقوامی میڈیا پر خواہ فلمیں بنیں یا خاکے شائع ہوں' اہل اسلام کو احتجاج کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے!! یہی وجہ ہے' آج گورنر کی ''یاد'' میں شمعیں روشن کرنے والا طبقہ غیر ملکی میڈیا پر ہونے والی توہین رسالت کی قبیح ترین شکل پر بھی چپ سادھے ہوئے ہے اور آزادیٔ اظہار کے مغربی تصور کی علم برداری کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ اخلاق اور نصیب دونوں سے محروم لوگوں کی دلیل ہے کہ ''مغرب کا اپنا اخلاقی تصور ہے، ہمیں اس سے کیا؟'' استغفراللہ!! غلام ذہن اپنی سوچیں بھی اپنے آقاؤں سے مستعار لیتے ہیں!!

حضرت واصف علی واصفؒ کا ایک قول ہے ''اس شخص کی تعریف نہ کرو' جس کی عاقبت اپنے لیے پسند نہیں کرتے''۔ ایک خط کے جواب میں آپؒ فرماتے ہیں ''تحقیق کے دور میں جب کبھی سوال پیدا ہو تو اس کے جواب کیلئے مناسب انسان کی طرف رجوع کرنا ہی سوال کا آدھا جواب ہے۔ گوشت کا بھاؤ' قصائی کی دکان سے...... دینی مسائل' علماء سے...... ذاتی اور روحانی مسائل' فقیر سے پوچھنا بہتر ہے''۔ ظاہر ہے طبّ کا معاملہ ہو تو کسی سند یافتہ ڈاکٹر سے رجوع کیا جاتا ہے، کسی ڈیم یا پُل کی صحت کے متعلق ماہرانہ رائے مطلوب ہو تو انجینئرز سے دریافت کیا جاتا ہے' معاشیات کا مسئلہ ہو تو ماہرینِ معاشیات سے رابطہ کیا جاتا ہے' قانونی نکتہ زیرِ بحث ہو تو قانون دانوں سے مشاورت کی جاتی ہے......بس ہمارے لیے دینی مسائل ہی اتنے کم اہم رہ گئے ہیں کہ ہر شعبے کا دانشور اِن پر ماہرانہ تبصرہ کرنا اپنا پیدائشی حق تصور کرتا ہے، اور یہاں ''میں نہیں جانتا'' کہنے کی اخلاقی جرات بہت کم لوگوں میں دکھائی دیتی ہے۔ اب دیکھتے ہیں شرع وفقہ کا علم رکھنے والے ماہرین یعنی علماء

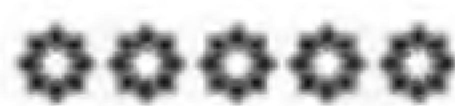
نے اس معاملے میں کیا کہا...... پانچ سو سے زائد علماء کا فتویٰ کہ گورنر گستاخ رسولؐ ہے اور جو اسے گستاخ نہیں سمجھتا وہ بھی گستاخ ہے...... بادشاہی مسجد کے امام' داتا دربار مسجد کے امام' یہاں تک کہ گورنر ہاؤس مسجد کے امام صاحب نے گورنر کی نماز جنازہ پڑھانے سے انکار کر دیا...... آخر کیوں؟ صرف اور صرف اس لئے کہ اُن کی نظر میں گورنر گستاخ رسولؐ تھا!! ...... یاد رہے کہ یہ علماء کسی گلی محلے کے مولوی نہیں' بلکہ مستند جامعات سے فارغ التحصیل اور محکمہ اوقاف کے حاضر سروس گزٹڈ آفیسر تھے۔

یہ واقعہ راہ چلتے ہوئے اچانک کسی کو مارڈالنے کا واقعہ نہیں (ایسا نہیں کہ بقول شخصے 'شہر کا شہر مسلمان بنا پھرتا ہے') بلکہ یہ واقعہ اپنی تمام تر جزئیات کے ساتھ ایک مقدمے کی طرح معاشرے میں چلتا رہا اور ساکت لفظوں اور متحرک تصویروں کی شکل میں کئی ماہ سے ریکارڈ ہوتا رہا۔ گورنر کا یہ اعلان کرنا کہ قانون تحفظِ ناموسِ رسالتؐ ایک '' کالا قانون '' ہے' ایک علی الاعلان بغاوت تھی' قانون سے' آئین سے' دین سے...... یہ ایک سول گورنر کی طرف سے آئین کی سول نافرمانی تھی۔ یہ ایک جمہوری حکومت کے گورنر کی طرف سے شعائر اللہ کی توہین تھی...... اگر اس توہین پر عوام خاموش رہتے تو یہ اس بات کی علامت ہوتی کہ اس توہین کو جمہور کی تائید حاصل ہے۔

جو شخص منصب میں جتنا بڑا ہوتا ہے' اس سے آئین اور قانون کی پاسداری کی توقع بھی اتنی ہی زیادہ کی جاتی ہے۔ جس آئین اور قانون کے تحت ایک گورنر کو گورنری دی جاتی ہے وہ اِسی قانون کی عدالتوں کا فیصلہ ماننے سے انکار کر دیتا ہے اور ایک ایسے مجرم کی پشت پناہی کیلئے اپنے اسکواڈ سمیت میدان میں کود پڑتا ہے' جسے آئینِ پاکستان کے تحت قائم عدالت نے مجرم قرار دیا ہے۔ باوجودیکہ ابھی ہائیکورٹ اور سپریم کورٹ میں قانون کے مطابق مجرم کو خود اپیل کرنے کا حق حاصل تھا' گورنر نہ صرف یہ کہ مجرم کی حمایت میں بیان

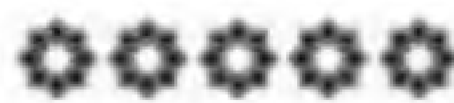
دیتا ہے بلکہ اُسے جیل سے نکال کر اپنے ساتھ بٹھا کر پریس کانفرنس کرتا ہے' اُس کی حوصلہ افزائی کرتا ہے اور دنیا بھر کے میڈیا کے سامنے اعلان کرتا ہے کہ وہ مجرمہ کو عدالت کی طرف سے ملنے والی سزا معاف کروا دے گا۔ وہ یہ بھی اعلان کرتا ہے کہ مجرمہ کی درخواست لے کر وہ دارالحکومت خود جائے گا...... اُس نے گلوبل ولیج میں بیچ چوراہے کے اپنے ہی ملک کے قانون کا مضحکہ اُڑایا! پبلک آفس ہولڈر کا کوئی قول وفعل اس کا ذاتی عمل نہیں رہتا، وہ پبلک کیلئے ایک نظیر بنتا ہے...... اس لئے ایک سیکولر معاشرے میں بھی عوام اس کے قول وفعل پر گرفت کرتے ہیں۔ کیا گستاخِ رسولؐ کی اعانت کرنا گستاخی نہیں؟ ...... اور گستاخ بھی وہ' جس پر محض الزام ہی نہیں' عدالت میں جرم بھی ثابت ہو چکا ہو۔ جس طرح ایک مجرم کی اعانت کرنا قانون کی نظر میں ایک جرم ہے' اسی طرح گستاخ رسولؐ کا دفاع کرنا بھی گستاخی کے زمرے میں ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ کون روشنی میں داخل ہوتا ہے اور کون ''روشن خیالی'' میں...... شانِ رسالتؐ پر سمجھوتہ کرنے والے زمانے کی دست برد کا شکار ہو جائیں گے...... وہ اُس عرفان سے خود کو محروم کر لیں گے جو ہمیشہ کیلئے ہوتا ہے اور جسے ہو جائے اُسے بھی ہیشگی عطا کر دیتا ہے۔ دانش برہانی کا تقاضا ہے کہ جہاں ذرا سا بھی شائبہ ہو کہ شانِ رسالتؐ کے حوالے سے بے ادبی کا احتمال پیدا ہو رہا ہے' اس ماحول سے خود کو فوراً الگ کر لیا جائے۔ سیّدنا غوث الاعظم حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کا فرمان ہے: ''بے ادب...... خالق اور مخلوق دونوں کا معتوب ہے''۔ ماہ وسال کو زیادہ گردش میں نہیں جانا پڑے گا کہ تاریخ کی عدالت بھی اپنا فیصلہ سنا دے گی۔ تاریخ زمانے کا عمل بھی ہے اور عدل بھی...... اور زمانہ برہان بھی ہے اور فرقان بھی!!



دیتا ہے بلکہ اُسے جیل سے نکال کر اپنے ساتھ بٹھا کر پریس کانفرنس کرتا ہے' اس کی حوصلہ افزائی کرتا ہے اور دنیا بھر کے میڈیا کے سامنے اعلان کرتا ہے کہ وہ مجرمہ کو عدالت کی طرف سے ملنے والی سزا معاف کروا دے گا۔ وہ یہ بھی اعلان کرتا ہے کہ مجرمہ کی درخواست لے کر وہ دارالحکومت خود جائے گا...... اُس نے گلوبل ولیج میں بیچ چوراہے کے اپنے ہی ملک کے قانون کا مضحکہ اُڑایا! پبلک آفس ہولڈر کا کوئی قول وفعل اس کا ذاتی عمل نہیں رہتا، وہ پبلک کیلئے ایک نظیر بنتا ہے...... اس لئے ایک سیکولر معاشرے میں بھی عوام اس کے قول وفعل پر گرفت کرتے ہیں۔ کیا گستاخ رسولؐ کی اعانت کرنا گستاخی نہیں؟ ...... اور گستاخ بھی وہ' جس پر محض الزام ہی نہیں' عدالت میں جرم بھی ثابت ہو چکا ہو۔ جس طرح ایک مجرم کی اعانت کرنا قانون کی نظر میں ایک جرم ہے' اسی طرح گستاخ رسول کا دفاع کرنا بھی گستاخی کے زمرے میں ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ کون روشنی میں داخل ہوتا ہے اور کون ''روشن خیالی'' میں ...... شانِ رسالتؐ پر سمجھوتہ کرنے والے زمانے کی دست برد کا شکار ہو جائیں گے ...... وہ اُس عرفان سے خود کو محروم کر لیں گے جو ہمیشہ کیلئے ہوتا ہے اور جسے ہو جائے اُسے بھی ہمیشگی عطا کر دیتا ہے۔ دانش برہانی کا تقاضا ہے کہ جہاں ذرا سا بھی شائبہ ہو کہ شانِ رسالتؐ کے حوالے سے بے ادبی کا احتمال پیدا ہو رہا ہے' اس ماحول سے خود کو فوراً الگ کر لیا جائے۔ سیّدنا غوث الاعظم حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کا فرمان ہے: ''بے ادب ...... خالق اور مخلوق دونوں کا معتوب ہے''۔ ماہ وسال کو زیادہ گردش میں نہیں جانا پڑے گا کہ تاریخ کی عدالت بھی اپنا فیصلہ سنا دے گی۔ تاریخ زمانے کا عمل بھی ہے اور عدل بھی ...... اور زمانہ برہان بھی ہے اور فرقان بھی!!



مزاج، سفر اور منزل

ہم مزاج ہونا' ہم سفر ہونا ہے ...... اور ہم سفر ہونا' ہم منزل ہونا ہے ...... جلد یا بدیر!! دراصل ہم مزاج ہی ہم جنس ہوتا ہے...... اور لوازماتِ سفر میں یہ لازم ہے کہ غیر جنس کے ساتھ کبھی عازم سفر نہ ہونا چاہیے ...... خواہ سفر' سفرِ مقدس ہو ...... اور منزل' بمنزلِ مکّہ۔ منزل مقدر ہوتی ہے اور مزاج مقدر کا حصہ ...... اس لیے انسان اپنی منزل کا تعین خود بھی کرے تو بقدرِ مزاج ہی کرتا ہے۔ دو مختلف منزلوں کے مسافر زیادہ دیر تک ہم سفر نہیں رہ سکتے۔ بعض اوقات کوئی ہم سفر تو ہوتا ہے مگر ہم مزاج نہیں ہوتا۔ اگر ہم سفر ہم مزاج نہ ہو تو ہم منزل کیسے ہو سکتا ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ ہم مزاج ہمیشہ ہم سفر ہی رہتا ہے' خواہ ظاہری معیت اُسے حاصل نہ بھی ہو ...... لیکن ہم سفر جب تک ہم مزاج نہ ہو' سنگت میں شامل نہیں ہوتا۔ درحقیقت ہم مزاج ہی ہم راز ہوتا ہے...... اور ...... راز' منزل کا ایک ذاتی نام ہے!!

ہم مزاج ہمیشہ پسندیدگی کے دائرے میں رہتا ہے اور غیر مزاج ہمیشہ غیریت کے دائرے میں ...... اس لیے کسی کی آنکھ کا گلاب ہونا اور کسی کی نظر میں خار بن کر کھٹکنا' اپنے اپنے مزاج کی طرح اپنا اپنا مقدر ہے۔ جہاں مقدر اپنا عمل شروع کر دے' وہاں کسی اور عمل کی گنجائش نہیں رہتی۔ یہی وجہ ہے کہ جو نظروں میں جچ نہ سکے' اُس کا ہر عمل غیر معتبر نظر آتا ہے۔ مزاج کا غیر ...... غیر معتبر ہی رہتا ہے ...... لاکھ قسمیں اُٹھاتا رہے' لاکھ سر جھکاتا رہے۔

مزاج اور منزل کے درمیان ایک عجب راز ہے ...... دورانِ سفر اگر ہم سفر' ہم

مزاج نہ ہوں تو آسودۂ منزل وہ مسافر ہوگا جو ثابت قدمی سے دوسرے کے مزاج کو برداشت کرتا رہے گا۔ غیر مزاج سے وفا کرنے والا باطن کی دنیا میں داخل ہو جاتا ہے...... اور باطن میں داخل ہونے والے پر ظاہر کا احترام واجب ہو جاتا ہے، جبکہ ظاہر پر...... ظاہر ہے' صرف ظاہر کا قانون ہی لاگو رہے گا۔ باطن کی دنیا میں عازمِ سفر وہی ہوتا ہے...... جس کی منتظر خود منزل ہوتی ہے۔

مزاج ایک زاویۂ نظر ہے...... جس کا مزاج مختلف ہے' اُس کا زاویۂ نظر بھی مختلف ہوگا۔ زاویۂ نظر کا اختلاف میدانِ نظر کا اختلاف پیدا کرتا ہے...... اور میدانِ نظر کا اختلاف' میدانِ عمل کا۔ جس کا علم مختلف ہے' لازم ہے کہ اس کا عمل بھی مختلف ہو۔ بہر حال اختلاف...... علم کا ہو یا عمل کا...... بیانات میں اختلافات کا سبب بنتا ہے۔ لوگ ایک دوسرے کے بیانات سے لڑتے رہتے ہیں اور کسی بیان کے پس پشت اس بیان گو کے علم اور عمل کی مجبوری کو نہیں سمجھتے۔ جہاں مزاج کا اختلاف ہو وہاں جھگڑا کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے...... بلکہ وہاں تو دلیل پیش کرنے کی بھی ضرورت نہیں...... کہ ہر فریق جھگڑے کا سبب اور نتیجہ اپنے اپنے مزاج کے مطابق اخذ کرے گا۔ اگر شروع دن ہی سے ایک دوسرے کے علم اور عمل کی مجبوری کا احترام کر لیا جائے تو جھگڑوں کے دُھند لکے اندھیرا نہیں کرتے۔ جھگڑا...... اندر ہو یا باہر...... مسافر کا سفر روک دیتا ہے۔ جھگڑا...... اپنی انا کا شور ہے۔ جب تک یہ شور مدھم نہیں ہو جاتا' جھگڑا ختم ہونے میں نہیں آتا۔ دراصل اپنے مزاج کا برملا اظہار بھی غرور کے زمرے میں آتا ہے...... اور جہاں مزاج اور غرور جا بجا اظہارِ خیال کرنے لگیں وہاں جھگڑے برسات کے خودرَو پودوں کی طرح جگہ جگہ پھوٹنے لگتے ہیں۔

الفاظ سے معانی کا سفر کثرت سے وحدت کا سفر ہے۔ معانی...... سُر' سنگت اور سنگیت سے جنم لیتے ہیں۔ ہم مزاج سنگی جس سُر میں بھی کلام کرے سُر یلا لگتا ہے۔ سنگت کا

جلترنگ مزاجوں کے ہم آہنگ ہونے سے بجنے لگتا ہے۔ سنگت ہم نفس انسانوں کی ہوتی ہے ...... اُن کے مزاج کی ہم آہنگی ایک سنگیت کا سماں پیدا کرتی ہے...... اور یہی وہ سمئے ہوتا ہے جب لفظوں کے قالب میں معانی کی روح اُتر آتی ہے۔

معانی کی دنیا کے مسافر کیلئے یہ رَوا نہیں کہ وہ دکھ اور سکھ کے درمیان کوئی فرق رَوا رکھے ...... امیر اور غریب کے درمیان سلوک کے حوالے سے کوئی تفریق قائم کرے۔ دکھ اور سکھ ...... واقعات کی امارت اور غربت ہیں۔ دُکھ اور سُکھ ہمارے مزاج اور فہم کے مطابق واقعات کے تراجم ہیں۔ اپنے اپنے مزاج کی طرح ہر شخص کی فہم وفراست کا رنگ بھی جدا جدا ہوتا ہے۔ وحدت کے مسافر پر ہر رنگ کا احترام واجب ہے۔ اپنے مزاج کا اَسیر ...... خدا کی بنائی ہوئی نیرنگ خلقت کی سیر نہیں کرسکتا۔ اگر انسان اپنے مزاج کے حصار سے نکل آئے تو امیری اور غریبی کی حقیقت اس کی نظر میں ایک منظر کے مشاہدے کے سوا کچھ نہیں۔ وہ نظر جو اپنے مفاد اور مزاج میں رہن ہے' کائناتِ حقیقت کے مشاہدے میں اس کا کچھ حصہ نہیں۔ حقیقتِ کائنات ...... کائناتِ حقیقت ہے ...... اور کائناتِ حقیقت ...... اَمر' مشیّت اور مشاہدے کی ایک جلترنگ ہے۔ مشاہدہ ...... دل اور عقل کی ہم آہنگی مانگتا ہے۔ مشیت کے مشاہدے کیلئے عقلِ سلیم چاہیے ...... اور اَمر کی تسلیم کیلئے قلبِ سلیم۔

مزاج ہی رفتہ رفتہ کردار بن جاتا ہے۔ مزاج کی نرم مٹی کو اگر بروقت کسی خوبصورت سانچے میں نہ ڈال دیا جائے تو وقت کی تمازت اِسے کسی اَن گھڑ اینٹ پتھر کی شکل میں ڈھال دیتی ہے۔ اس لیے خود کو اپنے سانچے ہادی' مرشد' گرو کے ہاتھ سونپنا ...... دراصل اپنی طینت کی مٹی کو ایک خوبصورت سانچے میں ڈھالنے کی تدبیر کرنا ہے ...... یہ سیرت سازی کا علم ہے ...... کردار سازی کا عمل ہے۔ اپنے استاد کا ہم مزاج شاگرد پہلی ملاقات ہی میں آدھے سے زیادہ سبق پڑھ چکا ہوتا ہے۔ عرفان کا سفر ...... مزاجِ یار کی تفہیم

کا سفر ہے۔اپنے مزاج سے فانی ہوئے بغیر انسان عازمِ بقا نہیں ہوسکتا۔

انسانی مزاج فطرتاً ایک سرکش گھوڑے کی طرح ہوتا ہے...... اسے رام کرنا' ایک ریاضت مانگتا ہے۔اپنے مزاج کی لگام کسی رحیم صفت ذات کے ہاتھ میں دے دی جائے' تو یہ رام ہوجاتا ہے۔خود کو اخلاق کے دائرے میں باندھ لیا جائے' تو ریاضت کا عمل شروع ہوجاتا ہے۔دراصل اخلاق میں داخل ہونا' اپنے مزاج پر فتح پانا ہے۔اگر مزاج میں اخلاق نافذ نہ ہو چکا ہو تو اخلاق کا ''مظاہرہ'' کرنے والا بہت کرب اور ابتلا میں نظر آتا ہے۔اخلاق کا اصل امتحان...... اس وقت شروع ہوتا ہے جب اپنے مزاج کے برعکس کوئی شخص اس کے حلقۂ اختیار میں داخل ہو...... اور وہ ہو بھی بے دست و پا!! کسی گواہ کی غیر موجودگی میں...... ایک بااختیار آدمی کا کسی بے اختیار آدمی کے ساتھ سلوک' وہ آئینہ ہے جس میں اُس کے اخلاق کا اصل چہرہ دکھائی دیتا ہے۔اخلاق کا آدھا سبق صرف تحمل کے باب میں پورا ہوجاتا ہے...... تحمل سے دوسرے کی بات سن لینے میں!!۔تحمل ملامت سننے کی ہمت ہے۔جو شخص ملامت کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا وہ اپنے مزاج کے بوجھ سے آزاد نہیں ہوسکتا۔اخلاق کی ابتدا تحمل ہے اور انتہا احسان۔دراصل اخلاق ایک پُل صراط ہے...... اپنے مزاج کے دوزخ سے نجات پانے کیلئے اس تلوار کی دھار سے زیادہ باریک پُل صراط سے گزرنا ہوتا ہے۔

مزاجوں کی دنیا میں ایک مزاج انصاف ہے اور ایک احسان۔انصاف اپنے مزاج میں کڑا' کڑوا اور کھرا ہوتا ہے اور احسان منکسر المزاج' دھیما اور میٹھا۔انصاف اور احسان کے دریا میٹھے اور کھارے پانی کی طرح ایک دوسرے سے جدا رہتے ہیں...... ایک دوسرے کے ساتھ خوش اسلوبی سے ملنے کے باوجود...... نہیں ملتے۔انصاف کرنا آسان ہے، احسان کرنا مشکل ہے...... کیونکہ یہ مشکل گھاٹی کا سفر ہے۔احسان جب تک مزاج میں

شامل نہ ہو، ہمیشہ مشکل نظر آتا ہے...... بلکہ بیشتر اوقات تو نظر ہی نہیں آتا...... اس لیے ظاہر کی بجائے غیب میں جمع ہوتا رہتا ہے۔ احسان سوئے ہوئے بچے کو پیار کرنے کا نام ہے۔ احسان کا ایک اپنا مزاج ہوتا ہے...... یہ اپنے مزاج کے برعکس مزاج کو برداشت بھی کرتا ہے اور اس کی پرداخت بھی کرتا ہے۔ یوں کہنا چاہیے کہ احسان اپنے مزاج کے برعکس مزاج کے ساتھ وفا کرنے کا نام ہے۔ احسان...... شکوے کی جگہ شکر یہ بولنے کا نام ہے ...... اس لئے بہت بڑا کام ہے...... بس...... بڑے لوگوں کے بس کا کام ہے!!

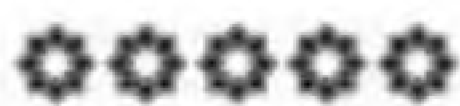
قرآن کریم میں ارشادِ ربِ رحیم ہے...... **قل ان کنتم تحبون اللّٰہ فاتبعونی یحببکم اللّٰہ** ...... ''آپ ﷺ کہہ دیجئے اگر تم اللہ سے محبت کرنا چاہتے ہو تو میری اتباع کرو، اللہ خود تم سے محبت کرنے لگے گا'' ...... ایک اور جگہ ارشاد ہے...... : **واللّٰہ یحب المحسنین** ...... ''اور اللہ احسان کرنے والوں سے محبت کرتا ہے'' ...... یہ دونوں آیات ایک دوسرے کی اَز خود تفسیر ہیں۔ معلوم ہوا کہ اللہ سے محبت ہو ہی نہیں سکتی جب تک اتباعِ محمدی ﷺ نہ ہو۔ اتباعِ محمدی ﷺ...... اتباعِ کردارِ محمدی ﷺ ہے۔ اتباع...... کردار کے اتباع کا نام ہے۔ اتباع میں کردار کا پہلو موقوف ہو جائے تو یہ نقل ہے...... یا نفاق! ...... محسنِ انسانیت ﷺ کی اتباع میں داخل ہونے والے...... اُسوۂ حسنہ پر عمل کرنے والے...... درجۂ احسان میں داخل ہو جاتے ہیں...... اور جو درجۂ احسان میں داخل ہو جاتے ہیں...... وہ اللہ کو محبوب ہو جاتے ہیں ...... بلکہ محبوبِ الٰہیؒ ہو جاتے ہیں...... دین کا نظام بن جاتے ہیں۔ دین کا نظام...... اخلاقِ محمدی ﷺ سیکھنے اور سکھانے کا نظام ہے...... اپنی زمین وجود پر اخلاقِ محمدی ﷺ نافذ کرنے کا نام ہے۔ اخلاقِ محمدی ﷺ ہی وہ راستہ ہے جو انسان کو اُس کے مزاج کی شورزدہ اور شوریدہ سرزمین سے نکال سکتا ہے۔ درحقیقت مدینے کو جانے کے تمام راستے حسنِ اخلاق کے قمقموں سے روشن ہیں۔ انسان اپنے مزاجِ وجود کی تنگنائے سے نکل جائے تو سامنے لطف و کرم کا ایک بحرِ بیکراں اُس کا منتظر ہوتا ہے۔

یہ اعجاز قرآنی ہے کہ اس کی ہر آیت فی الواقع ایک نشانی ہے۔ ہر آیت ہدایت کا ایک روشن باب ہے ...... اور یہ باب اولو الالباب پر ہر روز نئی آن' نئی شان سے عیاں ہوتا چلا جاتا ہے۔ قرآن پاک کی ایک آیت دوسری آیت کی تشریح کرتی ہے۔ قرآن کریم میں ایک اور جگہ ارشادِ ربانی ہے: صبغة اللّٰه ومن احسن من اللّٰه صبغة ...... ''اللہ کا رنگ اختیار کرو' اللہ سے بہتر کس کا رنگ ہے'' ...... اور حدیثِ نبویؐ ہے: تخلقو باخلاق اللّٰه ...... ''خود کو اللہ کے اخلاق سے متصف کرو'' ...... اب ظاہر ہے اللہ غیب میں ہے ...... مخلوق اللہ کے اخلاق کا مشاہدہ کیسے کرے؟ اللہ غیب میں ہے ...... اُس کا رسولؐ شہود میں ہے ...... اور اُمتی اپنے رسولؐ کے مشہود ہونے کی شہادت دے سکتا ہے ...... بذریعۂ اخلاق محمدی ﷺ .... بطریقِ اتباعِ کردارِ محمدی ﷺ !!

کردار کا اتباع اس وقت تک ممکن نہیں جب تک صاحبِ کردار سے مزاج آشنائی نہ ہو۔ دراصل مزاج حبیبؐ سے آشنائی ہی ذات سے شناسائی کا ایک ذریعہ ہے ...... اور مزاج آشنائی کا واحد ذریعہ محبت ہے۔ محبت ہی وہ زبردست قوت ہے جو انسان کو اُس کے مزاج کی کشش ثقل سے نکل جانے میں مددگار ثابت ہوسکتی ہے۔ محبت بھی ایک ہجرت ہے ...... اپنے مزاج سے نکل کر محبوب ﷺ کے قریۂ مزاج میں داخل ہونے کا نام۔ سچ فرمایا' سچ فرمانے والےؒ نے ......

دین کیا ہے' تیریؐ اُلفت کے سوا — دین کا بس اک یہی معیار ہے

آدمؑ تا ایں دم ...... کُل عالَم کے عالِم ...... میدانِ فکر کے شاہسوار ...... اخلاقیات کے معلّمین و متعلّمین' مدبّرین و متدبّرین ...... اپنا اپنا کاسۂ طلب لیے ...... جس منزل کی تلاش میں عازمِ سفر ہیں ...... وہ کردارِ محمدی ﷺ ہے ...... کُل عالمِ کائنات اور کُل کائناتِ عوالم ...... امکانات کے سب دائروں میں جس ذات کے عرفان کی جستجو میں محوِ طواف ہیں ...... وہ صرف اور صرف ذاتِ محمد ﷺ ہے ...... !!



مسافر، سفر اور منزل

اس جہانِ رنگ و بو میں ہر شئے مسافر ہے۔ ہر شئے موجود جامۂ وجود پانے کیلئے سفر میں ہے ...... لیکن اپنے اپنے رنگ میں ...... اپنی اپنی خوئے شوق کے مطابق ...... اور اپنی ہی اُفتادِ ذوق کے موافق! اس جہانِ ہست و بود میں ہر شئے اپنی نمود کی نہایت پر پہنچنے کیلئے محوِ سفر ہے ...... کہ اپنی نہایت کو پہنچ کر ہی وہ ہست ہوتی ہے ...... وگرنہ بود۔ مبارک ہے وہ مسافر جو ہستی کا راز دریافت کرنے کیلئے نکلا ہے ...... اور اس راز کا راز یہ ہے کہ یہ ہستی اُس کی اپنی ہستی بھی ہے اور وہ ہستی بھی جس کا وہ طالب ٹھہرا۔ اِس مبارک سفر کی ابتدا بھی مبارک ہے اور انتہا ...... تو ہے ہی مبارک تر ...... کہ اس کی نہایت مسافر کے ساتھ ساتھ منزل کی بھی غایت ہوتی ہے۔ ہر منزل اپنے مسافر کی مشکور ہوتی ہے ...... کہ تعینات کی دنیا میں مسافر ہی منزل کا تعین کرتا ہے ...... اِس طرح منزل پردۂ غیب سے نکل نکل کر ظاہر میں موجود ہونے لگتی ہے۔ مسافروں کے ساتھ منزلیں خود مسافت میں ہیں۔ ہر منزل کو حکم ہے کہ وہ اپنے مسافر کی سنگت کرے ...... پہلے خیال میں ...... پھر حال میں!!

دنیائے عرفان کا مسافر درحقیقت دنیائے معانی کا مسافر ہوتا ہے۔ اس کی مسافت لفظ سے معانی کے درمیان طے ہو جاتی ہے۔ لفظ ظاہر ہے معنی اُس کا باطن ہے۔ اُس کا سفر ظاہر سے باطن تک رسائی پانے کا سفر ہے۔ ظاہر فنا ہے ...... باطن بقا ہے۔ ظاہر تغیر ہے ......

باطن ثبات اور قیام !! ظاہر سے باطن کا سفر ...... خبر کو نظر بنانے کا عمل ہے ...... قال کو حال بنانے کا سفر ہے۔ ظاہر کا باطن پاتے ہی باطن ظاہر ہو جاتا ہے۔ باطن کا مسافر خدا شناسی کی تلاش میں نکلتا ہے اور خود آشنا لوگوں کی معیت میں چلتا ہوا بالآخر خود شناسی کی منزل تک جا پہنچتا ہے ...... اور یہاں پہنچ کر اُس پر روزِ ازل سے طے شدہ یہ راز منکشف ہو جاتا ہے ...... **من عرف نفسهٗ فقد عرف ربّه** ...... ''جس نے اپنے نفس کو پہچان لیا' پس اس نے اپنے ربّ کو پہچان لیا'' ...... یہ خدائی راز ...... رازِ خدائی بھی ہے !!

سفر ...... درحقیقت خود کو دریافت کرنے کا عمل ہے ...... ایک گم گشتہ ''خود'' کی دریافت کا عمل ...... خود کو بازیافت کرنے کا عمل ! ...... اِس یافت اور بازیافت کے دائرے میں سفر کرتا ہوا مسافر اپنی ''میں'' کھو بیٹھتا ہے ...... تاکہ وہ کسی ''تُو'' کے حضور باریاب ہو سکے۔ ''میں'' ...... جب ''تُو'' کے حضور پہنچتی ہے تو ''من وتُو'' کی بحث ختم ہو چکی ہوتی ہے۔ کوئی ''در'' یافت ہو جائے تو نایافت ...... یافت ہونے لگتا ہے۔ باہر ''تو'' دریافت ہوتے ہی ''من'' کا ''اندر'' بازیافت ہو جاتا ہے!!

یہ سفر نہیں بلکہ اندازِ سفر ہے جو مسافر کی منزل کا پتہ دیتا ہے۔ کوئی منفی انداز کسی مثبت منزل تک نہیں لے جا سکتا۔ کوئی متغیر اور منفی طرزِ فکر اُس منزل تک رسائی نہیں پا سکتا جسے ثبات اور اثبات کا نام دیا جاتا ہے۔ بہت سے مسافر سوئے کعبہ روانہ ہوئے مگر اُن کی نیت اُنہیں ذات کی بجائے ذاتیات میں لے گئی ...... اُن کا اندازِ سفر اُنہیں اپنے مفادات کے سومنات کی طرف لے گیا۔ درحقیقت سوئے حرم جانے والے مسافر کی راہ میں ہر غرض ایک بُت ہے ...... ہر مفاد ایک معبود!

نیّت ...... سفر کی سمت کا نام ہے، اور وقت وہ فاصلہ ہے جو مسافر اور اُس کی منزل کے درمیان حائل ہوتا ہے۔ وقت کا پردہ اُٹھتے ہی مسافر' سفر اور منزل کی تثلیث ختم ہو جاتی

ہے ...... اور مسافر اپنی منزل سے واصل ہو جاتا ہے۔ وصال اسی کا ہوتا ہے جس کی منزل اُس کی محبوب ہو اور محبوب اُس کا منتظر ہو۔ منزل ...... اگر محبوب کے سوا ہے...... تو ماسوا ہے۔ اگر منزل محبوب کی طلب اور مسلسل طلب کا نام ہے...... تو ماوراء ہے۔ ظاہر ہے منزل اگر دلبر ہے تو وہ دل میں ہے۔ دل ماوراء ہوتا ہے...... جسم ماسواء...... !!

اگر مسافر راہِ تسلیم سے گریز کر جائے تو منزل بھی مائل نہیں ہوتی ...... یوں راستہ طویل بھی ہو جاتا ہے اور پُر خطر بھی۔ تسلیم اور اخلاص ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ اخلاص کی سواری میسّر آ جائے تو منزل دو قدم ہے۔ اخلاص ...... اپنے مزاج اور مفاد کی نفی کا نام ہے۔ مزاج اور مفاد ہی مسافر کیلئے سدِّ راہ ہیں۔ مفاد ...... مسافت میں طوالت کا باعث بن جاتا ہے اور مزاج کا تفاوت ...... اُس منزل کو نظر سے اوجھل کر سکتا ہے جو ہم راہ ہوتی ہے۔

عام طور پر مختصر راستے محفوظ راستے نہیں ہوتے لیکن خطِ مستقیم وہ سیدھا راستہ ہے جو مسافر کیلئے مختصر ترین بھی ہوتا ہے اور محفوظ ترین بھی۔ سیدھے راستے پر چلنے والے مسافر پر عین سفر کے دوران میں ایک ایسی حالتِ سکون وارد ہوتی ہے جسے عافیت کہتے ہیں ...... یہ سکینت مسافر کے اندر کی سکونت ہے۔ اندر سکون ہو تو باہر سلامتی سلامتی ہے۔ سلامتی عافیت کا دوسرا نام ہے ...... اور سلامتی کا راز تسلیم میں پوشیدہ ہے۔ عافیت ...... منزل سے بہت پہلے عطا ہونے والا ایک ایسا انعام ہے جو صرف خوش نیت مسافر کا حق ہے۔ نیت میں خلل واقع ہو جائے تو سفر کے متعلق خوش گمان ہونے کے باوجود منزل گمان سے نکل جاتی ہے۔

یوں تو ہر سفر کا ایک مدعائے سفر ہے ...... اور مدعائے سفر بالعموم حصولِ منزل ہوتا ہے ...... لیکن ظاہر کا قاعدہ اور ہے اور باطن کا قانون اور۔ باطن کے حوالے سے دیکھا جائے تو تصورِ منزل ...... حجابِ منزل ہے۔ سفر کا مدعا اگر خارج میں ہے تو ہر سفر ایک سفرِ

لا حاصل ...... ہر منزل ایک واہمہ۔ مدّ عائے سفر دنیا ہے تو مسافرت کا نام سوداگری ہے اور مسافر سوداگر کہلاتا ہے۔ اگر ظاہر کے سفر کا مدعا باطن ہے' تو عین سعادت ...... باطن کا سفر اگر خارج میں انعام تلاش کر رہا ہے' تو عنوانِ شقاوت !!

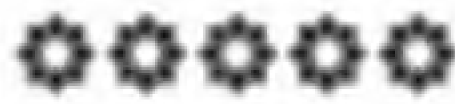
زندگی میں سب سے بڑا محسن وہ ہوتا ہے جو منزل کی خبر دیتا ہے۔ اس لئے محسن کُش ...... کبھی منزل تک نہیں پہنچتا۔ منزل کی خبر دینے والا آمادۂ سفر کرتا ہے اور منزل کی خبر پاتے ہی انسان عازمِ سفر ہو جاتا ہے۔ اگر دیکھا جائے تو منزل، منزل کی خبر اور مخبر باہم ملے ہوئے ہیں ...... گہرے پانیوں کی طرح ...... مزاج میں' رنگ میں' آہنگ میں !

مسافر ...... مقیم سے بہر طور بہتر ہے ...... کہ مسافر منزل تک نہ پہنچ پائے تو بھی وہ دو منزلوں سے آشنا ہوتا ہے ...... ایک وہ منزل جسے وہ ترک کر چکا اور دوسری وہ' جس کیلئے وہ عازمِ سفر ہوا۔ دوسری طرف آدھے راستے کا مسافر دو منزلوں سے محروم ٹھہرتا ہے۔ آدھے راستے کا مسافر وہ ہوتا ہے جو روح کے سفر پر روانہ ہوا مگر درمیان میں جسم کی کشش نے اُسے آلیا ...... اور آدھے راستے ہی سے اُس کے سفر کا رخ تبدیل ہوگیا ...... وہ روح کو پہچان سکا اور نہ جسم کا راز ہی اس پر منکشف ہو سکا۔

مسافر' سفر اور منزل کے درمیان ایک رازِ عجب ہے۔ مسافر سفر کرتا ہوا خود ہی نشانِ منزل بن جاتا ہے ...... اور آخر کار خود ہی منزل !! گویا مسافر جب اپنے سفر کے اختتام کو پہنچتا ہے تو خود کو بصورتِ منزل پاتا ہے ...... بلاشبہ خود کو پانا ہی منزل پانا ہے۔ دراصل مسافر کے چلنے سے اور پھر چلتے رہنے سے راستہ بن جاتا ہے۔ اُس کی ثابت قدمی اسے وہ نورِ بصیرت عطا کرتی ہے جس میں وہ اپنے لئے راستہ تلاشتا ہے ...... اور پھر خود ہی اسے تراشتا ہے ...... اور اسی تراش خراش میں اُس کے نقوشِ قدم دوسروں کیلئے نشاناتِ منزل بن چکے ہوتے ہیں۔

مسافر' سفر اور منزل کی تکون میں ایک زاویے سے دیکھا جائے تو مسافر عروج کرتا ہوا منزل کے قریب پہنچتا ہے...... اور دوسرے زاویے پر غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ منزل نزول کرتی ہوئی مسافر کی جانب بڑھ رہی ہے ۔ گویا مسافر جب سفر شروع کرتا ہے تو وہ منزل کے قریب نہیں ہوتا' بلکہ منزل اُس کے قریب ہونے لگتی ہے۔ ایسے میں جب منزل مسافر کے قریب ہونے لگے تو مسافر کے ذمہ جو عمل باقی رہ جاتا ہے...... وہ انتظار ہے ......بس انتظار...... بلکہ حُسنِ انتظار!! بقول مرشدِ صادق حضرت واصف علی واصفؒ ......''حُسنِ انتظار ہی حُسنِ عمل ہے''......اور انتظار ایک بہت بڑا عمل ہے...... کہ کوئی کم ہمت اور کم نیت مسافر اِنتظار کے آسن نہیں بیٹھ سکتا۔ حُسنِ اِنتظار حاصل ہو جائے تو منزل کا حُسن گھر بیٹھے آشکار ہونے لگتا ہے...... سچ کہا' سچ کہنے والے نے......

ہم اپنے آپ میں ہی تجھے ڈھونڈتے رہے
تیرے مسافروں کا سفر گھر میں کٹ گیا



اُمید، انتظار اور رحمت

انتظار صرف وہی کر سکتا ہے ...... جو پُر اُمید ہو۔ انتظار کا دامن اُمید سے وابستہ ہے۔ جس کا دامنِ خیال اُمید سے پُر ہے' اُس کا دامنِ حیات رحمت سے پُر ہے۔ قوموں کی زندگی میں انتظار وہی کام کرتا ہے جو ماؤں کی زندگی میں نو ماہ ...... جو انتظار کا حمل برداشت کر لیتا ہے' وہ رحم اور رحمت کا حامل ہو جاتا ہے۔ جب تک ہم حالتِ انتظار میں رہتے ہیں' وقت ہماری تعمیر میں مصروف رہتا ہے۔ انتظار سے دست بردار ہونا اپنے ہاتھ کاٹ لینے کے مترادف ہے۔ انتظار سے منہ موڑنا رحمت سے منہ موڑنا ہے۔ انتظار ترک کرنا مایوس ہونے کا اعلان کرنا ہے ...... اور مایوس ہونا خیال کی خودکشی ہے۔ انتظار ...... فکرِ راست ہے ...... مایوسی' فکرِ معکوس! راست فکر ...... راستی کی طرف لے کر جاتا ہے ...... اور فکرِ معکوس' گمراہی کی طرف!

دنیائے فکر و عمل میں ایک طرزِ عمل آدمؑ کا ہے ...... اور ایک طرزِ فکر ابلیس کا۔ آدم اور ابلیس کے درمیان پہلا فکری نزاع' جس عنوان سے برپا ہوتا ہے ...... وہ رحمت کا انتظار اور رحم کی اُمید ہے۔ شیوۂ آدم ...... توبہ' اُمید اور اپنے ربّ کی رحمت کا انتظار ہے ...... تمام تر کوتاہیوں کے باوجود ...... اور شیوۂ ابلیس' مایوسی ہے ...... تمام تر عبادتوں کے باوجود! ابلیس اُمید کا چراغ گل کرتا ہے' انتظار کی شمع بجھانے کے درپے ہوتا ہے ...... اور رحمت سے

مایوس کرنے کی تدبیر میں رہتا ہے۔

اُمید عین عمل ہے..... مایوسی' بے عملی۔ جدوجہد کی ابتدا مایوسیوں کے خلاف لڑنے سے ہوتی ہے۔ رحمت کا منتظر ہونا ایک فطری طرزِ عمل ہے اور مایوس ہونا ایک غیر فطری طرزِ فکر۔ فکر..... عمل کی بنیاد ہے..... اس لیے فطری طرزِ فکر' فطری اعمال کی طرف راغب کرتی ہے اور غیر فطری طرزِ فکر' غیر فطری زندگی کی طرف۔ یاد رکھنا چاہیے ..... انسان کی فطرت انسانیت ہے..... حیوانیت نہیں۔ تہذیب کے سفر کی ابتدا فکر کی تہذیب سے ہوتی ہے۔ دراصل ترقی یافتہ ہونے سے بہت پہلے انسان کیلئے اصلاح یافتہ ہونا ضروری ہے ..... بصورتِ دیگر انسانی تہذیب کی صورت ہی بگڑ جاتی ہے..... اور پوری نوعِ انسانی کی سلامتی کو خطرہ لاحق ہو جاتا ہے۔

اُمید سے ہونا ایک فطری عمل ہے۔ فطرت اُمید کو بارآور کرتی ہے..... اور مایوسی کی جڑ کاٹ دیتی ہے۔ مایوس ہونا رحمت سے منقطع ہونا ہے۔ جو اُمید اور انتظار سے محروم ہوتا ہے..... رحمت سے منقطع ہوتا ہے..... دشمن دین و دل ہوتا ہے..... اور بے شک وہ جڑ کٹا ہوتا ہے۔ زمینی ''حقائق'' کا سبق دینے والا آسمانی اسباق بھول چکا ہے..... وہ یہ بھول جاتا ہے کہ زمین کا زیرِ آسماں ہونا اَز خود ایک آسمانی حقیقت ہے۔ مایوس کن زمینی حقائق..... حق اور حقیقت سے دُور کر دیتے ہیں..... انسان کے سفر کو بوجھل کر دیتے ہیں..... اور اُسے زمین سے اٹھنے سے پہلے ہی زمیں بوس کر دیتے ہیں۔ انسان اور حیوان میں ایک فرق یہ بھی ہے کہ حیوان زمینی حقائق کے مطابق زندگی بسر کرتا ہے اور انسان آسمانی حقائق کے مطابق۔ انسانی تہذیب کا تمام تر سفر زمینی حقائق کی پردہ پوشی کا نام ہے اور آسمانی حقائق کی پردہ کشائی کا۔ درحقیقت زمین پر چلنے والے انسان کو سفرِ آسمان کا درپیش ہے۔ فرشی حقائق بعض اوقات فرضی حقائق بھی ہوتے ہیں۔ اگر فرض کر لیا جائے کہ انسان ایک حیوان

ہے تو حیوانی جبلتوں کا تمام قصہ آخر حقائق ہی کہلائے گا...... اور ان کا قصہ گو...... دانش ور! !زمینی حقائق کے قصیدہ گو دراصل سٹیٹس کو (status quo) کے قصیدہ گو ہوتے ہیں...... اور انقلاب کے ہجو گو...... وہ سینۂ ہستی میں پلنے والے کسی انقلاب کی پیش گوئی نہیں کر سکتے۔

اگر فطرت میں دو اور دو چار' کا قانون ہی رائج ہوتا تو ماضی میں انسان کسی انقلاب سے دو چار نہ ہوتا...... جبکہ حال یہ ہے کہ ماضی میں نوعِ انسانی کم از کم ایک لاکھ چوبیس ہزار مرتبہ انقلابات سے دو چار ہو چکی ہے۔ کسی مضطرب قلب کا منقلب ہو جانا بھی انقلاب ہے...... کسی قوم کا اصلاح پکڑ نا بھی انقلاب ہے...... اور اصلاح اور مصلح سے رُوگردانی کی پاداش میں عذاب کی پکڑ میں آ جانا بھی انقلاب۔ ماضی سے بے بہرہ حال' حقیقتِ حال سے اندھا ہوتا ہے۔ مذہب، اخلاق اور تہذیب...... سب ماضی کا عطیہ ہے۔ اگر ماضی کو فراموش کر دیا جائے تو حال میں لائبریریوں کے کئی ہال خالی ہو جائیں۔ حال' ماضی کو فراموش نہیں کرتا...... حال' ماضی کا استقبال کرتا ہے۔ حال...... بہرحال ماضی سے بے نیاز نہیں رہ سکتا۔ طاقت کا کلیہ اگر ماضی میں ٹوٹتا رہا ہے تو حال میں بھی سلامت نہیں رہ سکتا۔ ابابیل آج بھی ہیں...... اور ہاتھی آج بھی موجود ہیں...... اگر ہاتھی بدمست ہیں تو ابابیل بھی سرمست ہو سکتے ہیں۔ بس! جب بے بس ہو جاؤ تو ابابیلوں کا انتظار کرو۔

انتظار...... بہر طور فرض ہے اہلِ ایمان پر...... اور یہ سنت ہے جناب عبدالمطلبؓ کی! رسول رحمت ﷺ کی محبت میں سرشار اُمت' رحمت کے انتظار میں کیوں نہ رہے !!

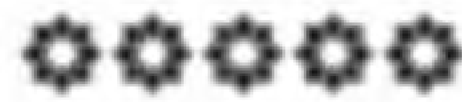
پاکستان کا بننا...... ایک پاک آستاں کا بننا ہے۔ اجودھن کو پاک پتن بنانے والے پاکستان ہی تو بنا رہے تھے۔ یہ پاک آستاں...... پاک لوگوں نے بنایا ہے...... یہاں وہی رہ پائے گا جو پاک ہو جائے گا...... ہر غرض سے پاک...... ہر تعصب سے پاک...... فرق اور فرقے سے پاک...... پاک لوگوں کا پاکستان!! جنھوں نے یہ پاک آستان بنایا ہے' وہ

اسے چھوڑنے والے نہیں ...... اور جو اِس آستان کا قصہ پاک کرنا چاہتے ہیں' انہیں بھی نہیں چھوڑنے والے!! پاکستان ...... اللہ والوں نے بنایا ہے ...... اس لیے پاکستان شعائراللہ میں شامل ہے۔ شعائراللہ کی قدر نہ کرنے والے راندۂ درگاہ ہوں گے۔ اَساسِ پاکستان پر اِیقان ہمارے اِیمان کا حصہ ہے۔ پاکستان ...... ہمارے لیے اِسلام کا چھٹا رُکن ہے ...... اِس رُکن کی سلامتی' باقی اَرکان کی سلامتی کی ضمانت ہے۔

بس ...... چلتے چلیں ...... اور ...... اُمید اور انتظار کے دیئے میں اپنے حصے کا تیل ڈالتے چلیں ...... بعد میں آنے والوں کا راستہ روشن رہے گا ...... اور اپنا ...... مابعد!!

سچ کہا مرشدِ صادق نے ...... ''حسنِ انتظار ہی حسنِ عمل ہے'' ...... اور ......

آنے والے کمال کے دن ہیں
عظمتِ ذُوالجلال کے دن ہیں



خیال ...... قوتِ عمل ہے!!

(دلِ ہر قطرہ)

واصفیات اور پاکستانیات

زمانہ طالب علمی میں خلیل جبران بہت حیران کیا کرتا تھا...... یہاں زمانہ طالب علمی کہنے سے مراد یہ نہیں کہ یہ زمانہ ختم ہوگیا ہے...... طالب کیلئے نہ زمانہ ختم ہوتا ہے، نہ علم ...... کیونکہ زمانہ ''وہ'' خود ہے......اور علم بھی ''وہ'' خود ہی...... بذاتِ خود......!!

ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ اس زمانے میں ہر اخبار کا ادبی صفحہ چبا جانا ہم اپنے لیے فرضِ عین تصور کرتے تھے......۱۹۸۴ء میں ''نوائے وقت'' کے ادبی صفحے میں آپؒ کا پہلا کالم پڑھا......عنوان تھا ''محبت'' ...... فارسی کا ایک شعر بچپن میں پڑھا تھا جس کا مفہوم کچھ یوں تھا کہ محبت صرف دیکھنے ہی سے نہیں ...... سننے سے بھی ہو جاتی ہے ...... یہاں ''محبت'' پڑھ کر ایک نیا مفہوم کھلا ...... کہ محبت صرف دیکھنے اور سننے ہی سے نہیں' پڑھنے سے بھی ہو جاتی ہے۔ بہر حال محبت کے مضمون میں ایسے ڈوبے کہ تا حال باہر نہیں نکل سکے۔ بات خلیل جبران سے شروع ہوئی تھی ...... محبت کی تحریر پڑھ کر اِحساس ہوا کہ اس کے ایک ایک جملے میں کئی کئی خلیل جبران ڈوبے ہوئے ہیں۔ صاحبِ تحریر سے ملاقات کا اشتیاق پیدا ہوا...... دو تین خطوط کا تبادلہ ہوا...... جو بعد میں ملاقات اور پھر سوال اور جواب کے سلسلے کی صورت میں تا دمِ آخر جاری رہا اور تا ایں دم جاری ہے ...... کہ سلسلہ تو جاری رہنے کیلئے ہی جاری ہوتا ہے۔ درحقیقت سوال اور جواب ہی علم کی حقیقی ترسیل کا ذریعہ ہے۔ سوال کرنے

والا سوال کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے پیمانۂ ظرف کی وسعت بھی بتا دیتا ہے...... اور یوں سوال کے مطابق جواب ملنے سے کاسۂ ظرف کے چھلکنے کا احتمال نہیں رہتا۔ ولایت **سلونی سلونی** کا تسلسل ہے۔

واصف صاحبؒ کو علمی ادبی حلقوں میں عام طور پر صوفی دانشور کے طور پر جانا جاتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں' وہ صوفی نہیں' صوفی گر تھے۔ آپؒ نے دانشوری نہیں' دانش گری کی ہے...... ہاں! ولی کہیں' یا ولی گر...... دونوں صورتوں میں بات سمجھ میں آجاتی ہے۔

قرآن کریم میں ارشاد ہے **ومن احیاھا فکانّما احیاالنّاس جمیعا** جس نے کوئی ایک زندہ کیا' اس نے گویا جمیع انسانیت کو زندہ کیا...... یہاں کثرت میں وحدت اور وحدت میں پھر کثرت کا اشارہ کتنا حسین اور بلیغ ہے...... سوچنے والی بات یہ ہے کہ یہاں زندہ کرنے سے کیا مراد ہے۔ زندگی کے مفہوم کا جائزہ نئے سرے سے اور نئے انداز میں لینا پڑے گا...... ظاہر کے علاوہ بھی زندگی کی پرتوں کو دریافت کرنا پڑے گا۔ کیا زندگی صرف سانس کی ڈوری چلنے کا نام ہے...... اور موت اِس ڈوری کے کٹ جانے کا نام؟...... جو دوسروں کو زندہ کرتا ہے' اس کی اپنی زندگی کا کیا عالم ہوگا؟...... اور پھر یہ بھی کہا گیا کہ جواللہ کی راہ میں مارے جائیں' اُنہیں مردہ نہ کہا جائے...... وہ اپنے ربّ کے ہاں سے رزق پاتے ہیں...... وہ زندہ ہیں مگر تمہیں اُن کی زندگی کا شعور نہیں...... یعنی زندگی کی ایک حالت ایسی بھی ہے جس کا شعور حاصل کرنا پڑتا ہے۔ اُس کی راہ میں مارے جانے والے شہید ہیں اور شہید زندہ ہوتا ہے...... مطلب یہ ہوا کہ شہادت دینے والا زندگی کی حالت میں ہے۔...... شہادت گہِ اُلفت بھی ایسی جا ہے' جہاں زندگی کا سلسلہ منقطع نہیں ہوتا...... خواہ سانس کا تسلسل منقطع ہو چکا ہو۔ شہادت دینے والے کو اپنے ربّ کے ہاں سے رزق ملتا ہے۔ رزق کی کئی قسمیں ہیں۔ تجرید کی دنیا میں اعلیٰ ترین رزق کو خیال کہا جاتا ہے...... اُسے

خیال پہنچ بھی رہا ہے...... اور وہ اس خیال کو تقسیم بھی کر رہا ہے...... یعنی عالمِ غیب میں بھی وہ ینفقون پر عمل پیرا ہے...... ظاہر ہے زندگی کسی عمل کا بھی نام ہے...... اگر وہ زندہ ہے تو کسی عمل پر بھی یقیناً عمل پیرا ہے!! کیا ''مارے گئے'' کا اطلاق صرف وہیں ہوتا ہے' جہاں سامانِ موت کے ضمن میں کوئی آلۂ قتل برآمد ہو جاتا ہے۔ طبی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو طبعی موت بھی دراصل غیر طبعی ہی ہوتی ہے۔ جو فطری موت مرتے ہیں ان کیلئے قوانینِ فطرت ہی آلۂ قتل بن جاتے ہیں۔ پھر وہ لوگ کون ہیں کہ اس طرح مارے جاتے ہیں کہ مرنے کے بعد بھی زندہ ہیں۔ اب اس کے راستے پر غور کرنے کی ضرورت ہے...... جو ''اُس کے راستے'' پر ہے' وہ زندہ ہے۔ جو اُس کے راستے پر مستقیم کھڑا ہے' وہ زندہ ہے...... یعنی جس نے اس کے راستے پر استقامت اختیار کی' وہ اس راستے کے مستقیم ہونے کی شہادت دے رہا ہے...... وہ زندہ ہے۔ پس جو اُس کے راستے پر ہے...... وہی راستی پر ہے...... اور وہی زندہ ہے۔ گویا حق پرست زندہ ہے اور حق گریز' مردہ۔ حاصل یہ ہوا کہ زندگی کی اصل' شہادت ہے' گواہی ہے...... حق کی شہادت...... اور یہ بھی کہ جو شاہد ہوتا ہے' اصل میں وہی مشہود بھی ہوتا ہے۔

دراصل دین ایک معاملہ ہے...... بندے اور ربّ کے درمیان معاملہ...... اور بندے اور ربّ کے درمیان کا سارا معاملہ ربّ کے بندوں کے درمیان ہی سے ہو کر گزرتا ہے...... بذریعہ معاملات۔ اگر یہ ''معاملہ بندی'' نہ رہے تو باقی محض تک بندی رہ جاتی ہے...... رسوم ورواج رہ جاتے ہیں...... اور یہی بت پرستی بھی ہے۔ رُوح نکل جائے تو ظاہر ہے پیچھے بُت رہ جاتا ہے۔ ظلم یہ ہوا کہ دین کے معاملے میں سہل پسندوں نے معاملات کو ثانوی حیثیت دے دی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ معاشرے میں اخلاقیات کا پیمانہ گر گیا...... انسان کی قیمت لگتی رہی اور قدر گرتی رہی۔ اِس بگاڑ کی اصلاح کیلئے معاشرے میں ایک صحت مند اور توانا

اِخلاقیات کو عام کرنے کی ضرورت ہے۔ اِخلاقیات کی ترویج کیلئے ہمیں تعلیماتِ واصفؒ کو عام کرنے کی ضرورت ہے...... یعنی دین کی روح کو عام کرنے کی ضرورت ہے۔ تعلیماتِ واصفؒ کی صورت میں ہمارا کام کتنا سہل ہوگیا ہے کہ اِخلاقیات اور معاملات کی تعلیم کا پورا عطر ہمیں مقطر اور معطّر حالت میں میسر ہے...... چھوٹے چھوٹے اقوال کی شکل میں دین کی اصل روح اپنی مکمل صورت میں موجود ہے۔

تعلیماتِ واصفؒ میں پاکستان اور پاکستانیت کا حوالہ ایک روحانی سلسلے کی حیثیت سے موجود ہے۔ اُن کے نزدیک پاکستانیت ایک سلسلۂ طریقت ہے۔ ''دل دریا سمندر'' میں ''صاحبِ حال'' مضمون میں آپؒ بیان کرتے ہیں:

''جس طرح ہمارے ہاں طریقت کے سلاسل ہیں' چشتی' قادری' نقشبندی' سہروردی وغیرہ اور ہر سلسلہ کا کوئی بانی ہے' اسی طرح قائدِ اعظمؒ سے ایک نئی طریقت کا آغاز ہوتا ہے، اور وہ طریقت ہے ''پاکستانی''۔ اس طریقت میں تمام سلاسل اور تمام فرقے شامل ہیں۔ ہر ''پاکستانی'' پاکستان سے محبت کو ایمان کا حصہ سمجھتا ہے۔ ہمارے لیے ہمارا وطن خاکِ حرم سے کم نہیں۔ اقبالؒ نے مسلمانوں کو وحدتِ افکار عطا کی' قائدِ اعظمؒ نے وحدتِ کردار۔ آج اگر قوم میں کوئی انتشارِ خیال ہے تو اس لیے کہ وحدتِ عمل نہیں۔ وحدتِ فکر و عمل عطا کرنا وقت کے صاحبِ حال کا کام ہے۔ صاحبِ حال بنانے والی نگاہ کسی وقت بھی مہربانی کرسکتی ہے۔ وہ نگاہ ہی تو مشکل کشا ہے۔ نہ جانے کب کوئی صاحبِ حال قطرۂ شبنم کی طرح نوکِ خار پہ رقص کرتا ہوا آئے اور قوم کے دل و نگاہ میں سماتا ہوا' وحدتِ عمل پیدا کرجائے، اور ایک بار پھر......

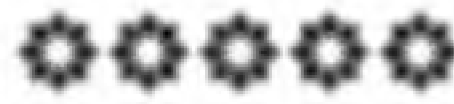
''ہاتھ آئے مجھے میرا مقام اے ساقی''

قوموں کی زندگی میں صدی' نصف صدی کچھ زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔ آپؒ کے

بقول ''ملک کے چار صوبے چاروں عناصر کی طرح ابھی ظہورِ ترتیب میں ہیں''۔ ''واصفیات'' کی صورت میں ہمارے پاس ''پاکستانیات'' کیلئے ایک فکری اساس موجود ہے۔ یہ فکری اساس ہمیں بحیثیتِ قوم متحد کرسکتی ہے...... متحد رکھ سکتی ہے۔ اِس سے فائدہ اٹھانے کی ضرورت ہے۔

خطۂ پنجاب اس لحاظ سے زرخیز بھی ہے اور مردم خیز بھی ...... کہ بیسویں صدی کے آغاز میں ہمیں اقبالؒ ملے اور اختتام پر واصف علی واصفؒ۔ حضرتِ اقبالؒ سے اِیران والوں نے فائدہ اُٹھایا۔ کیا بحیثیتِ قوم حضرتِ واصف علی واصفؒ سے چین والے فائدہ اُٹھالیں گے! .... کیا عجب کہ وہ صنعتی اِنقلاب کے ساتھ ساتھ ایک روحانی انقلاب بھی برپا کردیں......!!

(حلقۂ ترجمانِ ادب میں حضرت واصف علی واصفؒ کے حوالے سے برپا کی گئی ایک ادبی نشست میں پڑھا گیا)



غصہ ایک زہر ہے......اور اِس کا تریاق، خاموشی !!

(دلِ ہر قطرہ)

وعدے اور وعید!!

وعدوں کی وجہ سے انسانی زندگی میں ربط اور ضبط قائم ہے۔ اگر ضبط نہ رہے تو کوئی ضابطہ بھی نہیں رہتا۔ فرد کا افراد سے اور ایک ملک کا دوسرے ملکوں سے رابطہ اسی ربط و ضبط سے قائم ہے۔ وعدوں کو توڑنے کا محرک فقط طاقت کا غرور ہوتا ہے۔ طاقت ور اور مغرور ...... فرد ہو یا ملک ...... خود کو طاقت کے زعم میں وعدے کی پابندی سے مبّرا سمجھتا ہے۔ وعدوں میں دراڑ رونما ہو جائے تو امن عالم میں دراڑ پڑ جاتی ہے ...... اور یہ دراڑ ozone layer میں شگاف کی طرح بڑھتی چلی جاتی ہے۔ تہذیب کا جوہر ...... طاقت کی تلوار کو نیام میں رکھنا ہے۔ جب وعدوں کی پاسداری قائم نہیں رہتی تو طاقت کی تلوار نیام سے باہر نکل آتی ہے۔ اگر طاقت کے زعم میں، طاقت ہی کو قانون کا درجہ دے دیا جائے تو قانون طاقت کیسے بن پائے گا! طاقت کا قانون یہ بھی ہے کہ قانون کی تشریح میں من مانی کی جائے۔ جب تک قانون طاقت کی من مانی کو فتح نہیں کر لیتا، انسانی شرف شکست خوردہ رہے گا۔ خوشحال اور پُر امن معاشرہ وہی ہوتا ہے جہاں قانون کی طاقت کو تسلیم کیا جاتا ہے۔ طاقت کی اخلاقیات اور ہے ...... اخلاقیات کی طاقت اور ......!! دراصل جب تک خود کو کسی اِخلاقی طاقت کے سامنے جواب دہ نہ سمجھا جائے، وعدہ وفا کرنا مشکل نظر آتا ہے۔

تہذیب کی چادر وعدوں کے تانے بانے سے بنی جاتی ہے۔ وعدہ خلافی دراصل بدتہذیبی کی ایک انتہائی شکل ہے۔ انسانی معاشرے کی تشکیل میں وعدوں کی وہی اہمیت ہے،

جو کسی عمارت میں اینٹوں کے درمیان سیمنٹ کی ہوتی ہے۔ وعدوں کی جس قدر پاسداری ہوگی' معاشرے کی شکل اُسی قدر حسین ہوتی چلی جائے گی۔ جہاں وعدوں کی قدر نہیں ہوتی' وہ معاشرے کھوکھلے ہو جاتے ہیں ...... اُن کی شکل بدشکل ہو جاتی ہے۔ امن کی بنیاد وعدوں کی پابندی ہے اور بدامنی کی بڑی وجہ لوگوں کا اپنے وعدوں کی پاسداری سے انحراف ہے۔ امن کیا ہے ...... اور بداُمنی کیا ہے ......؟ اُمن طاقت کے عدم استعمال کا ایک وعدہ ہے ...... اس وعدے کو وفا نہ کرنا ایک جفا ہے ...... اور اِس جفا کی سزا بداُمنی ہے۔

ہم میں سے ہر شخص کسی وعدے کا پرچم اٹھائے ہوئے ہے ...... اور اِس پرچم کا رنگ سفید ہے۔ جب سفید پرچم سرنگوں ہو جائے تو سر کٹنے لگتے ہیں ...... لہو بہنے لگتا ہے ...... زمین سرخ ہو جاتی ہے۔ بس سمجھنے کیلئے اتنی سی بات کافی ہے کہ جب انسانوں کا خون سفید ہو جائے تو دھرتی کا رنگ سرخ ہو جاتا ہے۔ روزِ ازل فرشتوں نے یہی خدشہ ظاہر کیا تھا کہ انسان کو زمین پر اختیار دے کر بھیجا جا رہا ہے، اور اس کی سرشت یہ بتاتی ہے کہ یہ زمین پر خون ریزیاں کرے گا۔ خالق نے کہا ''جو میں جانتا ہوں' وہ تم نہیں جانتے''۔ غالباً فرشتے خلوت خانۂ عہدِ الست کے محرم نہیں تھے۔ خالق نے اسی وعدۂ الست کی بنا پر اختیار کا تاج آدم کے سر پہ سجایا اور اسے خلافتِ ارضی کے سفر پر روانہ کر دیا۔ ابن آدم کی تاریخ ...... ورق در ورق ...... گواہی دے رہی ہے ...... جو لوگ اپنے خالق کے ساتھ عہد و پیان نبھاتے رہے' وہ امن میں رہے، امن کا باعث رہے ...... امن کے پیامبر رہے۔ اس کے برعکس جنھوں نے اپنے ربّ سے کیے ہوئے عہد پامال کیے' وہ زمین پر خون ریزیاں کرتے ہوئے پائے گئے۔ بنی آدم اپنے رویوں میں شروع ہی سے دو قبیلوں میں تقسیم ہو گئے۔ بنی قابیل اور بنی ہابیل !!! قابیل اور اُس کے قبیل کے لوگ قتل و غارت کرتے رہے' اور خود غارت ہوتے رہے ...... ہابیل اور اُس کے طرزِ فکر پر چلنے والے لوگ متحمل رہے، قربانیاں

دیتے رہے، اپنے اپنے عہد ناموں کی حفاظت کرتے رہے...... اور سرخ رُو ہوتے رہے!!!

اگر غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ ہر شخص کسی عہد کی بنا پر ایک عہدے پر فائز ہے...... یہ عہدہ اُس عہد کی پاسداری کا تقاضا کرتا ہے۔ کوئی افسر ہو یا کلرک' آجر ہو یا اجیر' دکاندار ہو یا خریدار...... ہر سطح پر' ہر شخص ایک دوسرے کے ساتھ وعدوں کے بندھن میں بندھا ہوا ہے۔ کوئی شخص کبھی اتنا غریب نہیں ہوا کہ وہ کسی کی مدد نہ کر سکے...... اور کوئی شخص کبھی اتنا امیر نہیں ہوا کہ وہ کسی کی مدد سے بے نیاز ہو جائے۔ ہر شخص اپنی اپنی جگہ پر اپنے وعدوں کا پابند ہو جائے تو نظام کامیاب ہو جاتا ہے۔ ایک جہاز کی کامیاب اور باحفاظت پرواز صرف پائلٹ کا کمال نہیں بلکہ پورے نظام کے مربوط رابطوں اور ربط وضبط کا نتیجہ ہوتا ہے۔ ذمہ داری نبھانے سے مسئلے حل ہوتے ہیں...... ایک دوسرے پر ڈالنے سے بڑھتے ہیں۔ وزیرِ اعظم نے کہا کہ ہم نے اپنے گھر کو درست کرنا ہے۔ اپنے گھر کو خود ہی درست کیا جاتا ہے...... اپنی اپنی جگہ خود کو درست کرنے کے بعد!!! قطبِ ارشاد حضرت واصف علی واصفؒ فرماتے ہیں: ''کسی مکان کو آگ لگی ہوئی ہو تو آگ لگنے کی وجوہات پر ریسرچ کرنے سے پہلے آگ کو بجھانا فرض ہے''

وزیرستان میں لگی ہوئی آگ کی داستان بھی عجب ہے ...... زمین پر طالبان ہیں اور آسمان پر ظالمان...... اور اِن دونوں کے درمیان...... پسنے کیلئے پاکستان...... اور اہل پاکستان!! کوئی ملک عظیم نہیں ہوتا...... اسے اس ملک میں رہنے والے عظیم بناتے ہیں...... عظمت سب سے پہلے رویوں میں آتی ہے...... پھر داستانوں میں! دنیا بھر میں کوئی ایسا ملک نہیں ملے گا...... ایسا فراخ دل ملک...... جہاں دانشور کہلوانے والے اس ملک کی اساس پر بیدادضرب لگائیں اور جواب میں داد بھی وصول کریں۔ کسی ملک کی اساس اس کا نظریہ ہوتا ہے۔ ہر ملک کسی نہ کسی نظریے پر ہی بنتا ہے۔ اَلل ٹپ کوئی عمارت نہیں بن پاتی' ملک کیسے

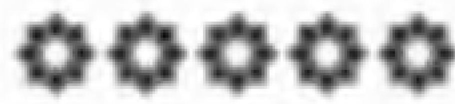
بن سکتے ہیں !ایک معمولی نوکری کیلئے درخواست دینا ہوتو ہم اپنے CV میں بڑے بولڈ الفاظ میں لکھتے ہیںAIMS & OBJECTIVES اور آخر میں لکھواتے ہیں MISSION STATEMENT۔بس لے دے کر ایک ملک ہی رہ گیا ہے جس کیلئے قرار دادِ مقاصد اور نظریے کا لفظ گفتگو میں لے آئیں تو ''روشن خیال'' حلقوں میں موردِ الزام ٹھہرایا جاتا ہے...... رجعت پسندی اور انتہا پسندی کا لیبل چسپاں کر دیا جاتا ہے۔

انسانی شعور کا اِرتقاء تجسیم سے تجرید کی طرف ہے۔ پہلے پہل ملکوں کی سرحدیں فاتح کی طاقت کی حد کو ظاہر کرتی تھیں۔ بعدازاں رنگ، نسل اور زبان کی بنا پر جغرافیائی حد بندیاں ہونے لگیں۔انسان کے سیاسی اور سماجی ارتقاء کے سفر میں ایسا وقت بھی آیا' جب وہ ظاہری حد بندیوں کا قائل نہیں رہا۔نظریے کی بنیاد پر ملکوں کی تشکیل کی بنا پڑی۔ زمانہ بعید میں اس کی مثال سلطنتِ مدینہ کی تشکیل ہے...... اور زمانہ قریب میں اس کی مثال اشتراکی نظریہ کی بنیاد پر ملکوں کی تقسیم ہے۔ اشتراکی نظریہ محض ایک معاشی نظریہ تھا...... لیکن اس کی بنا پر ایک رنگ نسل اور زبان بولنے والے ایک دوسرے سے علیحدہ ہو گئے...... شمالی اور جنوبی کوریا،مشرقی اور مغربی جرمنی، چین اور تائیوان اسی نظریے کی بنیاد پر ایک سے دو ملک بن گئے...... یعنی دوقومی نظریہ مغرب میں ثابت ہوا پڑا ہے...... اور یہاں یار لوگ دوقومی نظریے کے بارے ابھی تک دو رائے رکھتے ہیں۔ اگر عمرانی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ نظریے کو مطعون کرنے والے خود کو خواہ ترقی پسند کہتے رہیں' درحقیقت رجعت پسند ہیں...... وہ انسانی شعور کے ارتقاء کے قائل نہیں !!

وعدہ بھی ایک abstract حقیقت ہے۔ abstract کا منکر' کنکریٹ ورلڈ میں فساد پیدا کر دیتا ہے۔ جو کسی abstract ورلڈ میں وفا نہیں کرتا' وہ جمالیاتی جوہر سے محروم ہے...... اور ایسے ہی بے لچک ''سائنسدان'' کنکریٹ ورلڈ میں ورلڈ وار

trigger کرنے کا سبب بنتے ہیں۔

منافق کی تین نشانیوں میں ایک اُس کا مسلسل وعدہ شکن ہونا ہے۔ گویا ایمان کا دعویٰ سجدوں سے زیادہ وعدوں کی کسوٹی پر پرکھا جاتا ہے۔ منافقت کی سزا ...... ہمیشہ کی مفارقت ہے۔ نفاق کا جہنم کفر سے زیادہ گہرا اور تاریک ہے۔ منافق کی سزا اِسی دنیا میں شروع ہو جاتی ہے۔ اُس کی عبادت بے ثمر جاتی ہے...... اسے دنیا میں عبادت مسلمانوں سے زیادہ کرنا پڑتی ہے اور عاقبت میں سزا کافروں سے زیادہ بھگتنا ہوتی ہے۔ دین اور دنیا دونوں جا' اُس کیلئے کہیں جائے امان نہیں۔ وعدے پورے نہ کرنے پر وعید ہے ...... بے ربط ہونے کی ...... بے سکون ہونے کی ...... اور بے امن ہونے کی!! اَمن کا سائبان گر جائے تو اِنسان گھر بیٹھے بے پردہ ہو جاتا ہے۔ بے امن ہونا ...... بے ردا ہونا ہے۔ غور کرنا چاہیے...... ہمیں مسلسل وعدہ خلافیوں کی سزا تو نہیں مل رہی! پارسائی کا دعویٰ ...... وعدوں کی پاسداری کے بغیر نامکمل ہے!!



دنیا' بے وفا ہے، اور آخرت' وفا شعار!

...... کیونکہ اس کے آنے کا وعدہ پکا ہے!!

(دلِ ہر قطرہ)

بیج بونے کا موسم!

بچپن میں سنا تھا اور بچپن میں سنا رہے ہیں۔ قدیم زمانے میں نوشیرواں عادل ایک گاؤں سے گزرا تو دیکھا' ایک بزرگ آدمی گڑھا کھود رہا ہے۔ بادشاہ نے پوچھا' کیا کر رہے ہو؟ اُس نے جواب دیا' آم کا درخت لگا رہا ہوں۔ نوشیروان' عادل ضرور تھا' محسنین میں سے نہ تھا۔ پوچھنے لگا' بابا! جب تک اس درخت پر پھل آئے گا' تم اُس وقت اِس دنیا میں نہ رہو گے، پھر آم کا پیڑ لگانا تمہارے کس کام؟ وہ مردِ دانا' بادشاہ کی نادانی سن کر مسکرایا اور اُسے احسان کا سبق دیتے ہوئے بولا، ''اے عادل بادشاہ! تو جانتا نہیں کہ ہمارے بزرگوں نے پیڑ بوئے اور اُن کا پھل ہم نے کھایا، اب ہماری باری ہے، آج ہم بیج بوئیں گے' کل ہمارے بچے اِس کا پھل کھائیں گے''۔ کل کا بیج آج بونا پڑتا ہے۔ جو قوم آج فصل نہیں بوتی' وہ کل بھوک کاٹے گی یا پھر ایک دوسرے کو کاٹے گی۔

زمانہ وہی رہتا ہے...... یعنی قدیم رہتا ہے...... زمانہ نہیں بدلتا' زمانہ بسر کرنے والے بدل جاتے ہیں۔ کہا گیا زمانہ ایک درسگاہ ہے۔ ہاں! زمانہ ایک قدیم درسگاہ ہے' اس میں وہی اسباق دہرائے جاتے ہیں، جو پہلے بھی دہرائے جا چکے ہیں، صرف سیکھنے والے اور سکھانے والے' کسی خانقاہ میں لنگر لانے اور کھانے والوں کی طرح گروہ در گروہ آتے اور جاتے رہتے ہیں۔ لنگر کے ساتھ ساتھ سبق بھی جاری رہتا ہے۔ جو سبق سیکھ نہیں

پاتا' وہ دوسروں کیلئے سبق بن جاتا ہے۔

اِحسان کا نصاب انصاف سے کہیں بڑھ کر ہے۔ انصاف صرف حال کو تحفظ دیتا ہے، احسان مستقبل کو محفوظ کر دیتا ہے۔ بے لوث خدمت ہو یا محبت' دونوں درجۂ اِحسان میں آتے ہیں۔ جس اِنصاف کے خمیر میں اِحسان کی دانائی اور بینائی نہ ہو' وہ قانون کی طرح اندھا ہو جاتا ہے۔ اندھا دھند انصاف غریبوں کی جھونپڑیوں اور امیروں کی کوٹھیوں کو ایک ہی بلڈوزر سے مسمار کرنے کا حکم دیتا ہے۔ احسان کی بصیرت سے محروم انصاف امیر اور غریب دونوں پر یکساں ٹیکس نافذ کرتا ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ امیر کے کچن کی صرف کراکری بدلتی ہے اور غریب کے گھر کے برتن بک جاتے ہیں۔ بعض اوقات ایک ظالمانہ نظام کو عدالتوں کے ذریعے قائم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور اِس ظلم کے قانونی تحفظ کا نام انصاف رکھ دیا جاتا ہے۔ جس مظلوم کو انصاف کیلئے وکیل ڈھونڈنے کی ضرورت پیش آجائے' اُس پر انصاف کے نام پر ایک اور ظلم ہو چکا ہوتا ہے۔ جہاں علاج، انصاف اور تعلیم کیلئے پیسے خرچ کرنے پڑ جائیں' وہاں غریب ہونے اور مظلوم ہونے میں فرق نہیں رہتا۔ جہاں صحت، تعلیم اور انصاف ایک کاروباری صنعت کا درجہ اختیار کر لے، وہاں استحصال کو خود بخود قانون کا درجہ حاصل ہو جاتا ہے۔ جس معاشرے میں اِنصاف کے حصول کیلئے عوام کو انتظار کی سولی پر لٹکنا پڑے' وہاں ظالم آزاد پھرتے ہیں اور مظلوم کچہریوں میں خوار پھرتے ہیں...... مظلوم اپنے حق میں فیصلہ سننے سے پہلے ہی گویا ایک سزا بھگت چکے ہوتے ہیں۔ جہاں پیسہ ایک زرِضمانت ہو' وہاں غریب کیلئے انصاف کی کیا ضمانت؟

انصاف حقوق کے تحفظ کا ذکر ضرور کرتا ہے لیکن عملی طور پر وہ اسی قانون کی حفاظت کرتا ہے' جس قانون کے تحفظ کی قسم اُس نے اُٹھا رکھی ہوتی ہے۔ وہ گلشن کے تحفظ کی بجائے' گلشن کاروبار کے تحفظ پر مامور ہے۔ انصاف عدل نہیں' عدل کی نقل ہے۔ انصاف کا

شعور تنصیف تک ہے' اِس لیے یہ عدل پر ایک خطِ تنسیخ بھی ہے۔ منصف ہونے میں اور عادل ہونے میں فرق ہوتا ہے...... اور یہ وہی فرق ہے' جو ذہین ہونے اور دانا ہونے میں ہوتا ہے۔ عدل کرنے کیلئے سب سے پہلے اپنی ذات میں عادل ہونا پڑتا ہے۔ گویا عادل وہ ہے' جو تزکیۂ نفس کا حامل ہو...... اور تصفیۂ قلب پر عامل ہو۔ عدل قانونِ فطرت ہے اور فطرت کی آواز تن سے نہیں' باطن سے سنی جاتی ہے۔ باطنی طور پر ہمہ تن گوش ہوئے بغیر ہم فطرت کی سرگوشی نہیں سن سکتے۔

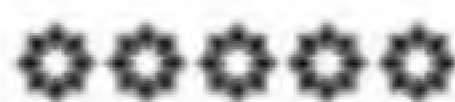
عدل عین فطرت ہے...... کہ ہر شئے کو اُس کے عین فطری مقام پر رکھنے کا نام عدل ہے۔ نظامِ فطرت میں بنی آدم کو ایک مقامِ تکریم پر فائز کیا گیا ہے۔ اس لیے انسان کو مقامِ اِکرام پر رکھ کر ڈیل deal نہ کرنے والا عدل نہیں کر سکتا۔ عدل نہ کرنا حکم عدولی ہے۔ تکریمِ انسانیت کے تصور سے محروم شخص ہر حال میں ظالم ہوگا...... خواہ وہ عبادت گاہوں کے دالانوں میں پایا جائے یا حکومت کے ایوانوں اور بالا خانوں میں! دراصل پیسے اور مرتبے میں اتنی طاقت نہیں ہوتی کہ وہ کسی انسان کے مقام کو بلند کر سکے۔ دولت اور حکومت کے مرتبے کی وجہ سے کسی کو بلند مقام سمجھنے والا خود کسی مقام کا حامل نہیں ہوتا۔ عادل وہ ہے جس کی نظر میں اِنسان کا مقام بہرطور اَرفع ہو اور پیسہ اپنی طاقت سمیت ایک دوسرے تیسرے درجے کی ترجیح ہو۔ کسی ساہوکار کی دولت کے تحفظ کیلئے ایک مقروض غریب کو عدالت کے کٹہرے میں کھڑا کرنا توہینِ انسانیت کا باب رقم کرنا ہے۔ قانون کی بالادستی کے نام پر اِنسان کو گرانے کا تصور بجائے خود تشریح طلب ہے۔

ظلم کی اندھیری رات صرف یہ بتاتی ہے کہ کتنے زیادہ چراغ جلانے کی ضرورت ہے۔ روشنی اِحسان کی ہوتی ہے۔ اِحسان کے چراغ ہی چراغاں کرتے ہیں۔ اُمید اور روشنی کے باب میں دیئے سے دیا جلتا ہے۔ وگرنہ انصاف تو یہی ہے کہ جس نے تمہارا دیا

بجھایا' تم اُس کا بجھا دو۔ اِنصاف کے نام پر اندھیرا پیدا کرنے کا رویہ ہمیں اندھیر نگری میں لے جائے گا۔

یہ دَور اِحسان کے بیج بونے کا موسم ہے۔ آج کے دَور میں اِحسان کا عمل یہ ہے کہ اپنے حقوق کے جلسے خاموش کر دو اور دوسروں کے حقوق خاموشی سے' اِحسان جتلائے بغیر اَدا کر دو۔ آج جمع کرنے کا نہیں' تقسیم کرنے کا موسم ہے۔ آدھا تقسیم نہ کیا' تو سارا چھن جائے گا۔ ہمارے مال کی طرح ہماری عمر پر بھی زکوٰۃ واجب ہے۔ ہم میں سے ہر شخص اپنی ساٹھ سال کی اوسط عمر میں سے صرف ایک سال قوم کی خدمت کیلئے وقف کر دے۔ صرف ایک سال کی ریاضت ہے کہ قوم کی مانگ سنور جائے گی۔ ہر شخص یہ عہد کرے کہ وہ ایک سال کیلئے اپنا ذاتی مفاد بھول جائے گا اور صرف ملکی مفاد کیلئے کام کرے گا۔ اپنی ساٹھ سال کی زندگی میں سے صرف ایک سال بے غرض کام کرنے سے قوم کی ساٹھ سالہ خود غرضی کی تاریخ بدل جائے گی۔ بے غرض کام کرنے سے کوئی بھوکا نہیں مرے گا لیکن ملک سے بھوک ختم ہو جائے گی۔ روزہ رکھ لیا جائے تو فاقہ ٹل سکتا ہے۔

مبارک ہیں وہ لوگ جو خاموشی اور خود فراموشی کے عالم میں خدمت میں مصروف ہیں، وہی سچی عبادت کر رہے ہیں۔ خدمت کی عبادت کبھی رائیگاں نہیں جاتی۔ ایک حدیثِ پاک کے مطابق مخلوق' خدا کا کنبہ ہے۔ جو شخص خدا کے کنبے کی خدمت کرے گا' لازم ہے کہ وہ خدا کے حضور مقبولِ بارگاہ ٹھہرے۔ خدمت ایک عملی تصوف ہے۔ خاموش اِحسان' بولتی ہوئی رُوحانیت ہے۔ حضرت واصف علی واصفؒ فرمایا کرتے : ''اِس ملک کی خدمت' اِسلام کی خدمت ہے۔'' گویا پاکستان کی خدمت دراصل اہلِ پاکستان کی خدمت ہے اور اسلام کی خدمت کا مطلب مسلمانوں کی خدمت ہے۔



خدمت، عبادت اور تجارت!

خدمت عبادت ہے ...... شرط یہ ہے کہ دکھاوا نہ ہو۔ جس طرح دکھاوے کی عبادت، عبادت نہیں بلکہ منافقت ہوتی ہے، اسی طرح دکھاوے کی خدمت بھی خدمت نہیں، سیاست ہوتی ہے۔ خدمت خدا کے بندوں کی ہوتی ہے اور خدا کیلئے ہوتی ہے۔ خدمت کا مقصد اگر مخلوق خدا کی زندگیوں کو آسان کرنے کے علاوہ کچھ اور ہوگا تو اِس کا مقصود بھی خدا نہ ہوگا...... کچھ اور ہوگا!! دراصل جو ہمارا مقصود ہوتا ہے، وہی ہمارا معبود ہوتا ہے۔

غور طلب بات یہ ہے کہ خالقِ کائنات نے اتنی وسیع وعظیم، جسیم و بسیط کائنات صرف انسان کیلئے بنائی ہے۔ اس کائنات میں ہونے والے ہر واقعے کا مخاطب انسان ہے۔ اگر خالق کا مقصود انسان نہ ہوتا تو یہ کائنات ہمیشہ کیلئے صرف اس کے علم میں موجود ہوتی ...... باطن سے خارج میں ظہور پذیر نہ ہوتی! اس عالم وجود میں ہر شے انسان کیلئے پہلے سے بنی بنائی tailor made موجود ہے۔ پھلوں پر غور کریں، اُن کی ساخت پرداخت پر غور کریں، ایسا معلوم ہوتا ہے گویا انسان کے ہاتھوں میں تھما دینے کیلئے بنائے گئے ہیں۔ فرمایا گیا کہ پھلوں کو ہم نے اپنے ہاتھوں سے تخلیق کیا۔ کائنات ایک شجرِ حیات ہے اور اس شجرۂ حیات کا ثمر انسان ہے۔ کلیۂ حیات یہ ہے کہ ہر شجر کا منتہائے مقصود اُس کا پھل ہوتا ہے۔ اگر شجر اپنے ثمر تک نہ پہنچے تو بقائے حیات کو خطرہ لاحق ہو جاتا ہے۔ کلام مختصر یہ کہ انسان کائنات کا ثمر ہے، اگر ہم اس کی معاونت نہیں کر رہے تو کائنات کی غایت سے

گویا مغایرت کے مرتکب ہوتے ہیں۔ انسان ثمرِ حیات ہے ...... اگر ہم اِس کی زندگی کو آسان نہیں کر پا رہے' تو خود بھی ثمر بار نہیں ہو سکتے۔ گویا انسان کی خدمت درحقیقت کائنات کی غایت سے ہم آہنگ ہونے کا نام ہے۔ خالق کائنات جب کسی پر مہربان ہوتا ہے تو اسے اپنے بندوں کی خدمت پر مامور کر دیتا ہے۔ خدمت ایک ڈیوٹی ہے...... سرکاری ڈیوٹی!!

فقیری کا ایک شعبہ ہے' جسے خدمت کہتے ہیں۔ فقراء...... صاحبانِ خدمت ہوتے ہیں۔ مرشدی حضرت واصف علی واصفؒ فرمایا کرتے ''فقیری شروع ہوتی ہے' بے ضرر ہونے سے اور مکمل ہوتی ہے منفعت بخش ہونے پر!!'' ہمارے ایک دیرینہ رفیقِ طریق حسن محمد سوہلوی مرحوم کے متعلق فرمایا کرتے' یہ بندہ صاحبانِ خدمت میں سے ہے۔ حسن محمد سوہلوی ایڈووکیٹ ایک ناکام قسم کے وکیل تھے۔ اگر کوئی احمق دولت کو کامیابی کی علامت سمجھتا ہے تو وہ ناکام انسان تھے...... حالانکہ ناکام ہو کر بامراد ہونا' گھاٹے کا سودا نہیں۔ وہ اکثر اپنے دفتر میں دو متحارب پارٹیوں کو بلوا کر مٹھائی کے ایک ڈبے پر صلح کروا دیا کرتے۔ لطف کی بات یہ کہ مٹھائی بھی حسن صاحب کی جیب سے منگوائی جاتی۔ ظاہر ہے' ایسے وکیل کی کیا کمائی ہوگی ...... سوائے پاک کمائی کے!! ماڈل ٹاؤن کچہری اپنے دفتر میں بیٹھے چائے پی رہے تھے کہ باہر ایک دیہاتی وضع قطع کا عمر رسیدہ شخص آسمان کی طرف نظر اٹھائے منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتا ہوا دکھائی دیا۔ اپنے منشی کو بھیج کر اسے اندر بلوایا، معلوم ہوا کہ اُس کا بیٹا چند دوستوں کے ساتھ ایک جھوٹے مقدمے میں پکڑا گیا، سب دوستوں کے گھر والوں نے اپنے اپنے بچوں کی ضمانت کروالی ہے، اس کے پاس وکیل کرنے کے پیسے نہیں اور جج صرف وکیل کی بات سنتا ہے۔ غریب آدمی کی کون سنتا ہے...... اللہ اور اللہ سے ڈرنے والوں کے سوا۔ اس بوڑھے کی سُن لی گئی۔ حسن سوہلویؒ اسی وقت اس کے ساتھ اُٹھے' وکالت نامے پر دستخط کروائے اور جج کے سامنے پیش ہو کر ضمانت نامہ لے کر باہر

آئے۔ ملزم سیالکوٹ جیل میں تھا۔ اس غریب آدمی کے ساتھ اپنی جیب سے کرایہ خرچ کرکے سیالکوٹ پہنچے، جیل سے اس کے بیٹے کو رہائی دلوائی اور اسی شام واپس لاہور آ گئے ...... اگلے دن پھر ڈیوٹی پر!!

خدمت اور انفاق فی سبیل اللہ میں فرق ہے۔ انفاق' اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کا نام ہے اور خدمت اللہ کی راہ میں خرچ ہو جانے کا نام ہے۔ ضرورت سے زائد خرچ کرنا یقیناً نفع بخش سودا ہے لیکن ضرورت کے باوجود خرچ ہونا ...... سود و زیاں سے' بلکہ خوف اور حزن سے آزاد ہونے کا سودا ہے۔ خدمت کیلئے پاک ہونا پڑتا ہے ...... ذاتی غرض اور مفاد سے پاک!! غرض مند ضرورت مند ہوتا ہے ...... اور جو خود ہی ضرورت مند ہو' وہ کسی کی ضرورت کیا پوری کرے گا! حاجت روائی وہی کر سکتا ہے' جو خود کوئی حاجت نہ رکھتا ہو!!

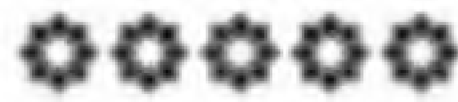
خدمت ایک مرحلہ شوق ہے ...... اور یہ مرحلہ امانت اور دیانت کے مراحل سے گزرنے کے بعد میسر آتا ہے۔ امانت اور دیانت کے تقاضوں پر پورا نہ اُترنے والا خدمت کے کسی تقاضے پر بھی پورا نہیں اُتر سکتا۔ غبن ...... صرف سرکاری رقم غائب کرنا ہی نہیں' اجتماعی خزانے میں اجتماعی مشورے کے بغیر تصرف کرنا بھی غبن کہلائے گا۔ ترجیحات کے باب میں عنوانات کا ردّوبدل کرنا بھی بدعنوانی کے زمرے میں آئے گا۔ تزئین گلستاں کیلئے مختص رقم سے گلدان خرید لینا بھی خرد برد میں شمار ہوگا۔ گلستان کی تزئین کا سامان نونہالان چمن کی تعلیم اور تربیت میں ہے۔ اینٹ گارے اور سیمنٹ کے ستون گرتی ہوئی ساکھ کو سہارا نہیں دے سکتے۔ خدمت کرنے کیلئے حکومت کرنا شرط نہیں۔ خدمت محبت کی طرح غیر مشروط ہوتی ہے۔ مشروط خدمت تجارت ہے' عبادت نہیں۔ اہل حکومت تو خدمت کے نام پر سیاست بھی کرتے ہیں اور تجارت بھی!! حکومت ایک امانت ہے ...... اور امانت دیانت کا تقاضا کرتی ہے۔ دیانت عدل کا شعبہ ہے۔ عدل کا مطلب ہے' ہر شے کو اس کے حقیقی مقام

پر رکھنا۔ صحت اور تعلیم کے شعبے نظر انداز ہوتے رہیں اور تعمیرات کا شعبہ ہمہ وقت پیشِ نظر رہے تو اسے عدل نہیں، ظلم کہا جائے گا...... وقت اور خزانے کی یہ تقسیم ٹرانسپیرنسی انٹرنیشنل کے سرٹیفکیٹ کے باوجود بدعنوانی میں شامل ہے۔ سگنل فری چوراہوں' اور ہیڈ پلوں پر برقی قمقموں کی قطاروں اور میڈیا پر نظر آنے والے جھلملاتے ہوئے اشتہاروں سے ظاہر پرستوں کی نظر تو چندھیا سکتی ہے لیکن اہلِ دل کی نظر غریبوں کے جلتے بجھتے چولہوں اور سرکاری ہسپتالوں میں غربت اور مسافت کی دھول میں اَٹے ہوئے مریضوں کی قطاروں پر جمی ہوئی ہے۔ سنا ہے تعلیم' علاج اور صاف پانی کی فراہمی بنیادی انسانی حقوق میں شامل ہیں۔ رسولِ کریم ﷺ کا ارشاد ہے' ہر شخص راعی ہے اور اس سے اس کی رعیت کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ مثلاً اگر گھر میں بچے دودھ اور دوائی سے بلک رہے ہوں اور میں اسی گھر میں برقی زینوں کی تعمیر میں مشغول پایا جاؤں' تو مجھ سے پوچھا جائے گا...... مجھ سے مکان کے بارے میں نہیں' مکینوں کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ ملک محض ایک رقبۂ زمین نہیں بلکہ ایک گھر ہوتا ہے...... اور گھر مکینوں سے ہوتا ہے۔

خدمت ایک خالص روحانی کیف ہے۔ اس کیفیت سے گزرنا ایک روحانی واردات سے کم نہیں۔ خاموش خدمت بولتی ہوئی روحانیت ہے۔ خانقاہیں' خدمت گاہیں ہیں۔ اگر خدمت کا شعبہ نظر انداز کر دیا جائے تو خانقاہوں کا جواز مہیا کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ صاحبِ مزار' مرمر کی سلوں سے ناخوش و بیزار بھی ہو سکتا ہے...... ''میرا مزار سینۂ اہلِ نظر میں ہے'' کا نعرۂ مستانہ لگا سکتا ہے۔ غرض ہر تعمیر کی ایک غایت ہوتی ہے ...... اگر وہ غرض و غایت نظر انداز کر دی جائے تو شرع و دیں بھی بت کدۂ تصورات بن کر رہ جاتے ہیں۔

خدمت کی ابتدا محبت ہے اور محبت کی انتہا عشق ہے...... اور عشق کی کوئی انتہا

نہیں ۔جس مقام کی کوئی انتہا نہ ہو' وہ لافانی ہوتا ہے ۔محبت کی طرح خدمت بھی دارِفنا میں مقیم انسان کو عازمِ بقا کرتی ہے ۔خدمت اپنی ہیئتِ اصلیہ میں بےلوث ہوتی ہے ......اور بےلوث ہونا ہی بےخوف ہونا ہے۔



عبادت کرنے والے......
خدا کو آسمانوں پر تلاش کرتے رہتے ہیں!
اور مخلوقِ خدا کی خدمت کرنے والے
......اُسے زمین پر پالیتے ہیں!!
(دلِ ہر قطرہ)

خوشامد پسندی

حضرت واصف علی واصفؒ کا ایک قول ہے ''خوشامد اس بیان کو کہتے ہیں جس کے دینے والا جانتا ہے کہ جھوٹ ہے اور سننے والا سمجھتا ہے کہ سچ ہے''

ہر مفاد پرست خوشامد پرست ہوگا...... اور ہر خوشامد پرست مفاد پرست!! اس لیے جہاں خوشامدیوں کی منڈلی لگی ہوئی نظر آئے' سمجھ لینا چاہیے کہ وہاں مفادات کی منڈی لگی ہوئی ہے۔ جی حضوری کا تمدن ...... تہذیب کو گھن کی طرح کھا جاتا ہے...... بڑی بڑی تہذیبوں کے قلعے خوشامد کی دیمک سے اندر ہی اندر کھوکھلے ہو جاتے ہیں اور انجام کار پیوندِ خاک ہو جاتے ہیں۔ جی حضوری کے ماحول میں دل کی حضوری رخصت ہو جاتی ہے ......اور جہاں دل ہی غیر حاضر ہو وہاں عقل بھی منظر سے غائب نظر آتی ہے۔

خوشامدی کلچر مخلص اور باصلاحیت کرداروں کو کھا جاتا ہے اور تماش بین اور فنکار قسم کے لوگ اجتماعی فیصلوں میں مرکزی کردار ادا کرنے لگتے ہیں۔ خوشامدی ماحول کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ حکومتی اداروں' تنظیموں اور خانقاہوں کا اِنتظام نا اہل لوگوں کے ہاتھ میں آ جاتا ہے۔ جب خوشامد کا چلن ایک سیاسی جماعت میں چلا آتا ہے تو سیاست اجتماعی شعور کی بالیدگی کی بجائے بادشاہت کے اطوار رقم کرتی ہے۔ اسی طرح اگر دعوت و اِرشاد کی جماعت خوشامد پسندوں اور خوشامدیوں میں گھر جائے تو دعوت کا کام کم اور

ارشاد کا کام زیادہ ہونے لگتا ہے۔ درس و تدریس کی نشستیں خالی ہو جاتی ہیں اور جائے ارشاد مجاور پیشہ قسم کے لوگوں کے ہاتھ اس طرح آ جاتی ہے' جس طرح زاغوں کے تصرف میں شاہیں کا نشیمن !!

جو شخص جھوٹ کو جھوٹ نہ کہے' وہ سچ کو سچ کیسے کہہ سکتا ہے۔ سچا قول اپنے اظہار کیلئے کسی بہادر کردار کی تلاش میں ہوتا ہے۔ اس لیے سچائی کا ساتھ دینا ایک بہادری کا کام ہوتا ہے۔ وہ کان جو خوشامد سننے کے عادی ہوں' سچ سننے سے بے بہرہ ہوتے ہیں۔ سچ بات سننے کیلئے اپنے تعارف اور تعریف دونوں سے بے نیاز ہونا شرط ہے۔ ہم اپنی تنقید کرنے والے سے چوکنے ہو جاتے ہیں، حالانکہ تعریف کرنے والے سے خبردار ہونا زیادہ اہم ہے۔ تعریف سن کر خوش ہونے والا دراصل اپنے سفر سے دستبردار ہو چکا ہوتا ہے، وگرنہ اس کے پاس تعریفی سند وصول کرنے کا وقت نہ ہوتا۔ خوشامد جھوٹ ہے اور جھوٹ کے ماحول میں سچی بات کیسے پروان چڑھ سکتی ہے! خوشامدی کچھوے تیز رفتار خرگوش کے کان کتر لیتے ہیں ...... اور خرگوش بس خوابِ خرگوش میں آرام پاتا ہوا پایا جاتا ہے۔

خوشامد منافقوں کی مجبوری ہے۔ ہر منافق شخص خوشامدی ہوتا ہے، اسے جہاں اپنے مفاد کی بیل منڈے چڑھتی نظر آتی ہے' وہیں خوشامد کی داغ بیل ڈال دیتا ہے۔ اخلاص سے محروم اخلاق' دراصل خوشامد کا پیش خیمہ ہے۔ اخلاق اور خوشامد میں فرق ہے ...... وہی فرق ...... جو شہادت اور خودکشی میں ہوتا ہے۔ بعض لوگ خوشامد جیسی مذموم سرگرمی کو اخلاق ایسے معصوم نام سے جاری رکھتے ہیں۔ اخلاق اور چیز ہے اور خوشامد چیزے دگر! کسی کا دل رکھنا اور مقام ہے اور کسی کے دل میں جھوٹی تعریف کا روگ لگا دینا ایک الگ بات ہے۔ یہ ایک باطنی تخریب کاری ہے !! اخلاق کیلئے اخلاص شرط ہے ...... وگرنہ یہ منافقت کا ایک کھلا باب ہے۔ اگر ''اخلاقیات'' کا راستہ کسی مفاد کے حصول کیلئے اختیار کیا

جائے تو اخلاق نہیں' ایک رکھ رکھاؤ ہے maneuvering ہے...... tactics......اور diplomacy ہے۔

جہاں خوشامدی کلچر پنپ رہا ہو' وہاں شعور کی نشو ونما نہیں ہو پاتی۔شعور آزادانہ تحقیق مانگتا ہے!! باشعور انسان کو خوشامد سے گھِن آتی ہے۔ باشعور آدمی جانتا ہے کہ تلخ ماحول اور تلخ بات برداشت کرنے سے دانائی ملتی ہے۔اس لیے خود کو ناخوشگوار ماحول میں ڈالتے رہنا اُس کا مشغلہ ٹھہرتا ہے۔ہمہ وقت سازگار فضا اور خوشگوار ماحول میں تخلیقی سرگرمیاں ماند پڑنے لگتی ہیں...... اور تحقیق نایاب ہوجاتی ہے۔درحقیقت تھوڑی سی برداشت بہت سی دانائی دے کر جاتی ہے۔

خوشامد صرف کامیابی سے کام رکھتی ہے......اور اخلاص بس کام سے کام رکھتا ہے ......اس لیے دونوں کے درمیان دوستی کا اہتمام ناممکن ہے۔خوشامد پسندی ......خود پسندی کی ایک بھیانک شکل ہے۔خود پسندی دراصل خود اذیتی ہے۔خود پسند آدمی ایک خارش زدہ مریض کی طرح خود کو کھجلاتے رہنے میں سکون محسوس کرتا ہے، حالانکہ اس کی یہ عادت اس کے مرض میں اضافہ کرتی ہے۔خود پسندی اور خود تعریفی ......اپنی خوشامد خود کرنے کے برابر ہے۔

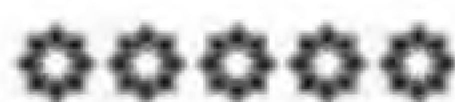
جو شخص خوشامد کرنے کا منافع بخش کام جانتا ہو، اسے بھلا کسی اور کام کی کیا ضرورت!! جس کا کام ہاتھ ہلانے کی بجائے زبان ہلانے سے ہوتا رہے' اُسے کام کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔جسے اپنے کام سے زیادہ افسرانِ بالا کو خوش رکھنے کی فکر ہو' اسے کام کی فکر کیوں ہو؟ خوشامدی چرب زبان ہوتا ہے۔خوشامد پسند ماحول میں اس کی چرب زبانی اس کی نااہلی کو اہلیت میں بدل دیتی ہے۔جب ایک نااہل آدمی اپنی خوشامد کی ڈالی پر جھولتا ہوا کسی بلند منصب پر فائز ہوجاتا ہے تو اہل آدمی احتجاجاً کام چھوڑ دیتے ہیں۔جب

تک منصب کو نسب سے جدا نہ کیا جائے' انصاف خوشامد پسندوں اور خوشامدیوں کے درمیان پستا رہے گا۔ خوشامد بھی ایک طرح کی رشوت ہے۔ خوشامد پسند آدمی کی سماعت کی حدود میں شیرینی کی ڈالی لے کر جانا ایک رشوت ہی تو ہے!!

خوشامد...... میرٹ کی قاتل ہے۔ اگر ہمارے کرتا دھرتا صرف خوشامد سننے سے انکار کر دیں' تو صلاحیت کا کام بن جائے۔ صلاحیت کا کام بگڑتا ہی تب ہے' جب خوشامدی لوگوں کے کام سنورنے لگتے ہیں۔ دراصل صلاحیت خوددار اور غیرت مند ہوتی ہے...... یہی وجہ ہے کہ صلاحیت اپنا تعارف کروانے کی بھی ضرورت محسوس نہیں کرتی۔ خوشامد کے خیمے میں جس چیز کی کمی ہوتی ہے وہ بس غیرت ہے...... اس لیے خوشامد براہِ راست دوسروں کی تعریف کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتی۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ صلاحیت کونے کھدرے میں چھپی رہتی ہے اور خوشامد سرعام دندناتی پھرتی ہے۔ انجام کار کسی ملک یا ادارے کے نظام کی مشینری کے پہیے زنگ آلود ہو جاتے ہیں...... اور حرکت جمود میں بدل جاتی ہے۔ ظاہر ہے جب تک پہیہ نہ چلے' گاڑی آگے کیسے بڑھے!!

نیت...... وضو کی طرح ہے اور عمل نماز کی طرح!! خوشامدی شخص بغیر وضو کے نماز پڑھنے کی کوشش کرتا ہے۔ خوشامدی لوگ نیت کے کھوٹے ہوتے ہیں، اِس لیے اُن کا بہت سا عمل بھی پھل نہیں لاتا...... جبکہ مخلص انسان کا بویا ہوا عمل کا ایک بیج اس طرح پھل پھول لاتا ہے کہ صدیوں تک پھیل جاتا ہے اور مخلوقِ خدا پر گھنی چھاؤں کر دیتا ہے۔

ظاہری اور باطنی ترقی کیلئے خوشامدیوں کی حوصلہ شکنی ضروری ہے...... وگرنہ جھوٹ کے حوصلے بڑھ جاتے ہیں۔ ظاہری ترقی شفافیت مانگتی ہے اور باطنی ترقی اخلاص!! معاشرتی اور معاشی ترقی کیلئے انصاف...... ناگزیر ہے اور روحانی اور باطنی ترقی کیلئے احسان!!



خوشامد......لفظوں کی رشوت

لوگ تاجر بن گئے ہیں اور کھنکتے ہوئے لفظوں کو سکّوں کی طرح استعمال کرتے ہیں۔ ہر صاحبِ اختیار کے حضور' جی حضوری کی طشتری میں نقرئی لفظوں کا جھومر اور رُوپہلی لہجے کے آویزے پیش کرنا لفظوں کا بیوپار کرنے والوں کا نشانِ امتیاز ہے۔

لفظ ایک امانت ہیں۔ اس کا درست استعمال ہی اس امانت کی حفاظت ہے۔ امانت کی حفاظت کو دیانت کہتے ہیں۔ غلط مقام اور غلط انسان کیلئے مثبت الفاظ کا استعمال اس امانت میں خیانت ہے۔ جسے لفظوں کی دولت دی گئی ہے' اس سے اِسی دولت کے اسراف کے بارے میں ضرور پوچھا جائے گا۔ خوشامد لفظوں کی مدد سے نااہل کو اہل ثابت کرنے کی کوشش ہے۔ نااہل کو اہل قرار دینا گویا اہل کو نااہل قرار دینا ہے۔ مقامات اور مقالات اگر مبنی بر اہلیت نہ ہوں تو نظام بگڑ جاتا ہے۔ مسندِ ارشاد ہو یا اُشاعت ...... لفظ اگر معانی کے سفیر نہ رہیں تو اِرشادات قابلِ روایت ہونے کے باوجود قابلِ اشاعت نہیں ہوتے۔ ایک وقت تھا کہ لکھا ہوا لفظ سند سمجھا جاتا تھا۔ اب وقت ایسا آ گیا کہ لفظوں کا اعتبار جاتا رہا۔ دراصل لفظ بولنے اور لکھنے والے پر اعتبار ہی لفظوں کو معتبر کرتا ہے۔ مال اور مفاد کے رشتے کا پیوند لفظ کی تقدیس کو متاثر کر دیتا ہے۔ لفظ اِس جہان میں بولا جاتا ہے اور دوسرے جہان کی خبر دیتا ہے۔ لفظ ایک طلسمِ ہوشربا ہے...... حاضر کو غائب کر سکتا ہے اور

غیب کو حاضر ٹھہرا سکتا ہے۔ اگر بولنے والا اپنے مقام پر نہ رہے' تو لفظ بھی اپنی جگہ چھوڑ دیتے ہیں۔ لفظوں میں تاثیر اخلاص کے دم سے ہے۔ ایک بے جان لفظ کے جسد میں جب اخلاص کی روح پھونک دی جاتی ہے تو وہ اٹھ کھڑا ہوتا ہے، چلنے لگتا ہے اور اس کی چال زمانے کی طرح قیامت کی چال ہوتی ہے۔ بندۂ اخلاص کے مونہہ اور موقلم سے نکلے ہوئے لفظوں کا دائرۂ تاثیر صدیوں تک محیط ہوتا ہے۔ حضرت علی ہجویری المعروف داتا گنج بخشؒ کے بقول ''معرفت لفظ سے معانی کا سفر ہے۔'' معانی کے مسافر بالآخر لفظ تک ہی پہنچتے ہیں ...... وہی لفظ جو ان کیلئے حرفِ آخر ہوتا ہے۔ یہ بیان کہ لفظ معانی کا احاطہ نہیں کر سکتے' لفظوں ہی میں بیان ہوتا ہے۔ معلم اور متعلم کے درمیان لفظ کا رشتہ ہی تو ہوتا ہے۔ لفظ معانی سے رشتہ نبھانا چھوڑ دیں تو درس وتدریس اور اخلاق کا سارا نظام زمین پر آ رہے۔ کون ...... کس کو ...... کیسے سمجھائے گا؟

بادشاہوں کو ظلِ سبحانی کہنا سبحان جیسے لفظ کے تقدس کی پامالی ہے۔ اگر خواص لفظوں کی حرمت پر پہرہ نہ دیں تو تمام لفظ اپنے معانی میں غلط العوام ہو جائیں۔ تعظیم کے وہ لفظ جو ایک دینی و روحانی شخصیت کیلئے استعمال کیے جاتے ہیں' وہی الفاظ اگر دنیا دار کیلئے بھی فراخدلی سے استعمال ہونے لگیں تو سمجھ لینا چاہیے کہ لفظ لکھے نہیں جا رہے' گھڑے جا رہے ہیں۔ لفظ گھڑنے والا دراصل ایک جھوٹ گھڑتا ہے۔ جس نے لفظوں کی تعظیم کی' وہی معظم قرار پایا۔ جس نے لفظ اور معانی کا رشتہ برقرار رکھا' وہی قابلِ توقیر ٹھہرا۔ انسان کا طرۂ امتیاز لفظ ہے، لفظ کے استعمال میں افراط وتفریط ہمیں درجۂ انسانیت سے دور کر دیتی ہے۔ لفظ انسانیت کی ایک مشترکہ میراث ہے۔ ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل ہونے میں لفظ اور معانی کا رشتہ کمزور نہ پڑنا چاہیے ...... وگرنہ ارتقائے حیات وشعور کی کڑیاں کمزور پڑنے لگتی ہیں۔ لفظ کی حفاظت از حد لازم ہے۔ ہم اپنے نظریات کو لفظ دیتے ہیں اور الفاظ کی

ترتیب کو ایک نظریہ قرار دیتے ہیں۔کلمہ طیبہ مخصوص الفاظ کی ایک مخصوص ترتیب ہے۔انہیں دہرانے سے ایک انسان کفر سے نکل کر اسلام کے دائرے میں داخل ہو جاتا ہے۔نکاح کے خطبے کے چند الفاظ سننے اور دہرانے سے دو اجنبی عمر بھر کے ہمسفر قرار پاتے ہیں۔ایک ناپسندیدہ لفظ تین بار دہرانے سے زندگی کے ہم سفر اچانک اجنبی ہو جاتے ہیں۔

ہر لفظ ایک قول ہے...... اور قول قرار سے جڑ پکڑتا ہے۔کردار میں استقرار لفظ کا وقار بڑھاتا ہے۔کردار اگر قابل اعتبار نہ ہو' تو قرآن و حدیث کے الفاظ بھی سننے والے پر اثر نہیں کرتے۔اگر کردار صداقت سے نکل گیا تو جان لینا چاہیے کہ لفظ تاثیر سے نکل گیا۔ لفظوں کو مؤثر بنانے کیلئے اور ان کی تاثیر تک پہنچنے کیلئے لازم ہے کہ ہم لفظوں کی مدد سے مال اور مرتبے میں اضافے کی تدبیر نہ کریں۔مال اور مفاد مردہ علامتیں ہیں۔مردہ علامتیں کسی زندہ و جاوید ہستی کی نمائندگی نہیں کر سکتیں۔اخلاص زندہ کرامت ہے۔مومن کی اصل قوت اخلاص ہے۔اخلاص کی قوت کا حامل قول ضرب المثل بن جاتا ہے۔

سچا انسان سچ کا مسافر ہوتا ہے، وہ مال مفاد اور مرتبے کے لالچ میں اپنا سفر ترک نہیں کرتا۔جھوٹا شخص جہاں مفاد دیکھتا ہے' وہیں پڑاؤ ڈال دیتا ہے۔جھوٹا شخص جھوٹے لفظوں کی بیساکھیوں کے بغیر ایک قدم نہیں چل سکتا۔سچا انسان لفظوں کے بغیر بھی سبک خرام ہے۔سچے انسان کی خاموشی بھی کلام کرتی ہے۔صداقت کا سکوت ابلاغ میں اکثر کلام سے بڑھ جاتا ہے۔ انسان بسا اوقات جو الفاظ اپنی صفائی میں بولتا ہے' وہی الفاظ اس کے خلاف فردِ جرم بن جاتے ہیں۔لفظوں کا انتخاب شعروں کے انتخاب کی طرح رسوا کر دیتا ہے۔من کا کھوٹ کسی لفظ کی کمی یا زیادتی کی صورت میں واضح ہو جاتا ہے۔

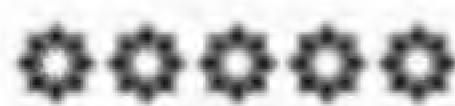
خوشامد لفظوں کی رشوت ہے۔خوشامد کرنے والا اور خوشامد سننے والا دونوں برابر درجے کے خائن ہیں۔جب تک خوشامد سننے والا کان میسر نہ ہو' خوشامد کرنے والی زبان کو

الفاظ میسر نہیں آسکتے۔ حضرت واصف علی واصفؒ فرماتے ہیں ''خوشامد بغیر صفت کے تعریف ہے''۔ صفت کے بغیر موصوف کا وجود ممکن نہیں۔ غیر کو وجود کا درجہ دینا درحقیقت غیر ممکن کو واجب قرار دینے کے برابر ہے...... درحقیقت یہ وجود کی وحدت کے ساتھ ایک شرک ہے!!

دل و دماغ پر سچ کی حکمرانی قائم کرنے کیلئے جھوٹ سے نجات لازم ہے۔ اپنے وقت، وجود اور خیال کی حفاظت کیلئے اپنی زندگی میں جھوٹ سے اجتناب اور سچ کا التزام ضروری ہے۔ جھوٹ اندھیرا ہے، اندھیر نگری ہے...... سچ روشنی ہے، حق نگر ہے۔ جھوٹ سچ کی روشنی کا شاہد نہیں ہوتا...... اور نہ کسی کو روشنی کا شاہد ہونے ہی دیتا ہے۔ سچائی اس مسافر کی ہم سفر ہوتی ہے جو سچائی کی شہادت دینے کیلئے ہمہ وقت تیار ہو۔ لفظ ایک گواہی ہے اور گواہی جھوٹی ہو تو ایک وبال ہے۔ خوشامد...... جھوٹی گواہی ہے۔ خوشامد جھوٹ کو سچ ثابت کرنے کی ایک کوشش ہوتی ہے اور جھوٹ کو سچ کہنے والا سچ کو جھوٹ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ صداقت میں کڑواہٹ ہوتی ہے لیکن اس کا انجام حلاوت ہے۔ سچ کا پھل صبر کی طرح میٹھا ہوتا ہے۔ سچی بات کی تاثیر روح کی گہرائی تک اتر جاتی ہے۔ جس طرح روح کو فنا لاحق نہیں' اس طرح سچی بات کو بھی فنا کا عارضہ لاحق نہیں ہوتا۔

جھوٹ فسوں ساز اور فسوں کار ہے۔ سچ حق ہے...... اور حق' فسوں اور فسانے کو لپیٹ دیتا ہے۔ لفظ ایک طاقت ہے۔ کم ظرفوں کو طاقت ملتی ہے تو فرعون بن بیٹھتے ہیں۔ ایک لکنت والے موسیٰؑ کا خاموش عصا زر اور زور کے فسوں کے بل پر لہراتے ہوئے سانپ سنپولیے نگل لیتا ہے۔ لفظ کی جانچ سے پہلے لفظ بولنے والے کو جانچنا چاہیے۔ لفظ بولنے والا اگر مفادات کی منڈی میں آڑھت کرتا ہو' تو سمجھ لینا چاہیے کہ اس کا لفظ ایک رسم ہے...... اور رسمی الفاظ حقیقت سے اتنا ہی دور ہوتے ہیں' جتنا کاغذی پھول خوشبو سے!!

لفظ خیال کے شجر پر پھوٹنے والی ایک کونپل ہے۔ اگر شجر' شجرۂ طیبہ نہ ہو تو پھل اور پھول سب عارضی اور کاغذی!!



نظریے کی نظیر!!

پچھلے دنوں یہ دو خبریں ایک ساتھ پڑھنے کو ملیں۔ پہلی خبر تھی: ''کشمیر میں لائن آف کنٹرول پر بھارتی فوج کی بلااشتعال فائرنگ، پاک فوج کا ایک کیپٹن شہید، متعدد زخمی''
...... اور دوسری سرخی یہ تھی ''بلوچستان میں خودکش دھماکے سے تیس پولیس جوان شہید''!

اخبار کی پیشانی پر روشنائی سے اور سرزمینِ وطن پر شہیدوں کے لہو سے یہ دونوں سرخیاں ایک ہی دن تحریر ہوئیں۔ بظاہر یہ دو الگ الگ خبریں ہیں اور اِن کے محلِ وقوع میں سینکڑوں میل کا فاصلہ ہے لیکن بباطن یہ ایک ہی خبر ہے...... کہ فاصلہ ظاہر میں ہوتا ہے' باطن میں نہیں۔ باطن کی آنکھ کھل جائے تو ہر خبر درحقیقت ایک ہی خبر ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ہر واقعہ دراصل ایک ہی واقعہ ہے...... صرف کردار بدلتے ہیں' محلِ وقوع بدلتا ہے...... واقعہ نہیں بدلتا۔ اگر انسان کا اندر نہ بدلے تو باہر واقعہ بھی نہیں بدلتا۔ حقیقتِ حال یہ ہے کہ ہم اس وقت حالتِ جنگ میں ہیں۔ ہم پر ایک جنگ مسلط کر دی گئی ہے اور اعلانِ جنگ ابھی باقی ہے۔ قوم منتشر ہے کہ جنگ کا بگل ابھی بجا نہیں۔ دراصل اعلانِ جنگ کیلئے ایک راہنما کی ضرورت ہوتی ہے اور راہنما ابھی سامنے آیا نہیں ...... قوم فی الحال سیاستدانوں کے ساتھ گزارہ کر رہی ہے۔

سیاستدان اور راہنما میں وہی فرق ہے' جو شاہین اور کرگس میں ہوا کرتا ہے۔

راہنما صرف راہنمائی کرتا ہے، وہ مدح و ذمّ سے بے نیاز ہوتا ہے۔اسے توصیف کی حاجت نہیں اور تنقید سے وہ خائف نہیں۔ وہ طے شدہ اور پامال زدہ راستوں پر چلنے کی بجائے نئے راستے تراش لیتا ہے...... اور اسی تراش خراش سے وہ اپنی قوم کی فکری صورت گری کرتا ہے۔ وہ غیر مقبول فیصلے کرتا ہے، لیکن ان فیصلوں کے نتائج اسے مقبول کر دیتے ہیں۔ سچ بولنے کا فیصلہ یقینی طور پر ایک غیر مقبول فیصلہ ہے۔ سچا آدمی مقبولیت کی چوکھٹ پر نہیں، قبولیت کے دَر پر جھکتا ہے۔ راہنما کا زادِ راہ اخلاص اور صداقت ہوتا ہے ...... اخلاص جب قبول ہو جاتا ہے تو قابلیت پیدا کر دی جاتی ہے۔ قابلیت قبول نہیں ہوتی، بلکہ یہ اخلاص ہے جو قابلیت کو قابلِ قبول بناتا ہے۔ پس راہنما صرف قوم کیلئے سوچتا ہے...... اور سیاست دان اپنے لیے...... اپنی پارٹی کیلئے، اپنے بینک اور پھر ووٹ بینک کیلئے! راہنما کا جوہر اِخلاص ہے، سیاستدان کا ہتھیار نفاق ہے! اخلاص کے ساتھ بسر کرنا ایک کارِ دشوار ہے۔ اخلاص کا رستہ درویشی کا رستہ ہے...... کہ اِخلاص اپنے مزاج اور مفاد کی نفی کا نام ہے۔ مفاد کی نفی تو سمجھ میں آتی ہے...... لیکن مزاج کی نفی کون سمجھے گا! مزاج کی نفی...... کا ثبات...... ملامت کی گلی سے گزرے بغیر ممکن نہیں! مفاد اور نفاق کا سبق آسان ہے، اس کیلئے صرف چالاک ہونا کافی ہے۔ نفاق ہر مرحلے اور ہر فیصلے میں اپنے مفاد کا تحفظ چاہتا ہے۔ جب ذہن میں مفاد پرستی دَر آتی ہے، تو دل میں نفاق بھی نقب لگا لیتا ہے۔

راہنما قوم کو وحدتِ فکر دیتا ہے۔ قومیں وحدتِ فکر اور وحدتِ عمل سے پہچانی جاتی ہیں۔ ایک طرزِ فکر ایک قوم کی تشکیل کرتا ہے۔ جرمن قوم اس لئے جرمن ہے کہ وہ جرمنوں کی طرح سوچتے ہیں، جب جرمنی میں دو اندازِ فکر پیدا ہوئے تو ایک ہی رنگ نسل اور زبان کے باوجود جرمنی دو ملکوں میں منقسم تھا، مشرقی اور مغربی جرمنی۔ مشرقی جرمنی سوشلسٹ طرزِ فکر اپنائے ہوئے تھا اور مغربی جرمنی کے لوگ سرمایہ دارانہ نظام پر متفق تھے...... یعنی

صرف معیشت کے متعلق مختلف طرزِ فکر نے ایک رنگ نسل اور زبان بولنے والوں کو دو قوموں میں تقسیم کر دیا۔ دیوارِ برلن اینٹ پتھر کی نہیں' نظریے کی دیوار تھی۔ دو قومی نظریہ مغرب میں ثابت ہوا پڑا ہے، لوگ ابھی مشرق میں اس کی نظیر ڈھونڈ رہے ہیں...... مشرقی اور مغربی جرمنی تو قصۂ پارینہ ہوئے، آج کے دور میں یہ مثال شمالی اور جنوبی کوریا کی شکل میں موجود ہے...... گویا نظریے کا ڈھول چاروں اور بج رہا ہے۔ لوگ معیشت کے نظریے پر ایک دوسرے سے علیحدہ ہو جاتے ہیں، ہمیں دینی نظریے کی بنا پر الگ ہونے کا حق حاصل نہیں!! قومیں نظریے کی بنیاد پر اُٹھتی ہیں اور نظریے سے عدم وابستگی کی بنا پر منہدم ہو جاتی ہیں۔ جب مشرقی جرمنی والوں نے سوشلزم کا نظریہ تج دیا تو دیوارِ برلن کا گرنا محض تاریخی نہیں' ایک فطری حقیقت تھی۔ قطبِ ارشاد حضرت واصف علی واصفؒ کے اس معروف قول:......
''پاکستان نور ہے اور نور کو زوال نہیں''...... سے مراد یہی ہے کہ پاکستان کی اُساس جس نظریے پر استوار کی گئی ہے' وہ نظریہ زوال آشنا نہیں۔ نظریۂ پاکستان کی بنیاد ایک کلمۂ وحدت ہے' کلمہ صداقت ہے...... لا الٰہ الاّ اللہ محمد رسول اللہ...... جب تک ہم اجتماعی طور پر اس نظریے کے ساتھ وابستہ ہیں' ملک کی سلامتی کو خطرہ نہیں۔ پاکستان برصغیر میں بسنے والے مسلمانوں کا ایک متفقہ اجتہاد تھا...... اور اصولِ اجتہاد میں یہ شامل ہے کہ جس اُمر پر ایک مرتبہ اجتہاد ہو چکا ہو' اس پر دوبارہ نہیں ہوتا۔ بّرصغیر پاک و ہند میں بسنے والے مسلمانوں کا یہ متفقہ' متحدہ اور جمہوری فیصلہ تھا کہ اُن کا طرزِ فکر ہندوؤں سے جدا ہے، اس لیے انہیں اپنے لیے ایک علیحدہ گھر چاہیے...... یہ ایک سیدھی سی بات ہے، اسے سمجھنے کیلئے کوئی دقیق فلسفہ درکار نہیں، اسے نظریہ کہہ لیں...... اسے نظریۂ پاکستان کہہ دینے میں آخر حرج ہی کیا ہے؟؟ اس نظریے پر یقین ہمیں مجتمع رکھے گا اور شک منتشر کر دے گا!!

ایک طرزِ فکر ایک قوم پیدا کرتا ہے۔ یکساں طرزِ فکر قوموں کو مجتمع بھی کرتا ہے

اور منظم بھی!! چند ہزار منظم اور تربیت یافتہ انگریز کتنے کروڑ غیر منظم ہندوستانیوں پر ایک سو سال تک بہانگ دہل حکومت کرتے رہے۔ دراصل قوم اُس وقت بنتی ہیں جب اُس کے افراد اجتماعی مفاد کی خاطر انفرادی مفاد قربان کرنے کا ہنر سیکھ لیتے ہیں۔ کہتے ہیں' برصغیر میں انگریز حکومت کی بنیاد اُس انگریز ڈاکٹر نے رکھ دی تھی جس نے مغل شہزادی کے لا علاج مرض کا کامیاب علاج کرنے کے بعد معاوضے میں اپنے لیے ہیرے جواہرات قبول کرنے کی بجائے مغل شہنشاہ سے اپنی قوم کے تاجروں کیلئے آزادانہ تجارت کا پروانہ حاصل کر لیا تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی ہندوستان میں اپنے قدم جمانے کیلئے اِس انگریز معالج کا احسان نہیں بھول سکتی۔

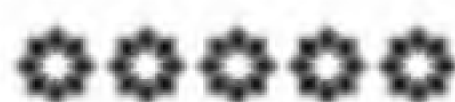
منتشر خیال اور منتشر حال عوام کو قوم نہیں' ہجوم کہتے ہیں۔ جنگیں...... قومیں لڑا کرتی ہیں' منتشر ہجوم نہیں۔ جنگیں دشمنوں سے لڑی جاتی ہیں...... اور ایک ہم ہیں کہ اِس جنگ میں اپنے دشمنوں کی نشاندہی تک نہیں کر پا رہے۔ بیرونی سرحدوں پر دشمن یونیفارم میں ہے' پہچان میں آ جاتا ہے لیکن اندرونِ خانہ دشمن بغیر یونیفارم کے دندناتا پھرتا ہے اور پہچان میں نہیں آ رہا۔ اگر ہمارا فکر آئینے کی طرح شفاف ہوتا تو اپنے پرائے کی پہچان آسان ہوتی، لیکن شومئی قسمت کہ تاریخ کے اِس موڑ پر ہماری فکری وحدت دھندلا گئی ہے۔ بصیرت کمزور ہو تو بصارت بھی کام نہیں آتی۔ قوموں کی زندگی میں فکری موڑ بہت اہم ہوتے ہیں ...... اور ایسے ہی دوراہوں پر اکثر بڑے بڑے دانشور دام ہمرنگِ زمیں سے دھوکا کھا جاتے ہیں۔

''زمینی حقائق'' کے نام پر قنوطیت اور مصالحت کے نام پر مصلحت کا سبق دینے والے پیر بل قوم کو فکری انتشار میں مبتلا کر رہے ہیں۔ ہمارے دانشور دائیں اور بائیں بازوؤں میں منقسم ہیں ...... اس لیے قوم کے ہاتھ کچھ نہیں آتا۔ کچھ لوگ لیفٹسٹ ہیں، کچھ

رائٹسٹ ...... اور راہِ اعتدال اور مستقیم پر بہت کم !! دانشوروں کی بہتات ہے' اور دانش مندوں کا کال پڑا ہوا ہے! لیفٹسٹ حضرات ملک کی نظریاتی سرحدوں کا سرِ عام تمسخر اُڑاتے ہیں، وہ کسی نظریۂ حیات کے تحت اپنے ملک کے معانی کا تعین کرنے والوں کو احمق تصور کرتے ہیں ...... وہ جغرافیائی سرحدوں پر کھڑے ہم پر اسلحہ تانے یونیفارم میں ملبوس دشمن کو دشمن ماننے کیلئے تیار نہیں، اُن کا کہنا ہے کہ آج کے دَور میں صرف سائنس اور معیشت ہوتی ہے، دشمن وشمن کچھ نہیں ...... یہ سب تمہارا فریبِ نظر ہے۔ دوسری طرف رائٹسٹ (دائیں بازو والے) ہیں' وہ اتنے ''سیدھے'' ہیں کہ پاس کھڑے دشمن کو پہچان نہیں پاتے۔ وہ اپنے دائیں بائیں کھڑی ننگی جارحیت کیلئے توجیہات کے لباس تجویز کرتے رہتے ہیں۔ وہ ملک کی سکیورٹی فورسز پر حملہ کرنے والوں کو دشمن تصور نہیں کرتے۔ وہ بیان کی حد تک بھی اُن کی مذمت نہیں کرتے ...... وہ مذمت کی بجائے معذرت کرتے رہتے ہیں۔ اندرونِ خانہ آتش و آہن کی تخریب کاری بھی اُن کے رویے کی سردمہری نہیں توڑ سکی !! نتیجہ یہ ہے کہ قوم منتشر الخیال ہے، لوگ گروہوں اور ٹولوں میں تقسیم ہیں، مملکت کو درپیش کسی مسئلے اور خطرے پر فکری ہم آہنگی کا شدید فقدان ہے۔ قوم کو یک نظر اور یک سُو کرنا آخر کس کا کام ہے ...... کیا تنخواہ دار تجزیہ کار یہ کام سرانجام دیں گے؟

واہگہ، چکوٹھی اور کھوکھراپار مونا باؤ محض جغرافیائی لکیریں نہیں' نظریاتی سرحدوں کی علامتیں ہیں۔ جغرافیائی سرحدوں کی حفاظت فوج کا کام ہے اور نظریاتی سرحدوں کی حفاظت دانشوروں کے ذمہ ہے۔ جنگوں میں صف بندی اہم ہوتی ہے ...... دوست کو دوست اور دشمن کو دشمن کی صف میں کھڑا کر دیں' پہلا مرحلہ سر ہو جائے گا۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا قول ہے: ''دوست تین قسم کے ہوتے ہیں، دوست، دوست کا دوست اور دشمن کا دشمن ...... دشمن کی بھی تین قسمیں ہیں' دشمن، دشمن کا دوست اور دوست کا دشمن۔''

یاد رکھیں! ہر وہ فرد، نعرہ اور نظریہ ہمارا دشمن ہے' جو ہمارے وطن کی نظریاتی اور جغرافیائی وحدت میں ترمیم چاہتا ہے۔ نظریاتی اور جغرافیائی سرحدوں کو کنفیوژ کرنے والا دراصل لائن آف کنٹرول کے اُس پار فائرنگ کرنے والی دشمن فوج کی مدد کر رہا ہے...... دَر پردہ۔ یہ نفاق ہے...... وہ کفر! مملکتِ مدینہ کی طرح مملکتِ پاکستان بھی روزِ اوّل سے دونوں محاذوں پر جنگ لڑ رہی ہے، باہر کافر و یہود اور اندر منافقین!! دراصل نفاق ہی وہ فتنہ ہے جو قتل سے زیادہ شدید ہے۔ کفر گردن کاٹتا ہے، نفاق جڑ!! کفر اور نفاق ایک ہی مشن پر ہیں...... صرف محاذ الگ الگ ہے۔



تحمل' غصے کو دیکھ لیتا ہے...... غصہ' تحمل کو نہیں دیکھ پاتا۔
غصہ اندھا ہوتا ہے...... اس لئے تحمل کی گہرائی دیکھنے سے قاصر رہتا ہے!
(دلِ ہر قطرہ)

تذبذب کا عذاب!!

وحدتِ فکر سے محروم قوم' قدم قدم پر تذبذب کا شکار ہوتی ہے۔ جس کے پاس ایک راہِ عمل نہ ہو' اُس کا سفر دو گام طے نہیں ہوتا کہ دوراہے پر جا نکلتا ہے۔ دوراہے پر پہنچتے ہی وہ اپنا راستہ نئے سرے سے متعین کرنے لگتے ہیں۔ ہر دوراہا انہیں دو آراء میں تقسیم کر دیتا ہے۔ فکری سفر میں ایسے دوراہے ایک سیاسی جلسہ گاہ بن جاتے ہیں، نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ قوم مجتمع ہونے کی بجائے منتشر ہونے لگتی ہے۔ لیڈر کم یاب اور مجمع باز کامیاب ہو جاتے ہیں۔ کسی کی مقبولیت کا اندازہ اُس کے پیچھے نظر آنے والے 'ہاں ہاں' کرتے ہوئے سروں کی تعداد سے لگایا جاتا ہے۔ عزت اور شہرت میں فرق نہیں رہتا۔ ظاہر ہے اس معیار پر صرف مجمع باز ہی پورا اُتر سکتا ہے۔ قبولیت اور مقبولیت ہم آواز ضرور ہیں' ہم راز ہرگز نہیں!! تہلکہ، قہقہہ اور مضحکہ پیدا کرنا' شاید ہجوم کی توجہ حاصل کرنے، اپنے نفس کے کشکول میں داد کی بھیک لینے کیلئے ضروری تصور کیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے تخریب میں ایک خبر بنتی ہے اور تعمیر بالعموم توجہ حاصل کرنے میں پیچھے رہ جاتی ہے۔ تعمیر کا عمل تو سوئے ہوئے بچے کو پیار کرنے کا عمل ہے۔ ماں اپنے بچے کی پرورش میں سالہا سال مصروفِ عمل رہتی ہے، کوئی خبر نہیں بنتی۔ اگر وہ بچوں کو چھوڑ کر بھاگ جائے تو اگلے دن دو کالمی خبر چھپ جاتی ہے۔ معاشرے بھی بچوں کی طرح ہوتے ہیں، یہ بنتے بگڑتے رہتے ہیں۔ رائے ساز لوگ انہیں بناتے ہیں اور وہی بگاڑتے ہیں۔ جب رائے زنی اور سنگ زنی میں فرق نہ رہے تو قوم

منتشر ہو جاتی ہے...... اور اپنا اپنا مجمع اکٹھا ہو جاتا ہے۔

قوم کو ہجوم میں منقسم کیا جا سکتا ہے اور ہجوم کو قوم میں مجتمع کیا جا سکتا ہے...... اس میں فرق صرف قائد اور غیر قائد ہونے کا ہے۔ جیسا قائد ہو' ویسے عقائد ہو جاتے ہیں...... قائد کو تبلیغ کی ضرورت درپیش نہیں ہوتی۔ قائد وہ ہوتا ہے جو قاعدے کی بات کرتا ہے۔ قاعدے کی بات کرنے والا فائدے کی بات نہیں کرے گا۔ لحاتی فائدہ اور لحاتی لذت دیرپا مسرتوں سے دُوری کا عنوان بن جاتے ہیں۔ لذت تو لذت ہی ہے، چاہے چرب زبانی کی کیوں نہ ہو۔ لذت اور فائدہ لحاتی ہوتا ہے، عزت اور سکون دیرپا! دراصل ایک لیڈر کی قوت اُس کی اپنی نفی میں پوشیدہ ہوتی ہے۔ قاعدے کی بات عدل کی بات ہے۔ عدل کا مطلب ہے' ہر شئے کو اُس کے اصل مقام پر رکھنا...... اور خود کو کسی مقام پر نہ رکھنا۔ اگر خود کو کسی مقام پر رکھ کر بات کی جائے تو اس مقام کی حفاظت کرنا پڑتی ہے...... اور یوں اپنے نام اور مقام کی حفاظت کی خاطر ''عذرِ گناہ بدتر اَز گناہ'' کے پاتال میں اُترنا پڑتا ہے۔ اپنی جماعت کے اَمیر کے تحفظ اور ملک وملت کے تحفظ کے درمیان اگر فرق پیدا ہو جائے تو اِس دوراہے پر کھڑے ہو کر بڑے بڑے جبہ ودستار والے لڑکھڑا جاتے ہیں۔

فکری تخریب کاری ملک وملت پر ایک ضربِ کاری ہے۔ فکری اِنتشار میں مبتلا کرنے والا خودکش بمبار جس حملے کی بنیاد رکھتا ہے اُس کی لرزش صدیاں نگل جاتی ہے۔ قومیں وحدتِ فکر سے بنتی ہیں۔ وحدتِ فکر' بیا کے گھونسلے کی طرح تنکا تنکا جمع کرنے سے متشکل ہوتی ہے۔ فکری وحدت کے سائبان کی طنابیں کاٹنے والا اپنے عمل اور انجام کی رُو سے اس شخص سے زیادہ مختلف نہیں ہوتا جس نے حضرت صالحؑ کی اونٹنی کی کونچیں کاٹ دی تھیں۔ حضرت صالحؑ کی اونٹنی کیا تھی؟ ظاہر پرستوں نے کہا' یہ ایک عام اونٹنی ہی تو ہے، اس کے ساتھ وہی سلوک کرو جو عام اونٹنیوں سے ہم کرتے چلے آرہے ہیں۔ اہلِ باطن نے

انہیں سمجھایا' یہ عام نہیں ہے' خاص بات ہے...... یہ ایک نسبت کی حامل اونٹنی ہے۔ یہ اللہ کے حکم سے وجود پذیر ہوئی ہے اسے شعائر اللہ سمجھو...... شعائر اللہ کی توہین نہ کرو۔ صالحین اُمت نے پاکستان کو حضرت صالحؑ کی اونٹنی سے تشبیہ دی ہے۔ جس نے اس پر ضرب لگائی' اس کے دین دنیا غارت ہوئے۔ جس نے اس کی تکریم کی' وہ سرفراز ہوا۔ ایک محفل میں حضرت واصف علی واصفؒ سے کسی نے پوچھا' آپ اسلام اور پاکستان کو لازم و ملزوم کیوں قرار دیتے ہیں، حالانکہ اسلام ایک کائناتی دین ہے اور پاکستان ایک جغرافیائی ریاست ہے۔ آپؒ نے فرمایا' ایک قطعۂ زمین جب مسجد کیلئے حاصل کرلیا جاتا ہے تو وہ ایک عام زمینی قطعہ نہیں رہتا، بلکہ محترم و مکرم ہو جاتا ہے، اسی طرح جب ایک خطۂ اَرضی اِسلام کے نام پر حاصل کیا جائے تو وہ محض ایک جغرافیائی خطہ نہیں رہتا، بلکہ شعائر اللہ میں شمار ہوتا ہے۔ یعنی نسبت محترم ہوتی ہے' ظاہری حیثیت، قد کاٹھ اور وضع قطع نہیں۔ جب ایک ظاہری شئے کو باطنی حقیقت سے نسبت دے دی جاتی ہے تو وہ شعائر میں شامل ہو جاتی ہے۔ اہل نظر دیکھ رہے ہیں کہ پاکستان کی توہین' شعائر اللہ کی توہین ہے۔

اِس ملک کی سرحدوں کے محافظ ہماری دھڑکنوں میں بستے ہیں، ہماری دعاؤں کے سائے میں ہیں۔ وہ ہماری راتوں کو پُرسکون بنانے کیلئے اپنی راتیں آنکھوں میں کاٹتے ہیں۔ ہم اپنے گرم اور نرم بستر میں نیند لیتے ہوئے بھول جاتے ہیں کہ وہ پہاڑوں' میدانوں اور چوٹیوں پر یخ بستہ ہواؤں کا سامنا کر رہے ہیں۔ واہ رے جوان! تیری عظمت کو سلام ...... چوٹیوں پر برفیلی ہواؤں کا سامنا کرتا ہے اور میدانوں میں ٹکے ٹکے کے مجمع بازوں کی جلی کٹی کا سامنا بھی کرتا ہے۔ آفرین ہے، سلام ہے' تجھ پر...... یہ تیرا ہی اعزاز ہے کہ سرحدوں سے لوٹ آئے تو غازی ہے...... جان سے جائے تو شہید!!! تیری شہادت پر صرف انہیں ہی شبہ ہے جو صداقت کی شہادت چھپاتے ہیں، تیرے خون کی حُرمت پر انہیں ہی شبہ ہے

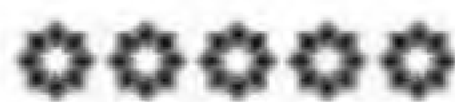
، جنہیں قائدِ اعظمؒ کی صداقت پر شبہ تھا، جنہیں قلندرِ وقت علامہ اقبالؒ کی بصیرت پر شبہ تھا۔ شکوک وشبہات میں گرفتار دل ہی تو منافقت کی آماجگاہ ہے۔ اسلام کے نام پر مسلمانوں کا قتل ِ عام خروج ہے اور اس قتل میں ملوث خارجی ہیں۔ خارجیوں سے ہمدردی جتلانے کی ضرورت صرف منافقوں کو پیش آتی ہے۔ ریاستِ مدینہ کی طرح ریاستِ پاکستان بھی اوائل ہی سے دوطرفہ دشمنوں میں گھری ہوئی ہے۔ اِسے اندرونی اور بیرونی دونوں دشمنوں سے جہاد کیلئے کمربستہ ہونا پڑا، بیرونِ خانہ یہود وکفار ہیں اور اندرونِ خانہ منافقین !!اس ریاست کے تحفظ کیلئے اٹھنے والے قدم' شہدائے بدر وحنین کے نقوشِ قدم پر ہیں!

پاکستان کا قیام برصغیر میں آباد ملتِ اسلامیہ کا ایک متفقہ اجتہاد تھا۔ اجتہاد کے اصولوں میں یہ شامل ہے کہ جس اَمر پر ایک بار اجتہاد ہو چکا ہو' اس پر دوبارہ نہیں ہوتا۔ دعویدارانِ دین' اجتہاد کی مبادیات سے ناواقف تو معلوم نہیں ہوتے، یہ نادانی کا اظہار نہیں' بلکہ خبثِ باطن کا اظہار ہے۔ دوست دشمن کی پہچان آزمائش کے دوراہے پر ہی ہوتی ہے۔ دوراہوں کی آزمائش سے گزرنے کیلئے وحدتِ فکر درکار ہوتی ہے۔ راہنما اور راہزن کا فرق بھی یہیں واضح ہو جاتا ہے۔ راہنما وہ ہے جو وحدتِ فکر کی طرف راہنمائی کرے اور راہزن وہ' جو اجتماعی فکر میں نقب لگاتا ہے اور اسے ایک فکری انتشار میں تبدیل کر دیتا ہے۔ آج قطبِ ارشاد حضرت واصف علی واصفؒ کے ایک قول کی خوب تفہیم ہوئی۔ پچیس سال پہلے آپ نے فرمایا تھا: ''قوم کو تذبذب میں مبتلا کرنا ایک ظلم عظیم ہے''۔

قومی ترانے کے خالق حفیظ جالندھری آج قومی صورتِ حال دیکھ لیتے تو شاید اپنے اِس شعر کو بھی قومی ترانے میں شامل کر لیتے ......

؎ دیکھا جو کھا کے تیر' کمیں گاہ کی طرف ‌ ‌ ‌ ‌ اپنے ہی دوستوں سے ملاقات ہوگئی

(ایک مذہبی سیاسی جماعت کے سربراہ کے بیان "وزیرستان میں جاں بحق ہونے والے پاک فوج کے جوان شہید نہیں ہیں" کے جواب میں)



خواہش، سکون اور سکونت!

خواہش تحرک ہے، سکون ...... ایک سکونت! حرکت سکون کا اُلٹ ہے۔ سکون اندر کی دنیا سے متعارف کرواتا ہے...... خواہش بیرونِ خانہ جوتیاں چٹخاتی پھرتی ہے۔ خواہش متحرک ہوتی ہے' سکون قائم بذاتِ خود!! سکون ...... ٹھہراؤ ہے۔ ٹھہراؤ ٹھہر جائے تو خواہش بھاگ جاتی ہے۔ خواہش ٹھہر جائے تو انسان بھاگ کھڑا ہوتا ہے...... اشیاء منصب اور مقام کے پیچھے۔ مقام کی دوڑ میں شامل ہونے والا بھول جاتا ہے کہ صاحبِ مقام دراصل صاحبِ قیام ہوتا ہے۔ خواہش انسان کو دَوڑ میں شامل ہونے پر مجبور کرتی ہے...... اور دوڑتے ہوئے شخص کا منظر اس کے نقطہ نظر کی طرح ڈگمگاتا رہتا ہے۔ اس طرح سیلِ خواہش میں بہنے والا شخص زندگی کا منظر دیکھنے کیلئے کہیں بھی قیام پذیر نہیں ہو پاتا۔ زندگی کا حقیقی منظر دیکھنے کیلئے حالتِ سکون میں آنا ضروری ہے۔ ایک متحرک شخص کا منظر بھی اس کی طرح قلابازیاں کھاتا رہتا ہے۔ دراصل خواہش ...... فکر و نظر کو لاحق ایک عارضہ ہے۔ خواہش زدہ شخص کلر بلائنڈ ہوتا ہے۔ وہ زندگی کے سب رنگ نہیں دیکھ سکتا۔ خواہش کا کنٹوپ پہن کر زندگی کا منظر دیکھنے والا صرف دو قسم کے رنگ ہی دیکھتا ہے۔ ایک اُس کی خواہش کی تکمیل کا رنگ ہے ...... اور دوسرا تشنہ تکمیل رہنے کا! خواہش کی نظر سے دیکھنے والا زندگی کو ہمہ رنگ اور ہمہ جہت زاویوں سے دیکھنے کی صلاحیت سے محروم ہوتا ہے...... اس لیے اس کی نظر میں زندگی کا ہر منظر ادھورا ہے۔ خواہش کی بصیرت اس کی بصارت تک

محدود ہوتی ہے...... اور بصارت' سماعت تک! اس لئے خواہش کا اُسیر شخص کانوں سے دیکھتا ہے۔ خواہش خود ایک دھوکا ہے...... اور دھوکے میں گرفتار شخص کو مزید دھوکا دینا بہت آسان ہوتا ہے...... بس کوئی چرب زبان اس کے سامنے ایسا منظر پیش کر دے' جہاں اس کی خواہش کی تکمیل کا امکان اور سامان موجود ہو' وہ فوراً جھانسے میں آجاتا ہے۔ خواہش کا تعاقب کرنے والا اپنی عاقبت بھول چکا ہوتا ہے۔ اپنی خواہش سے مانوس آدمی اردگرد انسانوں سے غیر مانوس ہوتا ہے۔ اس کی زندگی میں فقط دو قسم کے انسان ہوتے ہیں ...... پہلی قسم میں وہ لوگ' جو اُس کی خواہش پورا کرنے میں معاون ہوتے ہیں یا ہو سکتے ہیں اور دوسرے وہ' جو اُس کی خواہش میں رکاوٹ کا باعث بنتے ہیں یا ممکنہ طور پر بن سکتے ہیں۔ اِنسان بنانے والے کی قسم ...... انسان تو قِسم قِسم کے ہوتے ہیں، انسان تو رنگ رنگ کے ہیں...... یہ رنگا رنگ قسم کے انسان اسی بے رنگ کی نیرنگ صفات کی جلوہ سامانیاں ہیں۔ انسان کا دل اُس کا گھر ہے۔ جب دل میں خواہش گھر کر لے تو وہ گھر سے بے گھر ہو جاتا ہے!

خواہش عام طور پر ملکیت پانے کی ہوتی ہے یا پھر ملکیت جتلانے کی!! ملکیت پانے کی خواہش دراصل لوگوں پر غلبہ پانے کی خواہش ہے...... اور ملکیت جتلانے کی خواہش اپنے گردوپیش میں خود کو نمایاں کرنے کی خواہش ہے۔ خواہش کے یہ دونوں رُخ دراصل اس دنیا میں ہمیشہ رہنے کی حرص سے عبارت ہیں۔ ہمیشہ کیلئے نہ ٹھہرنے والی دنیا میں ہمیشہ ٹھہرنے کی خواہش...... عارضی دنیا میں مستقل قیام کی خواہش انسانی شعور کو درپیش ایک بہت بڑا پیراڈاکس ہے۔ وہ خواب و خیال جس کی غذا ایک شعوری سقم ہو' فہم و شعور میں اضافہ کا سبب کیسے بن سکتے ہیں؟...... قیام کی تمنا میں متحرک رہنا بجائے خود ایک فکری تضاد ہے۔ بہر حال انسان اگر احساسِ ملکیت سے آزاد ہو جائے تو اُس کا اِحساس جاگ اُٹھتا ہے...... بصورتِ دیگر ایک گہری نیند کا نشہ اسے گھیر لیتا ہے۔ خواہش زدہ شخص نیند میں

چلتا ہے۔غفلت کی نیند ایک دلدل کی طرح ہے۔کوئی آواز، کوئی دُعا اور نظر کی کوئی کمند ہے کہ دلدل سے نکلنے کا سبب ہو جاتی ہے...... وگرنہ نیند میں چلنے والوں کو ہرگز احساس نہیں ہو پاتا کہ وہ کہاں سے چلے تھے اور کہاں تک آ پہنچے۔

خواہش میں آرام نہیں...... آرام پانے کی خواہش ہی بے آرام کرتی ہے۔ خواہشات اور ضروریات میں فرق کرنا ضروری ہے۔خواہشات کو ضروریات نہ بنایا جائے تو ہر ضرورت پوری ہو جاتی ہے۔ ہر خواہش کو ضروت بنا لیا جائے تو انسان دَر دَر کا بھکاری ہو رہتا ہے۔کسی خواہش کے زیرِ اثر اکٹھا کیا ہوا سامان...... اکثر سامانِ عبرت ہی بنتا ہے۔ مقام اور مرتبے کی خواہش دولت کی خواہش سے کہیں زیادہ خطرناک ہوتی ہے۔دولت کی خواہش میں مبتلا صرف دوسروں کی دنیا کی بربادی کا سبب بنتا ہے لیکن مقام و مرتبے کی خواہش کا اَسیر شخص دوسروں کے دین کی بربادی کا باعث بھی بن جاتا ہے۔سکون کا پہلا انعام بے طلب ہونا ہے...... خواہش کی پہلی سزا بے چین رہنا ہے۔

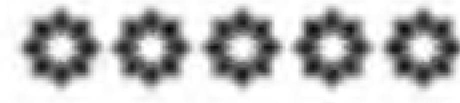
خواہش کیسی ہی معقول کیوں نہ ہو کارگاہِ مشیت میں ایک دخل دَر معقولات ہے۔ خواہش زدہ...... وحشت زدہ ہوتا ہے...... اور وحشت زدہ کو سکوں سے کیا مطلب؟ سکون محوِ سکوت ہوتا ہے۔خواہش بول پڑتی ہے۔جب خواہش بولتی ہے تو شور پیدا کرتی ہے...... شور شعور سے دُور ہوتا ہے اور شورش سے قریب !! خواہش برداشت کی متحمل نہیں ہوتی !! خواہش خاموش ہو جائے تو فتنہ...... بول پڑے تو فساد! سکوت کلام پیدا کرتا ہے...... کلام کلمہ ہے، مہمل نہیں۔کلام معانی سے مزین ہوتا ہے...... اور مہمل سے ممیز !! سکون...... محوِ سکوت ہو، یا محوِ کلام...... بہرصورت حالتِ قیام میں ہوتا ہے۔خواہش...... سکون کا قتلِ عمد ہے۔خواہش کا مصدر لالچ ہے...... اور منبع لذاتِ دنیا کی رغبت !!

خواہش...... خوار کرتی ہے۔سکون باعثِ عز و شرف ہے۔خواہش، انتشار ہے

...... منتشر کر دیتی ہے۔ سکون' یکسوئی ہے ...... منظم کرتا ہے! خواہش بے ہنگم شور ہے ...... سکون کا آہنگ مترنم!! جب دِل اور دماغ کی لہریں ہم آہنگ ہو جائیں تو سکون کا جلترنگ بجنے لگتا ہے۔ جب روح اور جسم کے تار ہم نفس، ہم مشرب اور ہم مطرب ہو جائیں' تو سکون کا ڈیرہ آباد ہو جاتا ہے۔ سکون کی چھاؤں وہی مہیا کر سکتا ہے' جس کے دل کے آنگن میں سکون کا برگد قد آور ہو چکا ہو۔ سکون کا لنگر تقسیم کرنے کا اِذن اُسے ہی حاصل ہوتا ہے' جو جمع کرنے کی طلب سے آزاد ہو چکا ہو۔ سکون کے آسن وہی بیٹھ سکتا ہے جو خواہش کو تیاگ چکا ہو! سکون آزادی کی فضا ہے ...... خواہش وجود کا حبس بے دم۔ خواہش کا خوشہ توڑنے سے انسان مادّیت کی زمین پر ہبوط ہو جاتا ہے ...... عروج کا زینہ پھر ترکِ خواہش ہے۔ سکون کا مسکن وہی وجود ہے' جہاں خواہش کا جھاڑ جھنکار صاف کر دیا گیا ہو۔ خواہش ایک خود فریبی ہے۔ فریب خوردہ ...... خود آشنا نہیں ہو سکتا ...... اور جب تک کوئی خود آشنا نہ ہو' خدا آشنا نہیں ہو سکتا۔ جب تک خدا شناسی میسر نہ ہو' قربِ حق نہیں ملتا ...... اور جب تک قربِ حق نہ ملے' سکون نہیں مل سکتا۔ سکون مطلق ہوتا ہے ...... خواہش کی درجہ بندی ہوتی ہے۔ سکون ...... خواہش کا عرفان رکھتا ہے، خواہش سکون کا اِدراک نہیں کر سکتی۔ سکون خواہش کا قد ماپ سکتا ہے ...... خواہش سکون کی گہرائی، گیرائی اور ہمہ گیری کا اندازہ نہیں کر سکتی!

وقت کے ساحل پر خواہش کی ریت کے گھروندے بنانے میں مصروف لوگ ہیشگی کے قصر کی طرف راہ نہیں پاتے۔ خواہش کے مقدر میں شکستگی لکھ دی گئی ہے۔ خواہش کا خواب جب بھی ٹوٹتا ہے' غصے سے تعبیر کیا جاتا ہے یا پھر مایوسی سے!! شکستہ خواہشوں کی کرچیاں رُوح تک زخمی کرتی ہیں۔ اگر خانہ شعور میں تسلیم و رضا کا باب وا ہو جائے تو خواہشوں کی شکستگی کردار میں پختگی کا سبب ہو جاتی ہے۔ اس طرح سیّئات کو حسنات میں بدلنے کا مظاہرہ

اِس دنیا میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ سکون ...... خواہش کی قربانی مانگتا ہے۔ خواہش بہ تسلیم و رضا خوش دلی سے قربان کر دی جائے تو ایک درجہ شہادت ہے ...... مجبوری اور بد دِلی سے چھوڑی جائے تو خودکشی !! تسلیم کی قربان گاہ میں اپنی خواہشات کا مینڈھا ذبح کرنے والے خوش نصیب ہی عیدِ قرباں کی خوشیوں کے حق دار ٹھہرتے ہیں۔



خواہش، خواہ کیسی ہی معقول کیوں نہ ہو......
کائناتی اَمر میں ایک دخل در معقولات ہے
(دلِ ہر قطرہ)

عجز، فخر اور غرور!

عجز ...... فقر ہے۔فخر ...... دنیا ہے۔غرور ...... بغاوت ہے۔ عجز اپنے ہونے کی زکوٰۃ ہے، فخر اپنے ہونے کا خراج ہے...... اور غرور ...... بندگانِ خدا کی فہرست سے اخراج ہے۔ عجز ...... قربانی کا صلہ ہے...... فخر مقابلے کی تمنا ہے۔غرور...... اپنی اَنا کے بوٹوں تلے دوسروں کی عزتِ نفس روند دینے کا نام ہے۔کوئی غرور اپنے مقابل کی تحقیرِ ذات سے کم پر راضی نہیں ہوتا۔فخر یہ ہے کہ میں بھی ہوں، غرور یہ کہ ''میں ہی ہوں''۔نجات ''بھی'' اور ''ہی'' دونوں سے نجات پانے میں ہے۔اَز روئے قرآن' دنیا کی زندگی تقابل اور تفاخر ہے۔تفاخر' تقابل ہی کا نتیجہ تو ہوتا ہے۔

عجز اختیاری ہو' تو فقر ہے...... اضطراری ہو' تو اَفلاس! اَفلاس سے پناہ مانگی گئی ہے۔اِرشاد ہوا' عین ممکن ہے اَفلاس تمہیں کفر تک پہنچا دے۔تبلیغ دین کا مقصود لوگوں کو کفر سے نکال کر شکر میں داخل کرنا ہے۔سو' اِسلام کی تبلیغ کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی خدمت کی جائے تاکہ وہ اُس افلاس کو نہ پہنچیں' جہاں کفر کا اندیشہ ہے۔اسلام فوز و فلاح کا پیغام ہے۔ایک مبلغ اسلام کو اپنے مخاطب کی ظاہری فلاح باطنی فلاح سے پہلے مطلوب ہونی چاہیے۔ اَزل سے اَصفیاء کا یہی طریق رہا کہ ظاہر دکھا کر باطن منوا لیا۔ظاہری خدمت کی...... اور باطنی حقیقت کا ابلاغ ہوتا رہا۔یہی وجہ ہے' صوفیہ نے لنگر کو رواج دیا۔ پہلے طعام پھر کلام کا سبق دینے والوں کا طعام لذیذ اور کلام بلیغ تھا۔

ایک عالم سب سے پہلے خود طالبِ علم ہوتا ہے...... اور پھر اِس راہ پر چلنے والوں کا راہنما ہوتا ہے۔ راہنما' سیاست دان نہیں ہوتا' وہ قائد ہوتا ہے۔ قائد خود قیام میں ہوتا ہے...... اور اپنے پیچھے چلنے والوں کیلئے قاعدہ مقرر کرتا ہے۔ قائد' ہوا و ہوس سے پاک ہوتا ہے' اِس لئے وہ ہوا کے رُخ پر نہیں چلتا...... وہ ہواؤں کے رخ موڑتا ہے۔ وقت کی طنابیں وہی تھام سکتا ہے جو اپنے مفاد کے اونٹ کسی اُصول کی قربان گاہ میں نحر کر چکا ہو۔ اگر عالم' عالمِ دین بھی ہو...... تو اُس پر اپنی اَنا کی قربانی دو چند واجب ہو جاتی ہے۔

اِنقلاب قلب میں رونما ہوتا ہے۔ باہر صرف شور اور شورش برپا ہوتی ہے۔ قلب جب منقلب ہوتا ہے تو انسان کے اندر شعور کی ایک ایسی آنکھ کھلتی ہے کہ وہ اِسی دنیا کو ایک نئی جہت سے دیکھنے لگتا ہے۔ اِسی جہت کی دریافت اُسے نیا انسان بناتی ہے۔ اس طرح توبہ ایک عملی انقلاب ہے۔ حضرت علی ہجویری المعروف داتا گنج بخشؒ اپنی شہرۂ آفاق تصنیف ''کشف المحجوب'' میں فرماتے ہیں ''توبہ حکومتوں کے بدل جانے کا نام ہے''...... دل کی سلطنت پر پہلے غیر اللہ کا قبضہ تھا...... جس کا نعرہ تھا 'میرے علاوہ کوئی نہیں'۔ جب انقلاب آ گیا تو وجود کی یہی سلطنت اَمرِ اِلٰہی کے زیرِ فرمان ہو گئی...... بندے کا رُواں رُواں پکار اُٹھا...... تیرے علاوہ کوئی نہیں!

انقلاب...... قالب نہیں' قلب کے بدلنے کا نام ہے۔ اِسلام بھی آ چکا اور اِنقلاب بھی...... چودہ سو برس قبل شعورِ انسانی کی کایا کلپ ہو چکی۔ کیا اب کوئی نیا اِسلام ہے، نیا انقلاب ہے...... جس کی نوید دی جارہی ہے...... یہ نوید ہے کہ وعید؟ کائنات کے بہترین معلمؐ نے کلمۂ توحید کے حامل انسانوں کی ایک بہترین جماعت تیار کر دی۔ اب جماعت کے اندر جماعت سازی...... چہ معنی دارد؟ جماعت سازی کی بجائے کردار سازی کی طرف توجہ ہونی چاہیے۔ کردار سازی سے مراد تزکیہ نفس اور تصفیہ قلب ہے۔ یہ انفرادی سطح کا

عمل ہے...... دل پر دستک دینے سے شروع ہوتا ہے۔ دلوں پر دستک کون دے گا۔ دماغوں پر دلیلوں کے ہتھوڑے برسانے والے کیا جانیں گے' پھول کی پتیاں کیسے کھلتی ہیں؟ دل کی کلی کیسے کھلتی ہے ...... بس ایسے ہی ...... جیسے صحراؤں میں ہولے سے بادِ نسیم چلتی ہے ...... جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آ جاتی ہے!!

اِسلام کی خدمت کا مطلب مسلمانوں کی خدمت ہے۔ خدمت کیلئے سیاست ضروری ہے' نہ ریاست! بڑے ادارے بڑے بڑے کام کرتے رہتے ہیں ...... لیکن انسان کے دکھ کا مداوا اِنفرادی سطح پر کی جانے والی خدمت ہے۔ زندگی کے میلے میں چپکے سے کسی کا ہاتھ تھام لینا خدمت ہے' کہ وہ بھیڑ میں کہیں کھو نہ جائے، اپنی شناخت بھول نہ جائے۔ کسی کا راستہ آسان کر دینا خدمت ہے۔ کسی کو وقت دینا خدمت ہے۔ کسی غریب کی عزت کرنا خدمت ہے، کسی غریب کے سامنے اُس کے بچے سے پیار کرنا بہت بڑی خدمت ہے۔ اس کے برعکس مخلوقِ خدا کے راستے روکنا' انانیت ہے۔ انانیت ...... فرعونیت ہے۔ لوگوں سے پروٹوکول وصول کرنا ...... گویا اپنے مقام اور مرتبے کی طاقت کا بھتہ وصول کرنا ہے۔ سڑکوں پر رکھے بیریئر سب کو نظر آتے ہیں، عقل، فہم اور شعور کی شاہراہوں پر رکھے ہوئے بیریئر کون ہٹائے گا؟ ذاتی اَنا، گروہی' مسلکی تعصب اور اپنے اپنے معتقدین کی تعداد پر غرور کے بھاری بھرکم بیریئر اُمت کے قافلے کا راستہ روک رہے ہیں!! سوال یہ ہے کہ ہم اِسلام کی خدمت کر رہے ہیں یا اِسلام سے خدمت لے رہے ہیں۔ ہمارے ہونے سے اِسلام کا کیا سنورتا ہے' اور ہمارے نہ ہونے سے اسلام کا کیا بگڑتا ہے؟ اگر ہمارے علمی اور سیاسی کیریئر میں اسلام کا حوالہ نہ ہوتا' تو آج میرٹ پر ہم کہاں کھڑے ہوتے ہیں؟ ...... ظاہر ہے' کہیں بھی نہیں!!!

اپنی اَناؤں اور قباؤں کی آن بان قائم کرنے کی کوشش میں گرم ہونے والے

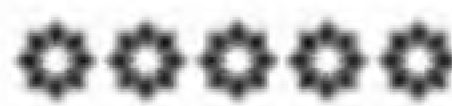
میدان میں بہنے والے خون سے کسی اصول کا فروغ ہوا' نہ حق کی صدا بلند ہوئی۔خون ناحق بہا...... لیکن حق واضح نہ ہوا۔فقیر تو فرقان ہوتا ہے...... اس کے ہر قول اور فعل سے حق و باطل کے درمیان فرق واضح ہوتا چلا جاتا ہے۔ خدا کے سادہ دل بندے کدھر جائیں؟...... بزبان اقبالؒ یہی فریاد کرتے جائیں...... درویشی بھی ہے عیاری، سلطانی بھی ہے عیاری!! سادہ دل بندوں کا شکوہ دنیا داروں سے بھی ہے اور اِن سے کہیں بڑھ کر دین کے دعوے داروں سے! دنیا دار کا آئین واضح ہوتا ہے، اسے دولت چاہیے، طاقت چاہیے، حکومت چاہیے...... اور ہر قیمت پر چاہیے۔وہ کسی اخلاقی اور دینی اصول کو آڑے نہیں آنے دیتا...... جبکہ دین دار کی اصل ہی اصول اور پھر اصولوں کا فروغ ہے۔مومن کی اصل قوت اُس کا اِخلاص ہے۔وہ اصولوں کو سربلند کرنے کیلئے سب سے پہلے اپنی اَنا کو سرنگوں کرتا ہے۔ اَز روئے حکمِ رسولِ کریم ﷺ ایک مسلمان کی جان مال اور آبرو کی حرمت کعبے سے بڑھ کر ہے۔کیا ہمارے جبہ و دستار کی حرمت کعبے کی حرمت سے بھی بڑھ چکی ہے؟...... اپنی مسندوں کی حفاظت کیلئے مزید کتنی جانوں کی قربانی درکار ہے؟

خبر یہ نہیں کہ ایک ناعاقبت اندیش حکمران نے طاقت کے زعم میں طاقت کا بے دریغ استعمال کیا اور دھرتی کو لہو رنگ کیا...... خبر تو یہ ہے کہ ایک داعی دین نے دعوتِ دین کو چھوڑ کر دنیا کی دعوت قبول کر لی۔دنیا کثرت اور طاقت سے عبارت ہے۔دنیا دار اپنے ہر کاروں کی تعداد پر غرور کرتا ہے...... لیکن ایک سچا دین دار اپنے پیروکاروں کی تعداد پر فخر بھی نہیں کر سکتا...... کہ دین مقدار کا نہیں' معیار کا سودا ہے۔کثرت میں ہلاکت ہے...... وحدت میں نجات ہے۔لوگوں کو دین کی طرف راغب کرنے والوں کیلئے لازم ہے کہ وہ خود مرغوباتِ دنیا سے پرہیز کریں۔مسندنشینوں کیلئے جائز لذتیں بھی ناجائز ہوتی ہیں۔دین دار لوگوں کی اخلاقیات دنیا داروں کی اِخلاقیات سے بہتر ہو' تو بات بنتی ہے...... وگرنہ نیت کی

طرح قسمت بھی بگڑ جاتی ہے۔ اگر کردار شاملِ حال نہ ہو' تو تبلیغ محض لفظوں کی جنگ ہے۔ تاریخ میں لفظ نہیں' کردار بولتے ہیں۔ کردار اپنے رعبِ جمال سے لفظوں کی ہیئت خود مرتب کرتے ہیں۔

ایک عالمِ دین اگر اپنے طالبعلموں کو طلبِ علم کے سفر سے نکال کر اپنے سیاسی سفر میں جھونک دے...... تو یہ راہبری نہیں' راہزنی ہے۔ نوجوانوں میں دین کیلئے کچھ کر گزرنے کا جذبہ جوانی کی موج کی طرح بامِ عروج پر ہوتا ہے۔ اُمت کے نوجوانوں کے مذہبی جذبات کو ہائی جیک کر لینا' استحصال کی بدترین قسم ہے۔ استحصال ظلم بھی ہے اور مزید ظلم کا محرک بھی!

دراصل اختلاف مسلمانوں کی خدمت پر نہیں، اَمارت پر ہوتا ہے۔ یہیں سے اختلاف' افتراق میں بدلتا ہے...... اور افتراق' احتراق میں!! اختلافِ رائے تو اتفاقِ رائے تک پہنچنے کیلئے ہوتا ہے۔ اختلاف باعثِ رحمت بھی ہوتا ہے...... مگر صاحبانِ علم کیلئے ...... اور علم والے وہی ہیں' جو حلم والے ہیں۔ ہمارا علم اور مرتبہ اگر مخلوقِ خدا کیلئے گھنی چھاؤں نہیں بن رہا تو غرور بن رہا ہے...... اور غرور حجاب بھی ہے اور عذاب بھی! قول حضرت واصف علی واصفؒ: ''مغرور لوگ طاقت سے حکومت کرنا چاہتے ہیں...... اُن کے پاس خدمت کا شعور نہیں'' ...... اور یہ کہ ''مخلوق کو ڈرانے والے، مخلوق پر حکومت کی تمنا کرنے والے' خالق کے باغی ہیں''



شعور، شور اور شورش

وہ جگہ جہاں سے معانی کا نزول ہو' وہ عرش ہے ...... اور جہاں پر نزول ہو' وہ بجائے عرش! کائنات و مافیہا میں انسانی قلب ہی وہ جائے حرم ہے جہاں معانی کا نزول ممکن ہے...... کہ اس سلسلے میں یہی جائے استعداد بھی ہے اور جائے استحقاق بھی!!

عرش سے فرش تک سارا جہان' شعور کا جہاں ہے۔ شعور ہی وہ جولان گاہ ہے' جہاں الفاظ کی کمند سے معانی تک زقند لگائی جاتی ہے۔ شعور کا سارا سفر الفاظ سے معانی کی دریافت کا سفر ہے ...... جیسے جیسے الفاظ کا معانی کے ساتھ رشتہ بنتا چلا جاتا ہے' اُس تصویر کی بُت مکمل ہونے لگتی ہے' جسے تصورِ حیات کہا جاتا ہے۔ حیات کا تصور پانی کے بغیر نامکمل ہے ...... اور پانی علامت ہے' اُس علم کی' جو آسمان سے نازل ہوتا ہے...... ''اور ہم نے ہر شئے کو پانی سے زندہ کیا''۔

مقصدِ تخلیق کائنات انسان ہے...... اور مقصدِ تخلیقِ اِنسان اس شعور کا فروغ ہے' جو خود آگاہ بھی ہو' اور خدا آگاہ بھی! خود آگہی اور خدا آگہی کے تمام راستے الانسانؑ کی معرفت تک پہنچتے ہیں۔ حرفِ کُن سے صوتِ اِقراء تک شعورِ کل کی دریافت کا سفر ہے ...... اور الیوم سے ایں یوم تک پھر اسی شعور کی بازیافت کا۔ کائناتِ ہست و بود میں انبیاء کا شعور' کل مخلوقاتِ عالم میں سب سے بڑھیا بھی ہے' اور سب سے بڑھ کر بھی ...... کہ ایک طرف وہ خالق سے واصل ہے' تو دوسری طرف مخلوق سے متصل۔ خالقِ کون و مکاں نے اپنی

مخلوق سے جب بھی کلام کیا' انبیاء کے وسیلے ہی سے کیا۔ اس وسیلے اور واسطے کے ساتھ جنہوں نے معنی خیز تمسک کیا وہ **مطھرون** میں سے ٹھہرے ...... اہلِ ولایت کہلائے۔ جس نے نورِ ولایت کا احترام کیا وہ خود قابل احترام ٹھہرا ...... کہ اس نے درحقیقت نورِ رسالت کی تقلید کی ...... جس نے تقلید کی' اس نے تصدیق کی۔ جس نے اعراض کیا' اعتراض کیا' وہ ناقابل تقلید ٹھہرا ...... کیونکہ اس نے طاغوت کی تقلید کی ...... وہ شعور سے نکل کر شور اور شورش کی وادیوں میں اُتر گیا۔

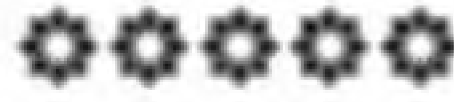
وہ شعور جو خود آگاہ نہیں ...... وہ شور' شر اور شورش کی ایک شکل ہے۔ وہ شعور شورش زدہ ہے' جو اپنے سے بلند تر شعور کی طرف رجوع کی حالت میں نہیں۔ ایسا شعور' نہ سن سکتا ہے ...... نہ دیکھ ہی سکتا ہے ...... نوائے سروش ...... اور نوشتۂ دیوار!! شورش زدہ شعور خود کو خود کفیل سمجھتا ہے ...... وہ وسیلے کو غیر اہم جانتا ہے ...... اور یہی وہ وہم ہے' جو یقین کا روپ دھارے اس کے ساتھ چپکا رہتا ہے ...... یہاں تک کہ وہ ہلاکت کو پہنچ جاتا ہے۔

لفظ وہ آواز ہے جو معانی تک لے کر جاتی ہے۔ اس آواز کے ساتھ سماعتوں کا منسلک ہونا ہی باشعور ہونا ہے۔ لفظ اور معنی کا رشتہ برقرار رہے تو شعور ...... منقطع ہو جائے تو شور!! وہ آوازیں جو لفظوں کی ہمنوا ہوں' مگر ہم معنی نہ ہوں ...... شور پیدا کرتی ہیں۔ شعور ...... ہمہ تن گوش ہوتا ہے ...... گوش بر آواز رہتا ہے ...... اور جب آواز کی صورت اختیار کرتا ہے تو محض کلام نہیں کرتا ...... بلکہ ہم کلام ہو جاتا ہے۔ شعور ...... ''گفتگو'' ہے ...... لفظ اور معانی کے رشتوں کی مالا ہے ...... یہ مالا جاپنے کی ابتدا ذکر ہے ...... اور انتہا فکر!! شعور ایک نغمگی ہے ...... شور بے ہنگم آوازوں کا مجموعہ ہے۔ شور میں ہر کوئی اپنی سناتا ہے ...... کوئی کسی کی نہیں سنتا۔ صرف اپنی سناتے رہنا ایک ناپختہ شعور کی علامت ہے۔ ناپختہ شعور جب کلام کرے گا تو پختہ کو ناپختہ کرے گا ...... اپنے اندر کے شور کا شعور نہ ہونے کے سبب

شورش برپا کرے گا...... اور اندر باہر یورش کرتا پھرے گا۔ شورش زدہ شعور...... مکمل دین کو نامکمل سمجھے گا...... ابلاغ کے بغیر تبلیغ کرے گا...... اور معتبر کو اپنی طرح نامعتبر کرے گا۔

ایسے میں "دُور سے آتی ہوئی آواز بھی اندھیرے میں روشنی کا کام دیتی ہے"

اس آواز سے منسلک ہو جانا خود کو روشن کرنا ہے...... خود کو روشن کرنا ہی روشنی بانٹنے کا اصل طریق ہے...... اور یہی طریقہ ہے' اندر باہر کے اندھیروں سے چھٹکارا پانے کا !!



شعور کب دوزخ بنتا ہے......؟

جب شعور' خدائی دیکھے اور خدا نہ دیکھے!

(پہلی کرن)

روشنی، کائنات کی خوشبو

ایمان روشنی ہے...... کفر اندھیرا !! روشنی سے نور کا سفر...... ایمان کے بعد عرفان کا سفر ہے۔ معرفت، نور ہے...... اور عدم معرفت، ظلمت۔ عرفان...... بیداری ہے، ہمیشہ کی بیداری...... ہمیشہ کیلئے !!

عدم عرفان حالتِ غفلت ہے...... نفس کی! معرفت کی جستجو سے محروم، ظلمتِ نفس میں گرفتار ہے...... وہ اپنے نفس پر ظلم کا مرتکب ہوتا ہے۔ عرفان ذات کے متلاشی ''چار سُو حُسنِ ذات کی خوشبو'' سے متعارف کروائے جاتے ہیں...... صاحبانِ ایمان، نورِ ولایت کی معرفت، معرفت میں داخل کیے جاتے ہیں۔ نورِ ولایت کا انکار...... نفس کی طغیانی ہے...... طغیٰ ہے...... طاغوت کی ہمراہی ہے...... یعنی سراسر گمراہی ہے۔ اپنے نفس کی سرکشی میں مبتلا ہونے والے شور اور شورش کے مرتکب ہوتے ہیں۔ امن اور سلامتی کے دین کو چھوڑ کر وہ فساد فی الارض کے راستے پر چل پڑتے ہیں...... ''جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ زمین پر فساد برپا نہ کرو، تو کہتے ہیں، ہم ہی تو ہیں اصلاح کرنے والے۔ خبردار! حقیقت میں یہی لوگ ہیں، فساد برپا کرنے والے، مگر انہیں شعور نہیں''...... نفس کی اس حالتِ ظلمت میں عدل کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے۔ روشنی کو روشنی اور تاریکی کو تاریکی کہنے اور سمجھنے کا شعور مفقود ہو جاتا ہے...... یعنی کچھ بھائی نہیں دیتا۔ درحقیقت اندھیرا دیکھنے کیلئے بھی روشنی کی ضرورت ہوتی ہے...... اور روشنی کا تعلق بینائی سے ہے۔ بینائی...... بصارت نہیں، بصیرت

ہے۔ بصیرت ہمراہ نہ ہو' تو بصارت گمراہ کر دیتی ہے۔ وہ بصارت جو بے بصیرت ہوتی ہے' بے بصر ہوتی ہے ۔ بصارت چاہے دونوں آنکھوں کی ہو' صرف آدھا منظر دکھاتی ہے ...... یعنی صرف موجود منظر ...... بعد اور مابعد دونوں اس کی نظر سے اوجھل رہتے ہیں۔

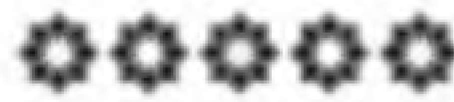
مومن کا طرّۂ امتیاز بصیرت ہے ...... فراست ہے ...... مومنانہ فراست ...... بلاشبہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے ...... کیونکہ اللہ ہی اُس کا ولی ہے۔ نورِ ولایت جب مومنوں کی دستگیری کرتا ہے تو اُن میں شانِ فراست پیدا کرتا ہے۔ اُن کے اندر ایک نورِ بصیرت پیدا ہو جاتا ہے ...... ایک فرقان نازل ہو جاتا ہے ...... حق اور باطل کے درمیان فرق کرنے کا میزان قائم ہو جاتا ہے۔

آج کے پُرفتن دَور میں جب ابلاغِ عامہ ذوق کے نام پر بدذوقی اور علم کے نام پر بدعلمی کا ابلاغ کر رہا ہے ...... میڈیا بصارت کو چندھیا رہا ہے اور بصیرت کو دھندلا رہا ہے' الیکٹرونک میڈیا کے سامنے بیٹھا سیدھا سادہ مسلمان فہم کے نام پر کج فہمی وصول کر رہا ہے ...... ایسے شورزدہ ماحول میں باہر مقابلے اور مناظرے برپا کرنے سے کیا حاصل ہوگا۔ درحقیقت انقلاب تو وہ ہے جو قلب میں برپا ہوتا ہے۔ حقیقی انقلاب پیدا کرنے کا راستہ تزکیہ اور تصفیہ ہے ...... اور یہ راستہ کسی ولی اللہ کی نگاہ اور درگاہ سے ہو کر گزرتا ہے۔ تزکیۂ نفس اور تصفیۂ قلب میسّر آ جائے تو نورِ بصیرت کا میسر آنا لازم ہے ...... نہاں خانۂ قلب میں ٹمٹماتی ہوئی ایمان کی روشنی' معرفت کے نور میں ڈھل جاتی ہے۔

ہماری قوم میں اخلاقیات اور معاملات کے پیمانے درست کرنے کی کس قدر ضرورت ہے' یہ محتاجِ بیاں نہیں۔ ہم اس معاملے میں خوش قسمت ہیں کہ ہمیں حضرتِ واصفؒ کی صدی نصیب ہوئی۔ قولِ واصفؒ ...... قولِ فیصل ہے ...... تنہائی کے لمحے میں خیال کی میزان گاہ میں فیصلے کی مشکل گھڑی کو آسان کر دیتا ہے۔ حضرت واصف علی واصفؒ کا ایک

ایک قول فیصلہ کن ہے......اور ہر قول ایک حرفِ کُن کی طرح انسان کو اندر سے بدلنے کی قدرت رکھتا ہے......اور جس دم اندر روشنی کوندگئی' باہر اُجالے کا ظہور رو وقدم ہے۔

واصفؒ خیال ایک قافلہ ہے......بصیرت کا......نور کا......خیال کا......!! واصفؒ خیال......خیال کے میزان کو درست کرنے اور پھر درست رکھنے کا پیانہ ہے۔ خیال درست ہو گیا تو حال کا درست ہونا لازم ٹھہرے گا۔ درحقیقت حالات سے بہت پہلے خیالات کے درست ہونے کی ضرورت ہے......اعمال کی صف کھڑی کرنے سے پہلے نیتوں کے وضو کی ضرورت ہے۔



چہروں کی شناخت روشنی ہی میں ممکن ہے......
اندھیرا سب سے پہلے چہروں کی شناخت چھین لیتا ہے
روشنی......معرفت ہے......
اندھیرا......عدم معرفت !!
(دلِ ہر قطرہ)

بے حسی کا زہر

بے حسی کا زہر ایک نشے کی طرح بتدریج رگ و پے میں اُتر جاتا ہے اور بالآخر فنا کے گھاٹ اُتار دیتا ہے۔ ہر خود غرض بے حس ہوتا ہے اور ہر دردمند ایک حساس دل کا مالک ہوتا ہے۔ بے حسی یہ ہے کہ انسان اپنی ظاہری اور باطنی ذمہ داریوں سے غافل ہو جائے۔ ظاہری ذمہ داریاں حقوق العباد کے زمرے میں آتی ہیں اور باطنی ذمہ داریاں حقوق اللہ کا زمرہ ہیں۔ ظاہر اور باطن میں فرق بغرض تفہیم ہے۔ جب تفہیم مکمل ہو جاتی ہے تو فرق نکل جاتا ہے...... تفریق ختم ہو جاتی ہے۔ ظاہر اور باطن میں ثنویت کا ایک ربط ضرور ہے لیکن اس ربط میں ہیشگی نہیں ہے۔ ثنویت کا تعلق صرف انسانی شعور کے ساتھ ہے، وگرنہ حق اور مظاہرِ حق سب لباسِ حقیقت میں ہیں......اور حقیقت میں دوئی کا شائبہ نہیں۔ اس طرح حقوق العباد سب کے سب حقوق اللہ ہی ہوتے ہیں، کیونکہ بندے سارے کے سارے اللہ کے بندے ہی تو ہوتے ہیں۔ بے حسی حقوق کا نعرہ بلند کرتی ہے لیکن اپنے فرائض کی آواز پر کان نہیں دھرتی۔ ایک حساس دل اپنے فرائض تو کیا' نوافل تک ادا کرنے میں منہمک رہتا ہے...... یہی وجہ ہے' اکثر محل قرب میں پایا جاتا ہے۔

اِحساس انسان کے اندر ایک ہدی خواں ہے' یہ قافلۂ خیال کو جادہ پیا رکھتا ہے۔ جس نے اِحساس کو سُلا دیا' اُس نے ضمیر کو سُلا دیا۔ جب ضمیر سو جاتا ہے تو کان بہرے ہو جاتے ہیں اور ناصحین کا سب کام اور کلام صدا بصحرا ہو کر وقت کی دھول میں گم

ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مصلحین کی ساری تگ و دَو انسان کے اندر اِحساس کی جوت جگانے پر مرکوز رہتی ہے۔ سزا کی ٹکٹی پر باندھ کر کوڑوں سے بھنبھوڑنا منتظمین کا کام ہے، مصلحین کا کام صرف ضمیر کو جھنجھوڑنا ہے۔ دراصل حال کی اصلاح کا تعلق خیال سے ہے اور خیال کا تعلق باطن سے۔ باطن اصل ہے' ظاہر اس اصل کی نقل ہے۔ اصل کو چھوڑ کر نقل کے پیچھے پڑنا ایک نقلی کام ہے۔ وجود کو چھوڑ کر سائے پر ڈنڈے برسانے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ اصل کام اصلاح ہے...... اور اصلاح' بغرض فلاح ہوتی ہے!!

اِحساس ایک نعمت ہے۔ درد کی دولت بڑی دولت ہے۔ اس لیے دردمند' دولت مند ہوتا ہے اور بے حس مفلس ہوتا ہے۔ معاشرے میں غربت روپیہ پیسہ کم ہونے سے نہیں ' بلکہ بے حسی کی وبا پھیل جانے سے بڑھتی ہے۔ انسان بھوک برداشت کر لیتا ہے' اپنوں کی بے رُخی برداشت نہیں کر سکتا۔ جب ہم اپنے اردگرد لوگوں سے غافل ہو جاتے ہیں تو لوگ غریب ہونے لگتے ہیں۔ وطن میں رہتے ہوئے غریب الوطن کر دینے والی چیز اپنوں کی بے حسی ہے۔ جب سے انسان نے اِحساس کے نخلستان سے نکل کر بے حس عمارتوں میں پناہ لی ہے' عمارتوں اور امارتوں کی ملی بھگت سے شہروں میں غربت پھوٹ پڑی ہے۔ اگر ہر شخص اپنے سے غریب صرف ایک شخص کا ہاتھ تھام لے تو زندگی کی شام پڑنے سے پہلے غربت ختم ہو جاتی ہے۔ کوئی غریب ایسا نہیں' جس سے بڑھ کر کوئی غریب نہ ہو اور کوئی امیر ایسا نہیں جس کے مقابلے میں کوئی امیر نہ ہو۔

اِحساس خاموش ضرور ہوتا ہے لیکن فراموش نہیں ہوتا۔ خاموشی کے گہرے ساگر میں ڈوب جانے کے بعد بھی احساس کی بارہ دری بالآخر بازیاب ہو جاتی ہے۔ بے حسی صرف چرب زبانی کا ہنر جانتی ہے۔ بے حس آدمی اپنی چرب زبانی سے اپنے عیب چھپاتا ہے اور دوسروں کے پول کا ڈھول بجاتا رہتا ہے۔ بے حسی دردمندی کی عظمت سے ناآشنا

ہے، کیونکہ دردمندی درپردہ اپنے مزاج میں ستار العیوب ہوتی ہے۔

بے حس انسان اپنا گھر، اپنا ملک چھوڑ کر غیروں کی بستیاں آباد کرنے چل نکلتا ہے۔ یہاں اپنوں کے کام نہیں آتا' وہاں غیروں کی غلامی قبول کر لیتا ہے۔ بے حس آدمی لذتوں کی سواری ترک نہیں کرتا' خواہ اس کی قیمت اسے عمر بھر کی غلامی کی شکل میں ادا کرنی پڑے۔ ایک لذت سے نجات' ہزار غلامی سے نجات ہے۔ کسی لذت کو زیر کرنا دراصل کسی ممکنہ زوال کی پیش بندی کرنا ہے۔ خود کو فتح کرنے کا موضوع صرف ایک حساس دل میں جگہ پاتا ہے۔ خواہش کو فتح کرنا دراصل اپنے وجود کی راجدھانی میں راج کرنا ہے۔ خواہش کے زیر اثر ہونا وجود کے ہاتھوں مفتوح ہونا ہے۔ انسان کی عظمت' حیوانی جبلتوں پر فتح پانے میں لکھ دی گئی ہے۔ علم کی ساری داستان حیوانی سطح سے نکل کر روحانی سطح پر متمکن ہونے میں رقم ہو جاتی ہے۔ انسان ہونے کی حیثیت سے جسمانی جبلتوں کے پیچھے چلنا ایک اعلانِ شکست ہے اور انہیں مشتہر کرنا ایک اعلانِ جہالت۔ خواہش کے زور سے چلنے والی سواری بہت تیز رفتار ہوتی ہے، اس لیے اپنی ہلاکت کا سامان اپنے ساتھ ساتھ لیے پھرتی ہے۔ خواہش زور کی ہو یا زر کی' ہوا کے گھوڑے پر سوار ہوتی ہے۔ یہ صرف قناعت ہے جسے قیام کا ملکہ حاصل ہے۔ مشاہدہ اور مکالمہ ایک صاحبِ قیام ہی کا نصیب ہے۔ ایک دوڑتے ہوئے شخص کا منظر اس کے مطمعِ نظر کی طرح ڈگمگاتا رہتا ہے۔ اس کے پاؤں میں لغزش ہوتی ہے اور عزم میں لرزش!!

ایک چھت کے نیچے اگر دو مزاج اکٹھے ہو جائیں تو ایک ظالم ہو جاتا ہے اور دوسرا مظلوم! بے حس آدمی ظالم ہوگا اور صاحبِ احساس بالعموم مظلوم! ظالم' سیاہ کار ہوتا ہے ...... اور مظلوم ہمیشہ کیلئے سرخ رُو!! حضرت واصف علی واصفؒ فرمایا کرتے ''ظالم ہونے سے بہتر ہے' مظلوم ہو جاؤ۔'' مظلوم اگر دوسرے مظلوموں کے حق میں ظالم نہ بنے تو ظاہر

سے نکل کر باطن میں قدم رکھ سکتا ہے۔ احساس دراصل خود شناسی کے سفر کی پہلی منزل ہے۔

اِحساس سے محروم آدمی قرب اور قربانی کے تصور سے محروم ہے۔ وہ اُس سرخوشی سے محروم ہے، جس کا لطف صرف اُسی کا حصہ ہے جو اپنا حق دوسروں کی خوشی کیلئے بخوشی چھوڑ دیتا ہے۔ خوشی اور سرخوشی میں یہی فرق ہے۔ خوشی صرف ظاہری ہوسکتی ہے، سرخوشی لازم ہے کہ باطنی ہو۔ احساس کرنے والا ہی احسان کرنے کیلئے کوالیفائی کرتا ہے۔ جو احساس سے محروم ہے، وہ احسان کرنے اور احسان ماننے کی صلاحیت سے بھی محروم ہے۔ معاشرے احساس اور احسان کے ہاتھوں میں پرورش پاتے ہیں۔

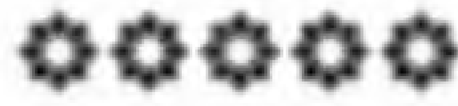
بے بسوں کی مجبوریوں سے فائدہ اٹھانے کا ہنر صرف بے حس لوگوں کے ہاں جنم لیتا ہے۔ ذاتی مفاد کو ملی مفاد پر ترجیح دینا صرف ایک بے حس آدمی کا حوصلہ ہوتا ہے۔ بے حسی کی انتہا غفلت ہے اور غفلت تکبر سمیت تمام گناہوں کا ابتدائیہ ہے۔ بے حس آدمی دوسروں کے جذبات کو اپنی اُنا کے تلووں تلے روندتا چلا جاتا ہے ...... اُسے اس کا اتنا احساس بھی نہیں ہونے پاتا، جتنا ایک شاہراہِ عام پر چلنے والے عام آدمی کو اپنے پاؤں کے نیچے آنے والے خشک خزاں دیدہ پتوں کی چُر مُراہٹ کا ہو جاتا ہے۔

بے حسی کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ احساسِ زیاں جاتا رہتا ہے۔ بے حسی کی پہلی نشانی یہ ہوتی ہے کہ وقت کے ضیاع کا احساس نہیں رہتا۔ بے حس انسان اپنا وقت بھی ضائع کرتا ہے اور اپنے ساتھ ساتھ دوسروں کا وقت بھی بڑی فراخدلی سے ضائع کرتا رہتا ہے۔ اگر اپنے زیاں کا احساس پیدا ہو جائے تو اصلاحِ احوال ممکن ہے۔ درِ احساس وا ہو، تو ظاہری اور باطنی ترقی کا زینہ نظر آنے لگتا ہے۔

؎ وہ مطمئن کہ زیاں جو ہوا، ہوا واصف ۔۔۔ مجھے یہ فکر کہ ہو کیسے وا، درِ احساس

بے حسی کے زہر کا تریاق یہ ہے کہ کسی صاحبِ اِحساس کی سنگت اختیار کی جائے۔

جیسی سنگت ہوتی ہے' ویسا خیال تشکیل پاتا ہے ......اور جیسا خیال ہوتا ہے' ویسا ہی حال مرتب ہونے لگتا ہے۔خوش حال ہونے سے پہلے خوش خیال ہونا لازم ہے۔



کرختگی لہجے کی ہو یا الفاظ کی ......انسان کو احساس سے محروم کر دیتی ہے......
یہاں تک کہ اُسے اپنے کرخت ہونے کا احساس تک نہیں گزرتا!!
(دلِ ہر قطرہ)

دفاع اور مدافعت

ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ کی یاد میں قوم ہر سال ۶ ستمبر کو یوم دفاع مناتی ہے۔ یہ ایک یوم عزم ہے...... یومِ دفاعِ پاکستان 'یومِ عزمِ پاکستان ہے۔ اپنے دفاع کا عزم دُہرانا' زندہ اور باشعور قوموں کی نشانی ہے۔ اس عہد کو ہر عہد میں زندہ رکھنا چاہیے...... یہ پیغام دہراتے رہنا چاہیے کہ وطن عزیز کی عزت وحرمت کی سرحدیں پامال کرنے والوں کو دنداں شکن جواب دیا جائے گا۔

ملک کی مثال ایک گھر کی سی ہے۔ اگر کوئی گھر کی دیواریں گرا کر راستہ بنانے کی کوشش کرتا ہے تو سب گھر والے اپنے اختلافات کو پسِ پشت ڈالتے ہوئے اس تخریبی کوشش کو ناکام بنادیتے ہیں۔ گھر کی دیواریں گھر کی شناخت ہوتی ہیں، ملکوں کی سرحدیں بھی گھر کی دیواروں کی طرح ہیں، دروازے سے آنے والوں کا استقبال کیا جاتا ہے اور دیواریں پھلانگ کر آنے والوں کا سواگت کسی اور طرح کیا جاتا ہے...... جیسی نیت ہوتی ہے' ویسی ہی اس کے ساتھ سلوک کی نوعیت ہوتی ہے۔

ایک حویلی میں رہنے والے، ایک باپ دادا کی اولاد کے درمیان بھی اگر نظریاتی اختلاف پیدا ہو جائے تو صحن میں دیوار کھڑی ہو جاتی ہے۔ گویا دیوار جس بنیاد پر کھڑی ہوتی ہے' اس بنیاد کا نام نظریہ ہے۔ گھر کی چار دیواری کا قیام اگرچہ اینٹ بجری سیمنٹ سے ممکن بنایا جاتا ہے لیکن اس قیام کو دوام' اخلاقی اور روحانی نظریے سے وابستگی سے ملتا ہے۔

دیواریں صرف جدائی کی داستان نہیں' ہمسائیگی کا نشان بھی ہیں۔ اچھے ہمسائے وہی ہیں جو اِن دیواروں کا احترام ملحوظ رکھتے ہیں۔ بدنیت ہمسائے انہیں پھلانگنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اُن کی نیت میں بدی کا ثبوت یہ ہوتا ہے کہ وہ سازشوں کے تانے بانے جوڑ کر دیواریں گرانے کی کوشش میں مصروف رہتے ہیں، ایسے میں ان کے میٹھے الفاظ اور کھٹے لہجوں میں دھمکی کی دھمک صاف سنائی دیتی ہے۔

پس فرسٹ لائن آف ڈیفنس ...... نظریہ کی حد بندی ہے، اور اِس لائن آف ڈیفنس پر دانشور، شاعر، صحافی اور لکھاری کھڑے ہیں، سیکنڈ لائن آف ڈیفنس پر افواجِ پاکستان ڈیوٹی دے رہی ہیں۔ قلم کار کا قلم ایک توپ کی طرح ہے، یہ توپ اپنے ہی عوام پر گولہ باری شروع کر دے تو اِس کی مثال اُس ٹرِپل وَن بریگیڈ کی طرح ہوگی جو اپنا ہی ملک فتح کر کے اقتدار پر قبضہ کرلے۔

جو لوگ اپنی شناخت پر شرمندہ ہوں، جنہیں اپنے تشخص پر ندامت ہو' وہ اپنا دفاع کیسے کریں گے۔ اپنے حال کو ہر حال میں بدحال بتلانے والے' مستقبل کو خوشحال بنانے کا لائحہِ عمل کب بتائیں گے؟ صرف تشخیص کر دینے سے بیماری دُور نہیں ہوتی' مریض کو علاج بھی چاہیے اور شفا بھی۔ بعض نادان طعن وطنز کو اِصلاح کا ہتھیار سمجھتے ہیں۔ کاہلی اور بیماری کے طعنے دلوں کو زخمی کرتے ہیں ...... ضرورت دلوں کو جوڑنے کی ہے۔ طعنہ زن کا نشتر اور ہے ...... اور سرجن کا نشتر اور!! طنز میں اتنی تمیز کہاں کہ وہ اصلاح کر سکے!!

اپنے تشخص کا اِدراک اور جارح کا تعین کیے بغیر دفاع ایک حرفِ لایعنی ہے ...... کس کا دفاع؟ کس لیے؟ کس کے خلاف؟؟ دفاع جارحیت نہیں' جارحیت کا سدِّ باب ہے۔ ہر آزاد قوم کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے دفاع کو یقینی بنانے کیلئے ہر ممکن طریقے سے تیاری کرے۔ اگر کوئی ہمارے حق دفاع کو تنقید کا نشانہ بناتا ہے، ہماری دفاعی تیاریوں پر

چیں بچیں ہوتا ہے' تو اُس کا شمار دوستوں میں نہیں' صفِ دشمناں میں ہوتا ہے۔

دفاع مدافعت سے ہے، اگر قوتِ مدافعت مضبوط ہو تو جارح سَو بار سوچتا ہے' جبکہ کمزور دفاع جارحیت کی دعوت ہے۔ قوموں کے حوالے سے یہ بات طے ہے کہ قوت زندگی ہے، کمزوری موت! انفرادی اصولوں اور اجتماعی اصولوں میں اسی طرح فرق ہوتا ہے' جس طرح انفرادی نفسیات اور مجمع کی نفسیات mob psychology میں فرق ہے۔ فلسفۂ اقبالؒ کی رُو سے...... فطرت افراد کے اعمال سے اغماض تو کر لیتی ہے لیکن ملّت کے گناہوں کو کبھی کرتی نہیں معاف...... ملت کے گناہوں میں سرِ فہرست جرمِ ضعیفی ہے...... اور تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے کہ

ع ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

جرمِ ضعیفی ملت کے گناہوں میں ایک شدید درجے کا گناہ ہے، کہ از رُوئے قرآن مومنین کو حکم دیا گیا ہے کہ اپنے گھوڑے تیار رکھو تاکہ تمہارے دشمن پر تمہارا رعب قائم رہے۔ اگر ہم گھوڑے تیار رکھنے کی بجائے خود ہی گھوڑے بننے کیلئے تیار رہیں تو میدانِ جنگ میں ہمیں بھگوڑے بننے سے کون روک سکتا ہے۔ ہمیں گھوڑا بننا ہے' نہ ہی بھگوڑا...... اور نہ ہمیں گھوڑوں کی تجارت ہی کرنا ہے۔ گھوڑوں کی تجارت کو آج کے اسلوبِ بیاں میں ہارس ٹریڈنگ کہتے ہیں، یعنی وفاداریاں بدلنے کی سیاست!! وفاداریاں بدلنا ضمیر کی تجارت ہے ...... اور یہ تجارت منافقت کے سائبان کے نیچے ہوتی ہے۔ نصرت کا وعدہ مومنین کے ساتھ ہے، منافقین سے نہیں!!...... منافقین کو بلکہ وعید ہے...... عذابِ الیم کی!!

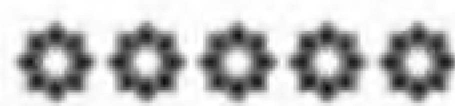
دفاع ...... آزادی کا تحفظ ہے۔ آزادی کا تحفظ شعور کی بیداری سے ممکن ہے۔ بیدار قومیں معاملاتِ حکومت میں عوام کو شریکِ کار رکھتی ہیں، بیدار مغز قومیں آپس میں اختلافِ رائے رکھنے کے باوجود ملکی سلامتی کے متعلق اتفاقِ رائے رکھتی ہیں...... اس لیے وہ

بیرونی جارح کیلئے لوہے کا چنا ثابت ہوتی ہیں۔ اگر مقصد کی وحدت دریافت ہو جائے تو اِختلاف باعثِ رحمت ہو جاتا ہے۔ دراصل اختلافِ رائے کسی اتفاقِ رائے تک پہنچنے کے لیے ہونا چاہیے۔ اختلاف 'افتراق کی احتراق تک نہ پہنچے تو رحمت، ورنہ زحمت! جن ملکوں میں اختلافِ رائے بزورِقوت دبا دیا جاتا ہے' وہاں کی عوام شعور کے پالنے سے باہر نہیں نکل پاتی۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ جذباتی نعروں کے جھنجھنوں سے کھیلتی رہتی ہے' اندر سے کھوکھلی رہتی ہے...... اور بالآخر دشمن کی جھولی میں پکے ہوئے پھل کی طرح گر جاتی ہیں۔ جو قوم اپنے سر پر مسلط ظالموں سے چھٹکارا نہیں پا سکتی' وہ بیرونی حملہ آوروں کا مقابلہ کیسے کرے گی!! حضرت واصف علی واصفؒ کا ایک معروف قول ہے: '' آزادی کی صرف ایک ہی قیمت ہے، بیداری اور مسلسل بیداری! غلام قومیں سوتی ہیں، آزاد قومیں بیدار رہتی ہیں!''

دفاع کی بہترین قسم یہ ہے کہ عوام کے اجتماعی شعور کی پرورش کی جائے۔ عام آدمی کی زندگی آسان بنائی جائے۔ اسے ملکی معاملات میں شریکِ سفر رکھا جائے، ہر فرد کو ملت کے مقدر کا ستارا بنایا جائے۔ فرد کو فرداً فرداً عزت دے دی جائے...... قوم باعزت ہو جائے گی۔ لوگ جمہوریت کیلئے مغرب کی طرف دیکھتے ہیں، حالانکہ جمہوریت کا پہلا سبق ہمیں اسلام نے دیا ہے ...... مومنوں کی شان...... وامرُھم شُورٰی بینھم بیان کی گئی ہے ...... یعنی وہ اپنے معاملات کو آپس میں مشاورت سے چلاتے ہیں۔

ہمارے دفاع کا راز ہماری یک جہتی میں چھپا ہے...... اِس راز کی خبر ہمیں ہو نہ ہو' ہمارے دشمنوں کو خوب ہے۔ ہم اپنی نسلی، علاقائی اور لسانی عصبیتیں ترک کرنے سے پاکستانی قوم بنے ہیں...... یہی ہماری قوت ہے۔ اپنی قوت کا تحفظ نہ کیا جائے تو یہی کمزوری بن جاتی ہے۔ اگر ہم خدانخواستہ دوبارہ اپنی عصبیتوں کی طرف لوٹ جاتے ہیں تو پاکستان کا جواز ختم ہو جاتا ہے۔ گویا ہمارا اتحاد' پاکستان کی اصل دفاعی قوت ہے...... اور انتشار' ملک

کی کمزوری ہے!! ایک حدیثِ پاک کا مفہوم ہے کہ عصبیت جہالت ہے۔ گویا پاکستان دوستی علم ہے اور پاکستان دشمنی جہالت!! پاکستان کی بنیاد کلمہ طیبہ اِس طرح ہے کہ ہم نے اپنے اپنے زمینی تشخص کی نفی کی ہے اور ایک روحانی شناخت کا اقرار کیا ہے! انکار جتنا شدید ہوگا' اقرار اتنا ہی طاقتور ہوگا۔ دوسرے لفظوں میں ہم نے کلمہ توحید کا اقرار اجتماعی طور پر کیا ہے۔ اب اس پیمانِ وفا سے رُوگردانی ایک فتنۂ ارتداد ہے۔ ہمارے صوبے، ہماری زبانیں، برادریاں اور ذاتیں صرف ایک دوسرے سے تعارف کا ذریعہ ہیں...... اور کچھ نہیں ...... اگر اس تعارف سے مراد تعارف کے علاوہ کچھ اور بھی ہے تو ہماری تعریف definition ختم ہو جاتی ہے۔ یہ جمال عبدالناصر کا مصر تو نہیں کہ ہم اپنا تشخص اسلام کی بجائے قبل از اسلام فراعین سے جوڑتے پھریں۔ افسوس! ایسے متعصب لوگ بھی ہیں کہ خود کو راجہ داہر کے بیٹے کہتے ہیں اور اپنا رشتہ زندہ کلمے کی بجائے بے جان زمین سے جوڑتے ہیں۔ مشاہدہ یہی ہے کہ آسمانی پیغام کی قربت ترک کرنے کے بعد زمینی رشتوں میں قرابت ڈھونڈنے والے اپنی مٹی خراب کر لیتے ہیں۔



ناشکرگزار...... ہر نعمت سے محروم ہے......
کیونکہ احساسِ شکر...... نعمت کو محسوس کرنے کی صلاحیت کا نام ہے۔
(دلِ ہر قطرہ)

وقت کے گوشوارے

جس طرح مالیاتی گوشوارے بے ترتیب ہو جانے سے آدمی قلاش ہو جاتا ہے' اسی طرح وقت کا گوشوارہ بگڑ جائے تو انسان کا مستقبل گروی رکھ دیا جاتا ہے۔ دراصل وقت بھی ایک قوت ہے' اگر ترتیب میں آ جائے۔ وقت بھی ایک دولت ہے اگر استعمال کرنے کا سلیقہ پیدا ہو جائے۔ وقت دولت ہے' لیکن ایک واضح فرق کے ساتھ' کہ دولت لُٹ جائے تو دوبارہ پیدا کی جا سکتی ہے' وقت برباد ہو جائے تو نئے سرے سے آباد نہیں ہو پاتا۔ ظاہر ہے' سجدۂ شکر میں اور سجدۂ سہو میں فرق ہوتا ہے۔ جس طرح ہماری دولت صرف ہماری نہیں ہوتی' اسی طرح ہمارے وقت پر بھی صرف ہماری ہی اجارہ داری نہیں ہوتی۔ ہماری دولت کی طرح ہمارے وقت میں بھی اُن لوگوں کا حصہ ہوتا ہے جو ہمارے وقت کو قیمتی بنانے میں حصہ دار نہیں ہوتے۔ اپنے وقت کو صرف اپنے مفادات کیلئے وقف کر دیا جائے تو یہ دولت کی ذخیرہ اندوزی کی طرح قابلِ احتساب ٹھہرتا ہے۔ ہم مصروف ہو جانے کو وقت کا مصرف جانتے ہیں' اور اس پر فخر بھی کرتے ہیں۔ مصروفیت اگر صرف اپنے عزائم کی تکمیل کا شعبہ بن جائے تو ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ مصروفیت ندامت میں بدل جاتی ہے۔ صرف وہی مصروفیت بے بدل ہے' جو دوسروں کی خدمت کیلئے اختیار کی جائے۔ دائرۂ خدمت میں داخل ہونا دراصل دارالخلد میں داخل ہونا ہے۔ وقت بھی رزق ہے، بانٹنے سے بابرکت ہو جاتا ہے، پورا پڑ جاتا ہے!!

کسی کو انتظار میں رکھنا اُس کا وقت ضائع کرنا ہے ...... اور کسی کے وقت کو اپنے وقت سے کم قیمتی سمجھنا دراصل اس کی توہین کرنا ہے۔ صاحبانِ خدمت سائل کی خدمت کے ساتھ ساتھ اُس کی تکریم کرنے کا فن بھی جانتے ہیں۔ کسی کی عزت کرنے کا پہلا قدم یہ ہے کہ اس کے وقت کی قدر کی جائے۔ سائل کو انتظار کے زینے پر بٹھائے رکھنا سائل اور سخاوت دونوں کی توہین ہے۔ خدمت خیرات نہیں ہوتی کہ راہ چلتے چونیاں اٹھنیاں گراتے جائیں۔ خدمت ذاتی شمولیت ہے ...... ایک personalised activity ہے۔ یعنی خدمت کا شعبہ ذات سے ذات تک کا سفر ہے۔ ان معنوں میں خدمت اور معرفت کی سرحدیں ملنا شروع ہو جاتی ہیں۔ احساس کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے کہ جس طرح ہمارے مال کی زکوٰۃ ہم پر فرض ہے اس طرح ہمارا قیمتی وقت اور بیش قیمت تعلقات بھی زکوٰۃ کے نصاب میں آتے ہیں۔ وقت اور تعلقات گرچہ ہمارا خزانہ ہیں، لیکن اِن خزانوں پر سانپ بن کر نہیں بیٹھ جانا چاہیے۔ خزانے انسانوں کیلئے ہوتے ہیں۔ ہمیں اپنے وقت اور تعلقات کا کچھ حصہ غریبوں کیلئے ضرور وقف کرنا چاہیے۔ بہت سے لوگ ایسے ہوتے ہیں' جن کا مستقبل ہماری زبان ہلانے سے سنور سکتا ہے۔ غریبوں کا حال بہتر بنا دیا جائے تو امیروں کا مستقبل محفوظ ہوسکتا ہے۔ وقت اگر وقف کر دیا جائے تو بچ جاتا ہے، بصورتِ دیگر برباد ہو جاتا ہے اور برباد کر دیتا ہے۔ حقوق اور فرائض کے باب میں دوسروں کے حقوق پورے کرنا اپنے فرائض کے زمرے میں آتا ہے' خدمت کے دائرے میں نہیں۔ خدمت تو نوافل کا درجہ ہے۔ خدمت دراصل قربانی کا عمل ہے!!

غریبوں کیلئے دولت خرچ کرنا آسان ہے' اُن کیلئے خود خرچ ہونا مشکل ہے۔ دولت خرچ کرنا آدھی سخاوت ہے' اور اپنا وقت صرف کرنا پوری سخاوت! وقت خرچ کرنا دراصل مخلوق کے دکھ سمیٹنا ہے' یہ اُن کے دکھوں کی گٹھڑی اپنے سر اُٹھا کر سفر کرنے کا نام

ہے۔ جب ہم اپنے وقت پر خود متصرف ہوتے ہیں' تو ظلم کماتے ہیں' اپنے ساتھ بھی ظلم کرتے ہیں اور دوسروں کے حق میں بھی ظالم ٹھہرتے ہیں۔ دراصل ملکیت کا احساس ہی ظلم کا آغاز ہے۔ دولت کی طرح اپنے وقت کو بھی غریبوں کی پہنچ سے دُور رکھنے والے جب اپنے گوشواروں کی پڑتال کرتے ہیں تو خود کو غریب پاتے ہیں۔ عجیب بات ہے' ہم نفع کے لالچ میں گھاٹے کا سودا کر لیتے ہیں۔

وقت ایک مہلت ہے ...... اور یہ مہلت دراصل مہلتِ عمل ہے۔ مہلتِ عمل ختم ہو جائے تو فیصلہ سنا دیا جاتا ہے۔ فیصلہ سنا دیے جانے کے بعد بابِ توبہ بند ہو جاتا ہے اور بابِ عبرت کھل جاتا ہے۔ اگر توبہ محض قول کا معاملہ ہوتا تو ہر کوئی اقرار کرنے پر قادر ہوتا لیکن توبہ عمل کا نام بھی ہے۔ نیک عمل کیلئے نیک نیتی کے ساتھ ساتھ توفیقِ خداوندی کا ملنا شرط ہے۔ لطف کی بات تو یہ ہے کہ توبہ کسی عمل سے رُک جانے کا عمل بھی ہے۔ یہ عجب ''بے عملی'' ہزار عملوں پر بھاری ہے۔ اس دنیا میں' دنیا کے ساتھ حرکت کرنا آسان ہے، رُک جانا مشکل!! شور اور شورش برپا کرنا آسان ہے' سکون اور امن قائم کرنا دشوار! کم ہمت لوگ ہجوم کے ریلے میں بہہ جانا قبول کر لیتے ہیں اور عالی ہمت' شوریدہ سر لہروں کے درمیان چٹان کی مانند قیام کرنا پسند کرتے ہیں۔ جو ٹھہر گیا' وہ نجات پا گیا۔ کوہِ ارارات میں جودی کی چوٹی ہو یا جہلم میں ٹلہ جوگیاں' نجات کی کشتی قیام کے ساحل پر ہی لنگر انداز ہو گی!!!

وقت ایک نعمت ہے ...... اس نعمت کی قدر یہ ہے کہ اسے بروقت اور درست استعمال کیا جائے۔ نعمت کا ضائع کرنا درحقیقت منعم کی ناقدری ہے۔ قطبِ ارشاد حضرت واصف علی واصفؒ کا ارشاد ہے: ''نعمت کا شکر یہ ہے کہ اسے اُن لوگوں کی خدمت میں صرف کیا جائے جو اِس نعمت سے محروم ہیں''

وقت ایک امانت بھی ہے۔ وقت کو ضائع کرنا دراصل امانت میں خیانت کرنا

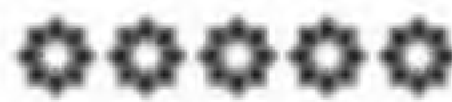
ہے۔ جب ہم وقت ضائع کرتے ہیں تو صرف اپنے وقت ہی کا ضیاع نہیں کرتے بلکہ اپنے وقت میں شریک بے شمار لوگوں کے وقت کا خون بھی اپنے سر لیتے ہیں۔ وقت مچھیرے کے جال کی طرح ہے' جس کے حلقے دامِ خیال کی طرح ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح بندھے ہوئے ہیں کہ ایک حلقہ تنگ پڑتا ہے تو اپنی قربت میں موجود سب حلقوں کا ناطقہ بند کر دیتا ہے۔ وقت کی پابندی نہ کرنا وعدہ خلافی کی ایک شکل ہے۔ دراصل ہماری زندگی میں جو لباس ہمارا بھرم قائم رکھتا ہے اس لباس کی بُنت وقت کے تانے بانے سے کی جاتی ہے۔ وقت کا تانا نکل جائے تو ہمارا بھرم تار تار ہو جاتا ہے۔ کرم کے دائرے میں ہونے کا ایک مفہوم' بھرم کا قائم رہنا ہے۔ چھوٹے کرم' ٹوٹے بھرم۔ اپنے وقت کے ساتھ مخول' ٹھٹھا کرنے والا بالعموم کرم کی چادر سے نکل جاتا ہے۔

وقت واقعات کی ترتیب ہے۔ یہ واقعات کو ایک دوسرے کے ساتھ منسلک بھی کرتا ہے اور منضبط بھی۔ دو واقعات کے درمیان وقت کی زنجیر ایک کو سبب اور دوسرے کو نتیجہ قرار دیتی ہے۔ وقت ماضی، حال اور مستقبل کی ترتیب باندھتا ہے۔ اسی سبب سے ہم ماضی کو حال کا سبب جانتے ہیں اور مستقبل کو حال کا نتیجہ۔ سبب اور نتیجہ ایک پردہ ہے' جو مشیتِ الٰہیہ کو مخلوق کی نظر سے اوجھل رکھتا ہے۔ سنتِ الٰہیہ یہی ہے کہ مشیتِ الٰہیہ کا ظہور سبب اور نتیجے کی صورت میں ظہور پذیر ہو۔ گویا سنتِ الٰہیہ بھی میم کے پردے کی طرح رُخِ حقیقت پر آویزاں رہنے والا راز ہے۔ وقت...... واقعات اور افراد کے درمیان ایک حدِ فاصل بھی ہے اور ربط اور رابطہ بھی! معانی کے ظہور کیلئے ربط بہت ضروری ہوتا ہے۔ حال بے ربط ہو جائے تو ماضی سے رابطہ دشوار ہو جاتا ہے۔ وقت حال ہے' اور حال کے بے ترتیب ہو جانے سے مستقبل بے ترتیب ہو جاتا ہے۔

اپنے وقت سے غافل ہونا ایسے ہے' جیسے اپنے ذکر سے غافل ہونا۔ ذکر صرف

زبان کی عبادت ہوسکتی ہے لیکن وقت کی حفاظت زبانِ حال سے کی جانے والی عبادت ہے۔ وقت اور عبادت کے تعلق میں بھی عجیب راز ہے۔ صوم، صلوٰۃ، حج، زکوٰۃ سب اپنے اپنے معیّن وقت پر ادا ہونے والے فرائض عبودیت ہیں۔ فرض معیّن وقت پر ادا نہ ہو' تو قضا فرض ہو جاتی ہے۔

وقت زندگی ہے۔ زندگی کو سنوارنا چاہیے۔ سنورنا اور سنوارنا ترتیب میں ہونا اور ترتیب میں کرنے کا عمل ہے۔ حسن دراصل حسن ترتیب کا نام ہے۔ شانہ ہستی کی مشاطگی وہی کر سکتے ہیں' جو اپنے وقت کی حفاظت کرتے ہیں۔ جس نے وقت کی حفاظت کی وہ حفاظت میں آ گیا۔ وقت کے گوشوارے ترتیب میں آ جائیں تو قدرت کے ہاتھوں ہونے والی گوشمالی سے بچا جا سکتا ہے۔ وقعت اسی قوم کی ہوتی ہے' جو اپنے وقت کی حفاظت کرتی ہے۔ جس نے وقت ضائع کر دیا' اُس کی کیا وقعت' کیا اوقات!!



زندگی ایک اُمر کی تجسیم ہے
......جسم ختم ہو جائے گا، اور اُمر قائم رہے گا'
تجسیم کو فنا ہے......اور تجرید کو بقا حاصل ہے!
(دلِ ہر قطرہ)

جینا، مرنا اور جینا!!

جسے جینا نہیں آئے گا' اُسے مرنا بھی نہیں آئے گا۔ جسے مرنا آ جائے' یا کم از کم مرنا یاد آ جائے' اسے جینے کا سلیقہ بھی آ جاتا ہے۔ مرنے سے پہلے مرنے کے مقام سے آگاہی حاصل کر لینا ضروری ہے، وگرنہ انسان بے موت مارا جاتا ہے۔ دراصل حیاتِ ابدی دو موتوں کے بعد ہے۔ پہلی موت انسان کو خود قبول کرنا ہوتی ہے...... اور دوسری موت میں وہ قبول کر لیا جاتا ہے۔ مرنے سے پہلے مرنے کا مقام صرف ایک درویش پر منکشف ہوتا ہے۔ موت خود ایک مکاشفہ ہے...... کیونکہ موت سب حجاب دُور کر دیتی ہے۔ حکم ہوا کہ موت لذاتِ وجود کو منقطع کرنے والی حقیقت ہے۔ اس روایت سے یہ درایت کی جاتی ہے کہ جو لذاتِ وجود سے خود کو منقطع کر لے' اس پر موت کی حقیقت منکشف ہو سکتی ہے۔

زندگی ایک اختیار ہے اور موت' زندگی کے سب اختیارات واپس کرنے کا نام۔ اگر اختیاراتِ وجود اَز خود واپس نہ کیے جائیں تو چھین لیے جاتے ہیں۔ ریٹائرمنٹ ایک اعزاز ہوتی ہے اور ٹرمینیشن' مقامِ عبرت۔ زندگی ایک منصب ہے...... اس جائے منصب پر جو انصاف کرے گا' وہی عہدہ بَرآ تصور ہوگا، اور جو اِس منصب پر خود کو قابض تصور کرے گا' وہ من مانی کرنے کو بھی اپنا پیدائشی حق سمجھے گا...... وہ برخاست کر دیا جائے گا۔ عہدہ بَرآ ہونے میں اور برخاست ہونے میں وہی فرق ہے' جو عزت اور عبرت میں ہوتا ہے...... حالانکہ عزت اور عبرت دونوں میں شہرت کی علامت مشترک ہے۔

ہم زندگی بسر کرتے رہتے ہیں' زندگی کی حقیقت جانے بغیر! ہم کسی کے مرجانے کا فتویٰ جاری کرتے ہیں' موت کو جانے بِنا۔ زندگی صرف سانس کی آمد و رفت کا نام نہیں' اور نہ موت ہی حرکتِ قلب بند ہو جانے سے واقع ہوتی ہے۔ زندگی معنوی زندگی ہے...... اور موت معانی کے مرجانے کا نام ہے۔ لفظ جب تک اپنے معانی کی نسبت سے آگاہ نہ کرے' محض ایک آڑی ترچھی لکیر ہے...... اسی طرح جسم بھی فقط چلتی پھرتی نعش ہے' جب تک اپنی چلت پھرت سے خیال کی لطافت کی اطلاع نہ دے۔ زندگی دل میں کسی خیال کے جاں گزیں ہونے سے پیدا ہوتی ہے ...... اور یہ زندگی جب ایک بار پیدا ہو جائے تو ختم نہیں ہوتی۔ خیال کو موت نہیں' اس لیے صاحبِ خیال کیلئے بھی موت مقدر نہیں۔ تحلیل جاں کے مرحلے سے گزرنے والے کیلئے موت بھی ایک مرحلہ ہے۔ زندہ رہنے کا جواز' اُمید ہے۔ زندگی دوسروں کو زندہ رہنے کا جواز دیتی رہے تو محفوظ رہتی ہے...... ہمیشہ کیلئے! جو شخص اپنے الفاظ اور کردار سے دوسروں کی کٹیا میں اُمید کا چراغ بجھانے کا سبب بنتا ہے' وہ اپنے محلات میں بھی اس روشنی سے محروم رہے گا' جسے زندگی کہتے ہیں۔ دوسروں کا جینا آسان کر دیا جائے تو اپنا مرنا آسان ہو جاتا ہے۔ اگر دوسروں کا جینا حرام کیا جائے' تو اپنا جینا بھی مشکل اور مرنا بھی دشوار! دنیا دار تمام عمر یہ ہنر سیکھنے میں صرف کر دیتا ہے کہ زندہ کیسے رہنا ہے...... اور درویش اپنی عمر اسی میں تمام کر دیتا ہے کہ مرنا کیسے ہے۔ اس لیے دونوں کا جینا مرنا سانجھا تو ہو سکتا ہے' برابر نہیں!! سانجھ اور سنگت برابری کی دلیل نہیں!

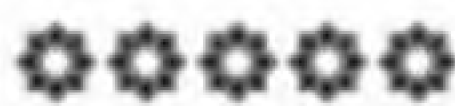
ملکیت کے جھگڑے زندگی کو موت کی سرحد تک لے آتے ہیں۔ انسان اپنی مِلک چھوڑ دے تو ملائک سے بڑھ جائے۔ اپنی ملکیت کی چوکیداری انسان کو اسلحہ اٹھانے پر مجبور کرتی ہے۔ جائز ملکیت کی حفاظت کیلئے جان ہلکان کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ دراصل جائز ملکیت حقوق اور فرائض میں ایک توازن کی حالت ہوتی ہے...... اور حالتِ توازن پر

پہرہ دینے کی ضرورت نہیں ہوتی۔اس کے برعکس ناجائز ملکیت میں دوسروں کے حقوق کی عدم ادائیگی بھی شامل ہوتی ہے۔اس لیے ایسی ملکیت پر قبضہ برقرار رکھنے کیلئے تمام ناجائز طریقے اختیار کرنا پڑتے ہیں۔ناجائز طریقوں میں خوف اور دہشت کے تمام ہتھیار شامل ہیں۔آزادی زندگی ہے...... آزادی سے محرومی' موت۔آزادی چھیننے والا دراصل زندگی چھینتا ہے۔ معاشی اور معاشرتی محرومیاں پیدا کرنے والے موت کے سوداگر ہیں۔ یہ سوداگری' انہیں گداگری پر مجبور کرتی ہے۔زندگی کا حاصل یہی ہے کہ ہم کسی سے کچھ چھین کر کچھ ''حاصل'' نہیں کر سکتے۔کلیہ یہ ہے کہ جو چیز ہم حاصل کرنا چاہتے ہیں' ہمیں وہی تقسیم کرنی ہوگی۔رزق ہو یا سکون' تقسیم کرنے والے کے پاس لوٹا دیا جاتا ہے...... اور چھین لینے والے سے چھین لیا جاتا ہے۔

زندگی' دل کی زندگی ہے اور موت' دل کی مُردنی۔ دل کی زندگی کی علامت احساس ہے...... لیکن اپنا نہیں' دوسروں کا!! اپنے جذبات اور مفادات کے بارے میں ہر شخص حساس ہوتا ہے۔ایسی حساسیت نرگسیت ہوتی ہے' یا خودغرضی۔ دل کے مردہ ہونے کا ثبوت بے حسی ہے۔مردہ دل ظالم ہوتا ہے...... زندہ دل اپنی زندگی برقرار رکھنے کیلئے کئی بار موت اور مظلومیت سے گزرتا ہے۔زندگی کا ثبوت دینے کیلئے قربانی کے عمل سے گزرنا ہوتا ہے۔قربانی کے دَرّوں سے گزر کر انسان وادیٔ احسان تک پہنچتا ہے۔وادیٔ احسان کا مکین وہی ہوگا' جو خوئے ایثار پر متمکن ہوگا۔دوسروں کے حق میں بے ضرر ہونے کیلئے اپنے حقوق سے دستبردار ہونا پڑتا ہے۔ دوسروں کیلئے منفعت بخش ہونے کیلئے اپنے مال، مفاد اور مرتبے کی قربانی دینا ہوتی ہے۔قربانی ...... شہادت ہے۔شہادت کے بہت سے درجے ہیں۔ جان بھی مِلک ہے...... اور مال مفاد اور مرتبہ بھی مِلک ہے۔اپنی مِلک سے خوش دلی سے دستبردار ہوجانا بھی ایک مرتبۂ شہادت ہے۔ شہید کی گواہی ...... احسان کی شہادت

ہے۔اہل احسان' اہل شہادت ہوتے ہیں ......اور اہلِ شہادت کی طرح ہمیشہ کیلئے زندہ رہنے کے اہل ہوتے ہیں !!

پچھلے دنوں ایک ہم نشینِ محفل' علمی ادبی اور روحانی ذوق سے متصف نستعلیق شخصیت فرقان دانش اچانک رحلت کر گئے۔ وہ خود یکا یک ایک سرمدی مسرت میں کھو گئے اور پیچھے رہ جانے والے دوستوں کو اُداس کر گئے۔ زیرِ سایۂ دیوارِ مزارِ اقدس حضرت واصف علی واصفؒ انہیں لحد میں اتارا جارہا تھا، زندگی کا ایک باب ختم ہورہا تھا اور نظروں کے سامنے جینے، مرنے اور پھر جینے کی بابت ایک کتاب کھل رہی تھی۔ اخلاص اور اخلاق اس درویش کا زادِ راہ تھا۔ ایک عرصہ سے معمول تھا کہ ہر جمعہ کی رات حضرت واصف علی واصفؒ کے حضور اور پھر رات گئے دربارِ اقدس داتا حضورؒ حاضری دیتے۔ اس جمعرات وہ حاضری سے نکل کر حضوری میں چلے گئے۔ مادّہ پرستی کے اِس دور میں اُس درویش کی گواہی میں یہی اسٹیٹ منٹ کافی ہے کہ وہ انکم ٹیکس ڈیپارٹمنٹ میں افسر تھا' اور موٹر سائیکل اُس کی سواری تھی !!



ایک کامیاب زندگی کا حاصل ......

ایک پرسکون موت کے سوا اور کیا ہے !!

(پہلی کرن)

لفظوں کا حرم' معانی کی حرمت !!

جس طریقے سے سود کا نام منافع رکھ دیا گیا ہے، حد سے تجاوز کو اجازت کا نام دے دیا گیا ہے، رشوت کو خدمت کے نام پر قبول کر لیا گیا ہے، خوشامدانہ چاپلوسی کو اظہارِ عقیدت کے طور پر لے لیا گیا ہے اور منافقت کیلئے مفاہمت کا نام تجویز کر دیا گیا ہے...... اسی طریق پر مسلم بادشاہوں کی تاریخ کو اسلام کی تاریخ کہہ کر پڑھا دیا گیا ہے۔ جب ہم لفظوں سے بددیانتی برتتے ہیں تو دراصل ہم تاریخ سے ایک تاریخی خیانت کے مرتکب ہوتے ہیں۔ دراصل لفظوں کی راہداریاں معانی کے حرم تک لے جاتی ہیں۔ لفظ پامال ہو جائیں تو معانی کے حرم میں داخلہ نہیں ملتا۔ لفظوں کے ماہتاب کو گہن اس وقت لگتا ہے جب نیت میں مال اور مفاد دَر آتا ہے۔ لفظ روشنی کے سفیر ہیں...... اماوس راتوں میں جگنو بن کر جگمگاتے ہیں۔ ایک متلاشی شعور کے اُفق پر لفظ ایک کوندا بن کر بکھر جاتے ہیں۔ مادّے سے روح کی طرف ہجرت کے سفر میں لفظ ایک زادِ راہ کا کام کرتے ہیں۔ لفظ سے کلمات بنتے ہیں...... اور کلمات سے قول !! قول ایک عہد ہے...... عہد کی حفاظت عمل سے ہوتی ہے...... اور عمل کی حفاظت نیت کی مسلسل نگہداشت سے !! جب عہد کی جگہ عہدے لے لیں' تو قول اور قرار' دونوں برخاست ہو جاتے ہیں۔ عہد عمرانی ہو' یا ایمانی...... اپنے قیام کیلئے ایک قربانی مانگتا ہے...... مال کی...... مفاد کی...... اور مسندِ جاہ وجلال کی !!

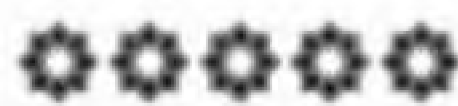
لفظوں کا حرم برباد کر کے ہم ایک عرصے سے بادشاہوں کے حرم آباد کر رہے

ہیں۔ تاریخ میں ایسا ہوتا چلا آیا ہے کہ مسلمان بادشاہوں کی حصول اقتدار کی جنگ کو ہم کفر واسلام کا معرکہ قرار دیتے رہے۔ مسلمان حکمرانوں اور ان کے خاندانوں کے تذکروں کو ہم تاریخ اسلام سمجھ کر پڑھتے رہے...... سر دھنتے رہے...... دوسروں کی دھنائی کرتے رہے ...... اور جو خود سمجھے' وہی دوسروں کو سمجھاتے رہے...... بزورِ شمشیر!! تاریخ کے ساتھ تخریب کاری اس طرز پر بھی جاری رہی کہ بادشاہت کے تسلسل کو ہم خلافت کا نام دیتے رہے۔ تاریخ اسلام کا طالب علم یہ سوال ضرور کرے گا...... کیا بادشاہت کو خلافت کہا جاسکتا ہے؟ کیا خلافت موروثی ہوتی ہے؟ کیا نسبت کا تعلق نسب سے ہے؟ کیا عربی اور عجمی کلمہ گو میں فرق ہوتا ہے؟ کیا حرم کی خدمت صرف عمارتوں کی تعمیر سے مکمل ہو جاتی ہے؟ کیا اسلام کے شعائر صرف صفا مروہ تک محدود ہیں' یا افکار اور کردار بھی شعائر میں شامل ہیں؟ کیا شعائر اسلام کے احترام میں ایک غریب مسلمان زائر کا احترام بھی داخل ہے؟ کیا حرم کی خدمت کا مفہوم صرف توسیع صحن حرم ہے۔ کیا ہمارے ہاں خدمت کا تصور صرف حضرت ہاجرہؓ کے نقوش قدم میں بچھے ہوئے سعی کے راستے کو آراستہ کرنے پر ختم ہو جاتا ہے؟ جن کے دم قدم سے حرم آباد ہو' ان کے آثارِ قدوم بے آباد کیوں؟

دراصل حرمین شریفین کی حفاظت اور حکمران خاندان کی حفاظت میں وہی فرق ہے جو مسلمان بادشاہوں کی تاریخ اور اسلام کی تاریخ میں ہے۔ ہم مغل بادشاہوں کی داستانوں کو تاریخ اسلام قرار دے دیتے ہیں۔ ہمیں اسلامی بادشاہوں کی فتوحات اسلامی فتوحات کے باب میں پڑھا دی جاتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ خاندانِ غلاماں کی تعریف وتوصیف سے اسلام آزاد نہ ہوگا۔ تاریخ میں یہی ظلم ہوتا رہا کہ ظالم بادشاہوں نے اپنی خون آشام قباؤں کو سرکاری مؤرخ سے مستعار لی گئی پارسائی کی عباؤں میں چھپا لیا۔ اقتدار پر قبضہ جمانے کیلئے اپنے باپ کی آنکھیں نکلوانے والے اورنگ زیب آج تاریخ کی

کتابوں میں قرآن کی دیدہ زیب کتابت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں ...... اقتدار کی خاطر اپنے بھائیوں کو تہہ تیغ کرنے والے ٹوپیاں سی کر گزارہ کرنے کا عالمگیرٹوپی ڈرامہ کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ تاریخ کے طالبعلم کیلئے یہ بات ہمیشہ باعثِ حیرت رہے گی کہ ٹوپیاں سینے کی اجرت ایک محل کے اخراجات کیلئے کیسے کفایت کرتی ہو گی ...... اور یہ کہ بادشاہ سلامت کا کتابت شدہ قرآن کا کوئی نسخہ آج تک کسی میوزیم میں نظر کیوں نہ آسکا۔ تاریخ بہت ظالم ہوتی ہے' ہر چیز کا بڑی بے دردی سے ریکارڈ رکھتی ہے ...... اپنے اوپر ہونے والے ظلم کا ریکارڈ بھی محفوظ رکھتی ہے۔ اسلام کی تاریخ مسلم بادشاہوں کی تاریخ نہیں ...... بلکہ اسلام کے آفاقی اصولوں کے مطابق صحیح معنوں میں مسلمان زندگی بسر کرنے والے علماء، اولیاء، صلحاء اور اصفیاء کی تاریخ ہے ...... اسلام کی تاریخ ایسے لوگوں کی تاریخ ہے' جو ظالم بادشاہوں کے خلاف ڈٹ گئے، جنہوں نے جان مال قربان کیا لیکن اسلامی اصول وشعائر پر آنچ نہ آنے دی ...... جنہوں نے اپنے کردار سے' افکار سے اسلامی فکر کی حرمت پر پہرہ دیا۔ اسلام کی تاریخ شام کے محلات میں رقم نہیں ہوئی' بلکہ کوفہ کی ایک مسجد میں نمازِ فجر کے دوران 'فزت بربِ کعبہ' کی تکبیر کے ساتھ پیشانی سے ابلتے ہوئے خون سے سرخرو ہوئی ہے۔ اسلام کی تاریخ خلیفہ ہارون مامون کی تاریخ نہیں' بلکہ امام احمد بن حنبلؒ کی تاریخ ہے ...... جنہوں نے کفریہ عقائد کے خلاف ظلم سہے، کوڑے کھائے۔ مغلیہ سلطنت کا شہنشاہ اکبر اور اس کے نورتن ہماری تاریخ نہیں' بلکہ حضرت مجدد الف ثانیؒ کا کردار اسلامی تاریخ کا سرمایہ افتخار ہے ...... جنہوں نے دینِ الٰہی کے نام پر دینِ اسلام میں ارتداد کا مردانہ وار مجادلہ کیا ...... اور سرزمین ہند میں اسلام کو کفر کی آمیزش سے بچایا۔ یہاں فتوحات کا باب محمود غزنوی نہیں' بلکہ حضرت ابوالحسن الخرقانیؒ، حضرت ابوالفضل ختلیؒ اور اُن کے مریدِ باصفا حضرت علی ہجویریؒ رقم کرتے ہیں۔ تاریخ اسلام جس بادشاہ کے نام پر فخر کرتی ہے' وہ

ابرہیم ادھمؒ ہیں۔ پہلے بلخ کے بادشاہ تھے...... بعدازاں دلوں کے بادشاہ ٹھہرے۔ دراصل اسلام کی تاریخ کو تاراج کرنے میں بادشاہوں کی تاج وتخت کی ہوس کا ہاتھ رہا ہے۔ مسند و اقتدار کے علاوہ بادشاہوں کا بھلا کون کا سا مذہب ہوتا ہے؟...... جب مذہب ہی نہیں' تو مسلک کیسا؟ ہمارے ہاں سادہ لوح عوام اپنے اپنے مسلک کے آئینے میں بادشاہوں کے حق میں زندہ باد' مردہ باد کے نعرے لگاتے رہتے ہیں۔ تاریخ بنانے والے اور ہوتے ہیں اور تاریخ برباد کرنے والے اور!! تاریخ بنانے والے حال سے بیگانہ ہوتے ہیں...... حرص و ہوس سے آزاد ہوتے ہیں...... اور حصولِ اقتدار کی جنگ سے دُور ہوتے ہیں۔ اپنے اقتدار کو رائج کرنے والے اور ہوتے ہیں ......اور اسلامی اقدار رائج کرنے والے اور!! اقدار کی ترویج کردار اور افکار سے ہوتی ہے...... جنگ اور جدال سے نہیں۔ اسلام کی تاریخ سرخ وسفید پتھروں سے مسجدیں بنانے والے بادشاہوں نے نہیں' بلکہ مسجدیں آباد کرنے والے درویشوں نے بنائی ہے۔ آؤ! اسلام کی تاریخ نئے سرے سے رقم کریں...... اپنے کردار اور جرأتِ اظہار کے قلم سے!!



آنے والی نسلوں کے ساتھ
ہمارا اس سے بڑا ظلم اور کوئی نہ ہوگا
کہ ہم اُن کے آنے سے پہلے ہی
اُن کے حصے میں آنے والے لفظوں کے معنی بدل دیں!
(پہلی کرن)

اے شہرِ مکّہ!

اے شہرِ مکّہ ...... تُو شہرِ عتیق ہے ...... کہ تیرے اندر بیت العتیق ہے۔ اے شہرِ مکّہ ...... تُو شہرِ قدیم ہے ...... کہ تیرے اندر بیتِ ذاتِ قدیم ہے۔

اے شہرِ مکّہ! ...... تُو اُمّ القریٰ ہے ...... تُو اُس مشفق ماں کی طرح ہے جو ہر قریئے' ہر شہر سے آنے والوں کو اپنی محبت بھری آغوش میں سمیٹ لیتی ہے۔

اے شہرِ مکّہ ...... تُو بَلَدُ الامین ہے ...... تو مخلوقاتِ عالم کی پناہ گاہ ہے ...... جو تیرے پاس پہنچا' اُس نے امن پایا ...... خوف اور بھوک سے نجات حاصل کی۔ جس نے اس شہرِ پُرسکوں کا سکون برباد کیا وہ خود برباد ہوا ...... زمانے میں اُس کا نشان تک نہ رہا ...... اگر کوئی نشان رہا' تو عبرت کا نشان بن کر رہا۔ کتنے ہی زمانے تیرے آگے پیچھے اور دائیں بائیں گُم ہو گئے مگر تُو زمانے میں کبھی گُم نہ ہوا ...... زمانے کا ہر نشان مٹ جائے گا مگر تیرا نشان باقی رہے گا ...... کہ تیرے اندر اُس خدائے حیّ وقیّوم کا گھر ہے جو ہمیشہ قائم رہنے والا ہے ...... وہ ایسا قائم ہے کہ ہر زمانہ' اُس کا زمانہ ہے ...... بلکہ وہ کہتا ہے کہ زمانہ وہ خود ہے۔ آدمؑ تا ایں دم کتنے ہی انسانوں نے تیری گود میں سانس لیا اور اپنی روح اور جسم دونوں کا سامان لیا۔ تیرے اندر محبت کا ایک نہ ختم ہونے والا زم زم ہے ...... جو کبھی نہیں ٹھہرتا ...... یہ زم زمۂ فیض تیری فضاؤں میں چاروں اور بہہ رہا ہے۔

اے شہرِ مکّہ ...... تیری عظمت کا سکّہ دوسرے شہروں پر اس طرح قائم ہے جس طرح

قرآن کی عظمت دوسری کتابوں پر!! ...... تیری عظمت کا ڈنکا چار دانگِ عالم میں بج رہا ہے۔ تیری فضیلت دنیا کے ہر شہر پر کیسے قائم نہ ہو...... کہ دنیائے عالم میں جہاں بھی بندگانِ خدا ہیں' اُن کی جبینِ نیاز تیری ہی زمینِ ناز کی جانب جھکی ہوئی نظر آتی ہے۔ تو مرکز البلاد ہے۔ دنیا کے ہر شہر کی مسجد تیری ہی جانب قبلہ رُو ہے۔ اطرافِ عالم سے تیری طرف سفر کرنے کا قصد کرنا عبادت ہے۔ اِس متناہی دنیا میں تُو لامتناہیت سے عبارت ہے۔ اگر کسی نے شمار کرنا ہو کہ سمندر میں کُل کتنے قطرے ہیں تو وہ بس یہ شمار کرلے کہ حرم کی زمین پر آج تک کتنی مرتبہ جبیں سائی ہوئی ...... اگر کوئی یہ جاننا چاہے کہ صحرا میں کتنے ذرّے ہیں تو وہ یہ شمار کرے کہ مطافِ حرم میں اب تک کتنے قدم کعبے کے گرد دوڑائے گئے۔ مطافِ حرم ...... تیرے گلے کا گلوبند ہے۔

اے شہرِ مکّہ! ...... تجھ میں کعبۃ اللہ ہے ...... بادشاہوں کے اُٹھائے ہوئے محلات اور فلک بوس عمارتیں عظمتِ کعبہ کے سامنے زمین بوس ہو جاتی ہیں مگر بیت اللہ کی عمارت ہے کہ اس کی ہیبت وجلالت بدستور بڑھتی ہی چلی جاتی ہے۔ اللہ اکبر ...... ! کعبہ کی عمارت ''اللّٰہ اکبر'' کی ایک تفسیر ہے۔ فانی انسانوں کی تعمیر کردہ عمارتوں اور اَمارتوں کو وقت کی دیمک کھا جاتی ہے۔ جب وقت کا پہیہ چلتا ہے تو بلند و بالا عمارتیں اپنے ہی بوجھ سے گرنے لگتی ہیں ...... مگر سیاہ پتھروں کی ایک سیاہ پوش عمارت ہے ...... جو سادگی سے کچھ اس طرح عبارت ہے ...... کہ ہر حال میں' عظمت میں سب عمارتوں سے بلند رہتی ہے ...... اور جلالت میں ہر عمارت سے بالا نظر آتی ہے۔ آخر ایسا کیوں نہ ہو ...... کعبہ کی دیواریں اینٹ' چونے' پتھر سے نہیں بلکہ خونِ وفا سے تعمیر کی گئی ہیں۔ اِس کی بنیادوں میں آدمؑ کی صفاوت ہے ...... اس کی دیواروں میں اِبراہیمؑ کی خلّت اور اسماعیلؑ کی تسلیم و رضا ہے۔ صدق وصفا اور تسلیم و رضا جب خلیل اللہ کے ہاتھوں سے ترتیب اور ترکیب پاتے ہیں تو اِس عمارت میں

ایک عجب یکجائی و یکتائی کی شان پیدا ہو جاتی ہے ...... اور اس کا قیام قیامت تک کیلئے قائم ہو جاتا ہے۔

اے شہرِ مکّہ! ...... تجھے زمانے میں ثبات کیونکر نہ حاصل ہو کہ تیرے یہاں ہی تو اللہ کے دوست کا پائے ثبات ثبت ہے۔ مقامِ ابراہیمؑ ...... نشانِ قَدم بھی ہے اور نشانِ قِدم بھی! اے ربِّ کعبہ! تیری شانِ قِدم کا جلوہ اِس عمارت کی صورت میں اُس مخلوق کے سامنے عیاں ہے جو قدم قدم پر حَدث کا شکار ہے۔ اے معبودِ قدیم! بے شک تیرا قِدم ہی تیری بڑائی ہے ...... اور بندے کا حَدث ہی اس کی عاجزی ہے۔

اے معبودِ مطلق! ...... تجھے نیند آتی ہے' نہ اونگھ ...... اور نہ تجھے تھکن ہی لاحق ہوتی ہے ...... مگر یہ کہ مخلوق بندگی کرتے کرتے تھک جاتی ہے ...... طواف کرتے کرتے قدم تھک جاتے ہیں مگر دل نہیں تھکتا ...... کہ انسان کا دل بھی تو تیرا ہی گھر ہے!! اے معبودِ برحق! ...... یہ حق ہے کہ تُو بے نیاز ہے مخلوق کی سب عبادتوں سے ...... ریاضتوں سے ...... تُو چاہے تو محبت سے بھری اُس ایک نظر کو قبول کر لے جو تیرے گھر پر بار بار پڑتی ہے ...... تُو چاہے تو صفا اور مروہ کے درمیان دوڑنے والے کا دل صدق و صفا سے بھر دے ...... تُو چاہے تو اِس کی آنکھوں میں مروّت و مودّت کی جوت جگا دے ...... یہ ہو تو سعی بھی قبول ہو ...... یہ نہ ہو تو ہر سعی ...... ایک سعیٔ لاحاصل!!

اے شہرِ مکّہ ...... تُو ہر شہر کا سحر توڑ کر رکھ دیتا ہے ...... دنیا کے کسی شہر کا کوئی باشندہ ایسا نہیں جو تیری حدود میں داخل ہو' اور تیری فضاؤں اور نداؤں کے سحر میں گرفتار نہ ہو۔ کوئی ذی روح ایسا نہیں جو تیری مشفق فضاؤں میں سانس لے اور کبھی اُسے اپنے آبائی شہر کی یاد ستائے۔ اے شہرِ مکّہ! ...... تُو اُس وقت بھی میٹروپولیٹن تھا جب انسان نے ابھی میٹروپولیٹن کے ہجّے کرنا بھی نہیں سیکھے تھے۔ دراصل تُو ہر اُس روح کا آبائی شہر ہے جس نے

ایک عجب یکجائی و یکتائی کی شان پیدا ہو جاتی ہے ...... اور اس کا قیام قیامت تک کیلئے قائم ہو جاتا ہے۔

اے شہرِ مکّہ ! ...... تجھے زمانے میں ثبات کیونکر نہ حاصل ہو کہ تیرے یہاں ہی تو اللہ کے دوست کا پائے ثبات ثبت ہے۔ مقامِ ابراہیمؑ ...... نشانِ قَدم بھی ہے اور نشانِ قِدم بھی ! اے ربِّ کعبہ ! تیری شانِ قِدم کا جلوہ اِس عمارت کی صورت میں اُس مخلوق کے سامنے عیاں ہے جو قدم قدم پر حَدث کا شکار ہے۔ اے معبودِ قدیم ! بے شک تیرا قِدم ہی تیری بڑائی ہے ...... اور بندے کا حَدث ہی اس کی عاجزی ہے۔

اے معبودِ مطلق ! ...... تجھے نیند آتی ہے' نہ اونگھ ...... اور نہ تجھے تھکن ہی لاحق ہوتی ہے ...... مگر یہ کہ مخلوق بندگی کرتے کرتے تھک جاتی ہے ...... طواف کرتے کرتے قدم تھک جاتے ہیں مگر دل نہیں تھکتا ...... کہ انسان کا دل بھی تو تیرا ہی گھر ہے !! اے معبودِ برحق ! ...... یہ حق ہے کہ تُو بے نیاز ہے مخلوق کی سب عبادتوں سے ...... ریاضتوں سے ...... تُو چاہے تو محبت سے بھری اُس ایک نظر کو قبول کر لے جو تیرے گھر پر بار بار پڑتی ہے ...... تُو چاہے تو صفا اور مروہ کے درمیان دوڑنے والے کا دل صدق و صفا سے بھر دے ...... تُو چاہے تو اِس کی آنکھوں میں مروّت و مودّت کی جوت جگا دے ...... یہ ہو تو سعی بھی قبول ہو ...... یہ نہ ہو تو ہر سعی ...... ایک سعیٔ لاحاصل !!

اے شہرِ مکّہ ...... تُو ہر شہر کا سحر توڑ کر رکھ دیتا ہے ...... دنیا کے کسی شہر کا کوئی باشندہ ایسا نہیں جو تیری حدود میں داخل ہو' اور تیری فضاؤں اور نداؤں کے سحر میں گرفتار نہ ہو۔ کوئی ذی روح ایسا نہیں جو تیری مشفق فضاؤں میں سانس لے اور کبھی اُسے اپنے آبائی شہر کی یاد ستائے۔ اے شہرِ مکّہ ! ...... تُو اُس وقت بھی میٹروپولیٹن تھا جب انسان نے ابھی میٹروپولیٹن کے ہجّے کرنا بھی نہیں سیکھے تھے۔ دراصل تُو ہر اُس روح کا آبائی شہر ہے جس نے

روزِ الست اپنے ربّ کی صدائے اَلَستُ بِربِکُم پر لبیک کہا تھا۔

انسانی شعور جو دائروں کا اسیر رہتا ہے...... وہ اُس آسمانی نکتے تک کیسے پہنچے جو کعبے کی صورت ایک چوکور نقطہ بن کر زمین پر اُتر آیا ہے۔ یہ نقطہ...... درحقیقت چوکھٹ کا نکتہ ہے ......اہلِ جہاں کی جبینوں میں تڑپتے ہوئے سجدوں کیلئے زمین پر ایک چوکھٹ!

اے شہرِ مکّہ!...... تُو شہرِ تحیّر ہے۔ جب کوئی تیری زیارت کا قصد کرتا ہے تو وہ تیری حدود میں داخل ہوتے ہی پہلے قدم پر حیرت زدہ ہو کر اپنی عقل گم کر بیٹھتا ہے...... اور پھر دمِ واپسیں سے پہلے اپنا دل بھی ہار دیتا ہے۔ تیرا زائر کچھ اس طرح واپس آتا ہے کہ اپنا دل اور آنکھیں وہیں چھوڑ آتا ہے...... تا کہ تمام عمر تیری یاد میں تڑپتا رہے اور بن دیکھے...... آنکھ بند کر کے تیری زیارت کرتا رہے۔

اے شہرِ مکّہ!...... تیری فضاؤں میں لاتعداد مناظر ہیں جو دھڑکتے ہوئے دل کو تھام تھام لیتے ہیں...... ایک دل اور دو آنکھوں کی آخر بساط ہی کیا ہے...... بھلا کون کون سا منظر اپنی نظر میں سمیٹوں اور کس کس منظر سے صرفِ نظر کروں۔ ٹھہر! ٹھہر! اے مہلتِ عمر!...... میں دل کو آنکھ بنا لوں...... اور آنکھ کو دل...... تا کہ اپنے مقدر کے حصے میں درج سب کے سب مناظر اپنے اندر سمیٹ سکوں...... ہمیشہ ہمیشہ کیلئے!!

کُلَّ یومٍ ھُو فی شان کی تجلی یوں تو ہر جگہ ہے مگر کعبہ کے در و دیوار پر بدرجہ اُتم ہے۔ حرم کا نظارہ عجب ہے اور مطافِ حرم میں محوِ طواف جھلمل کرتے چہروں کا نظارہ عجیب تر۔ وہی تجلی جس سے کعبہ تُو بہ تُو سیراب ہو رہا ہے...... کعبے کے گرد جمگھٹا کیے ہوئے زائرین بھی اُسی کی زد میں ہیں۔ مختلف النوع رنگ اور نسل کے چہروں کا کعبہ کی طرف رجوع کرنا اِس اَمر کا ثبوت ہے کہ اے ربِ کعبہ...... تُو ربّ العالمین ہے۔

مجھے رشک آتا ہے اُن ابابیلوں پر جو سرِ شام حرم کی فضاؤں میں یوں پرواز کرتی

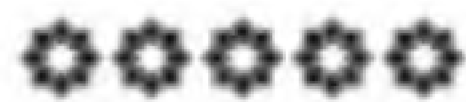
ہیں جیسے محوِ طواف ہوں ...... جو یہیں پیدا ہوئی ہیں اور یہیں مر جائیں گی۔ مجھے رشک آتا ہے اُن کبوتروں کے غولوں پر جو حرم کے دروازوں کے باہر' مکہ کی گلیوں بازاروں میں زائرین کے قدموں کے درمیان غٹرغوں کرتے پھرتے ہیں .... اے شہرِ مکّہ ...... تیری حُرمت کے سبب انہیں بھی بھوک اور خوف سے نجات مل گئی ہے۔ یہ کبوتر حرم سے باہر رہتے ہیں' مطاف میں داخل نہیں ہوتے ...... غالبًا باادب ہوکر مطاف کی فضائیں اُن ابابیلوں کیلئے خالی کر دیتے ہیں' جنہوں نے اَبرہہ کے لشکر پر کنکریاں برسا کر کعبہ کی حفاظت کے فرائض سر انجام دیئے تھے۔ کتنے خوش قسمت ہیں یہ کبوتر ...... زائرین ان کے حوالے سے راستوں کی پہچان کرتے ہیں ...... گویا یہ مکّہ کی گلیوں کے نشاناتِ راہ ہوں۔ ''بھائی! آپ کدھر ٹھہرے ہوئے ہیں؟'' ...... جواب ملتا ہے ''میں کبوتروں والے چوک کے پاس ہوں'' ...... سب زائرین ان فضاؤں میں آخری سانس لینے کی آرزو دل میں لیے اپنے اپنے وطن لوٹ جائیں گے ...... اور یہ کبوتر' یہ ابابیل یہیں پیدا ہوئے اور انہی فضاؤں میں اِن کا دم نکلے گا۔

اے حرمِ کعبہ! تیری عظمت اس وقت کتنی بلندیوں پر پہنچ گئی ہوگی' جب تیرے ربّ کا محبوب رسولؐ تیرے گرد محوِ طواف ہوگا۔ اے مطافِ حرم ...... ایک کلمہ گو کے نزدیک تیری حرمت کیلئے یہی کافی ہے کہ تُو سرکارِ دو عالمؐ کی اونٹنی کے تلووں تلے لوٹ پوٹ ہوئی۔ اے سرزمینِ مکّہ ...... تیری عظمت کیلئے یہی کافی ہے کہ تُو ترپّن (۵۳) برس مسلسل آقائے دو جہاںؐ کے نعلین کو چومتی رہی ...... دیکھ! نقشِ کفِ پائے محمد ﷺ کے صدقے تیری عمر حشر تک دراز کر دی گئی ...... تُو اب کبھی پائمال نہ ہو پائے گی ...... اپنی بلند نصیبی پر ناز کر ...... تجھے ایک ایسے فاتحِ عالمؐ نے بغیر جنگ کیے فتح کر لیا ہے کہ اب تُو کبھی مفتوح نہ ہوگی۔ اَے فضائے مکّہ! ...... تجھ میں کبھی اُس مشامِ جاںؐ نے سانس لیا تھا ...... جو کُل کائنات کی رُوح حیات ہے۔ پس اُسیؐ کے دَم قدم سے تُو ہمیشہ کیلئے ایسے معطر ہوگئی کہ اب تیری ہوائیں

تا قیامت ہر زائر کو معطر بھی کرتی رہیں گی اور مطہر بھی!

اے شہرِ مکّہ ...... تُو عالم کو محبوب کیوں نہ ہو، جب تو محبوبِ ربّ العالمین کو محبوب ہے!!

(۲۰۱۰ء میں عمرہ کی ادائیگی کے دوران ضبطِ تحریر ہوا)



محبوب ......

اُس ہستی کو کہتے ہیں،

جس کا ذکر کبھی ختم نہ ہو!

(دلِ ہر قطرہ)

ڈاکٹر اظہر وحید کی نثر نگاری......فکرِ واصفؒ کا تسلسل!!

پروفیسر حسن عسکری کاظمی

زندگی برتنے کا سلیقہ اور ترسیل فکر کا اہتمام دو ایسی خوبیاں ہیں جن کی قدر و قیمت وہی لوگ جانتے ہیں جنہیں کسی مردِ درویش اور صوفی باعمل کی صحبت نصیب ہوئی ہو' اپنی زندگی سنوارنا بھی توفیقِ الٰہی کے بغیر ممکن نہیں' چہ جائیکہ ترسیل فکر کی ذمہ داری سے کماحقہٗ عہدہ برآ ہونا۔ اس مختصر تمہید کا مقصود ڈاکٹر اظہر وحید کے اندازِ اظہار میں اس وصفِ خاص کا جائزہ لینا ہے جو اُن کی نثر نگاری میں اُن کی شخصیت کے حسن و جمال اور تطہیرِ نفس سے پیدا ہونے والے اقوالِ زرّیں کی صورت میں قاری کے دل و دماغ کو مسخر کرنے کا سبب بنا۔ ڈاکٹر اظہر وحید پیشے کے لحاظ سے طبیب ضرور ہیں لیکن وہ روحانی معالج کے طور پر اپنی تزکیۂ نفس پر مبنی تحریروں سے باطن میں پھیلی ہوئی بیماریوں کا علاج کرنے میں گہری دلچسپی رکھتے ہیں' یہ خوشگوار فریضہ انجام دینے کی خاطر انہوں نے کالم لکھنے کا بیڑا اُٹھایا، یہ کارِ ہنر بغیر رہنمائی کے ممکن نہ تھا، یقیناً اُن کی زندگی کے شب و روز ہمارے عہد کے نامور صاحبِ نظر اور معلم اخلاق' مردِ کامل حضرت واصف علی واصفؒ کی پاکیزہ صحبت میں گزرے کہ جہاں سے اُنہیں عرفان و آگہی کی دولتِ بے بہا حاصل ہوئی۔

اُن کی تحریر میں عکسِ جمالِ واصفؒ بدرجۂ کمال دکھائی دیا' اُن کے جملوں کی ساخت اور بصیرت افروز اندازِ اظہار اپنے پیر و مرشد سے اس قدر مشابہ ہے کہ وہ شعوری اور لاشعوری طور پر ان کے زیرِ اثر وہی عارفانہ اسلوب اختیار کرتے ہیں جو حضرت واصف علی واصفؒ کا طرۂ امتیاز ہے کہ ان کے باطن سے جو زندگی آموز بات زبان پر آتی ہے' بالکل وہی صورتِ احوال ڈاکٹر اظہر وحید کے ہاں ملتی ہے، اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ حضرت واصفؒ کے جملوں سے اکتسابِ حرف و صوت چاہتے ہیں، ایسں نہیں بلکہ اپنا تشخص برقرار رکھتے ہوئے نفسِ مضمون کا آغاز اس

طرح کرتے ہیں کہ اُن کا لب و لہجہ دل نشیں اور جاذبِ نظر بن جاتا ہے' اُن کا مضمون'' زُہد کی شیرینی'' ہمارے پیشِ نظر ہے' ملاحظہ کیجئے:

'' زُہد ایک شیرینی ہے...... جسے زُہد کی شیرینی راس آجائے اُسے معصیت کسیلی معلوم ہوتی ہے' زُہد صرف پارسائی کا علم نہیں بلکہ پارسا ہونے کا عمل ہے' پارسائی۔۔۔پاکیزہ فکر تک رسائی رکھتی ہے' پارسا ہی وہ پارس ہے جو دوسروں کی مٹی کو سونا بنانے کی اہلیت رکھتا ہے' زُہد عبادت بھی نہیں' زُہد کے بغیر عبادت بسا اوقات عابد ہونے کے غرور میں مبتلا کر دیتی ہے''۔

ڈاکٹر اظہر وحید کے کالم روزنامہ'' نئی بات'' میں باقاعدگی سے شائع ہو رہے ہیں، وہ معاشرتی خرابیوں پر بے لاگ تبصرہ کرتے ہیں' اُن کا ہر کالم کسی نہ کسی اہم موضوع یا قومی مسئلے کی صراحت سے متعلق قاری کی معلومات میں اضافہ کرتا ہے' وہ اپنے موضوع کی اہمیت کے پیشِ نظر جملہ تفصیلات فراہم کرتے ہیں لیکن وہ قاری کی علمی اور ادبی سطح بلند کرنے کی خاطر جملوں کی تراش خراش اور پیرایۂ اظہار میں ندرت اور نفاست پر بھرپور توجہ دیتے ہیں' یہی خوبی ترسیلِ فکر میں معاون ہوتی ہے' اُن کا مضمون'' خوشامد......لفظوں کی رشوت'' دلچسپی سے خالی نہیں، اُن کا یہ کہنا درست ہے کہ:

'' خوشامد کرنے والا اور خوشامد سننے والا دونوں برابر درجے کے خائن ہیں' جب تک خوشامد سننے والا کان میسر نہ ہو' خوشامد کرنیوالی زبان کو الفاظ میسّر نہیں آسکتے۔ حضرت واصف علی واصفؒ فرماتے ہیں'' خوشامد بغیر صفت کے تعریف ہے'' صفت کے بغیر موصوف کا وجود ممکن نہیں' غیر کو وجود کا درجہ دینا درحقیقت غیر ممکن کو واجب قرار دینے کے برابر ہے......اور لاف زنی شرک کا درجہ ہے......وجود کی وحدت کے ساتھ یہ ایک شرک ہی تو ہے''۔

ڈاکٹر اظہر وحید ژرف بینی کے ساتھ معاملے کی تہہ تک پہنچنا چاہتے ہیں' وہ اپنے قاری کو عزیز جان کر صداقت بیانی سے کام لیتے ہیں' کالم نگاری میں یہ رویہ اُن کی فکری ثروت مندی اور عالی ظرفی کا نشانِ امتیاز ہے' دراصل موجودہ صحافت میں ادارتی صفحے پر چھپنے والے کالم معیار کے اعتبار سے پست و بلند، قابلِ مطالعہ یا سرسری طور پر دیکھنے کے لائق ہوتے ہیں' کالم نگاروں میں

واقعات ،شخصیات اور نظریات کے حوالے سے مباحث کا سلسلہ جاری ہے' کہا جاتا ہے کہ واقعات کا بیانیہ اور شخصیات پر لکھنے میں ژولیدہ بیانی ہوتی ہے جس میں بے جا تعریف یا تکذیب پیش نظر رہتی ہے لیکن نظریات سے متعلق تحریر دلائل و براہین کے بغیر لایعنی ہوا کرتی ہے' اس لیے نظریات کی ترسیل' دانشوری اور اس نوع کی تحریر کا مطالعہ شخصیت کی بالغ نظری کا متقاضی ہے' ڈاکٹر اظہر وحید کا تعلق اُس طبقے سے ہے جو ترسیل فکر کا اہتمام اور اپنے صالح نظریات کی اشاعت کو لازمی قرار دیتا ہے۔ حضرت واصف علی واصفؒ نے اس حوالے سے پتے کی بات ارشاد فرمائی:

''انسان کو علم اس لیے دیا گیا ہے کہ وہ فنا سے بقا کی طرف ہجرت کر سکے' اگر علم کا منشاء رضائے حق ہے تو نور بلکہ نورٌ علیٰ نور'' اسی مضمون پر اظہار خیال کرتے ہوئے ڈاکٹر اظہر وحید نے لکھا: ''علم ایک نعمت ہے اور اس نعمت کا شکر' یہ ہے کہ اسے عمل میں لایا جائے' علم اخلاقیات کا ہو یا الٰہیات کا ہو' اس کی تبلیغ کی بہترین صورت یہی ہے کہ اس پر عمل کر کے دکھایا جائے'' دیکھا یہ گیا ہے کہ مرشد اور مرید میں ایک غیر مرئی رشتۂ وحدت ہے کہ دونوں کی منزلِ مقصود فلاحِ انسانیت ہے' ڈاکٹر صاحب کی کالم نگاری میں ندرتِ اظہار ،فکری وجاہت اور خود احتسابی کا جائزہ لیتے ہوئے صرف اتنا کہہ کر قاری کی زحمت تمام کی جاتی ہے:

نئے انداز کی کالم نگاری مثالِ مژدۂ فصلِ بہاری
قلم تلوار کا نعم البدل ہے اگر دل پر لگائے ضرب کاری

ڈاکٹر اظہر وحید پاک طینت اور نیک سرشت مردِ خود آگاہ ہیں' اُنہوں نے مؤقر روزنامہ نئی بات کے ادارتی صفحے کو اپنے علمی و ادبی کالموں کی بدولت نئے امکانات سے روشناس کیا۔ وہ عصری اور ہنگامی صورتِ احوال پر اظہارِ خیال کرنے کی بجائے مستقل اقدارِ حیات پر گفتگو کرنا پسند کرتے ہیں۔ معاشرہ اور فرد دونوں کی اہمیت ہے' معاشرے میں بگاڑ پیدا ہو جائے تو افراد میں عدم برداشت کا پیدا ہونا فطری امر ہے' مولانا حالی نے ایک جگہ لکھا ہے کہ معاشرتی خرابیوں کے پھیلنے میں دیر نہیں لگتی لیکن سنورنے میں وقت لگتا ہے' ہمارے ہاں عدم برداشت نے راہ پائی اور اب برداشت ،نظم وضبط ،وسعتِ نظری اور احترامِ آدمیت کی جگہ نفرت ،فرقہ واریت اور تنگ نظری

نے دلوں میں گھر کر لیا ہے' ڈاکٹر اظہر وحید نے اس موضوع پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے اپنی تجزیاتی تحریر میں یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ ''عدم برداشت غصے کو جنم دیتا ہے۔۔۔اور غصہ ایسی آگ ہے کہ جب بھڑک اُٹھتی ہے تو اپنے پرائے کا فرق نہیں رکھتی' غیظ اور غضب مترادف الفاظ ہیں' ہم غیظ کا مظاہرہ کر کے اس کے غضب کو دعوت دیتے ہیں۔ انفرادی عدم برداشت اجتماعی زندگی میں وہ کانٹے بو دیتا ہے کہ آنے والی نسلیں اور صدیاں انہیں صاف کرتے کرتے لہولہان ہو جاتی ہیں' دھرتی پر نفرت کا جھاڑ جھنکار اور عدم برداشت کے تھوہر جب تک صاف نہ کیے جائیں کوئی فصل بار آور نہیں ہوتی!!''

جیسا کہ ابتداء میں حضرت واصف علی واصفؒ اور ڈاکٹر اظہر وحید کے درمیان روحانی، فکری اور قلبی روابط کا ذکر کیا گیا اور ڈاکٹر اظہر وحید کی تحریر میں اپنے مرشد کے عقائد کی چھاپ اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ ان کے حصارِ حلقۂ رُشد و ہدایت میں طمانیت سے بسر کر رہے تھے' اسی طرح حضرت واصف علی واصفؒ کے علمی تبحر کا سلسلہ مولائے کائنات حضرت امیر المومنین علی ابن ابی طالبؑ سے جا ملتا ہے' یہ سلسلۂ رشد و ہدایت اللہ تعالیٰ کے لطف و کرم کے بغیر ممکن نہیں' صاحبِ نہج البلاغہ حضرت علیؑ کے خطبات، مکتوبات، اقوال اور اشعار کا مطالعہ ایسا خیرِ عمل ہے جس کا کوئی نعم البدل نہیں' ہم ان جاوداں اقوال میں حق و صداقت کی گونجتی اذاں سنتے ہیں' ہماری مثال سوارِ کشتیٔ حرف شکستہ کی ہے' ہم اور ہمارے علاوہ ہر عہد کے دانشور اور نکتہ داں مولائے کائنات کے معجز نما کلام ''نہج البلاغہ'' میں غوطہ زنی کرتے رہیں گے' حضرت واصف علی واصفؒ نے اپنے بارے میں ارشاد فرمایا کہ:

ع میرا نام واصفِ باصفا، میرا پیر سیّد مرتضیٰ

انہوں نے بابِ العلم سے اکتسابِ دانش کا ہنر سیکھا اور معرفت سے مملو اپنے پیر سیّد مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ' کا یہ قول پیش کیا کہ ''وہ علم بے قدر و قیمت ہے جو زبان تک رہ جائے اور وہ علم بہت بلند مرتبہ ہے جو اعضاء و جوارح سے نمودار ہو''

اسی قولِ زرّیں پر عمل کرتے ہوئے ڈاکٹر اظہر وحید جہاں ایک طرف اجسامِ انسانی کی

صحت کو عزیز جانتے ہیں اور مختلف بیماریوں میں مبتلا افرادِ انسانی کا علاج کمال شفقت سے کرتے ہیں وہاں روحانیت سے بے بہرہ لوگوں میں نسخہ ہائے کیمیا تقسیم کرتے ہیں' اُن کی روحانی زندگی میں پاکیزگی اور طہارت کا تسلسل کالم نگاری میں ''زہد کی شیرینی، لفظوں کا حرم...... معانی کی حرمت، قوتِ برداشت'' اور اس نوع کے وقیع کالموں میں دکھائی دے گا' یقیناً اُن کے قارئین اس حقیقت کا ادراک رکھتے ہیں کہ ڈاکٹر اظہر وحید کے رُخِ روشن پر مسکراہٹ اُن کے طمانیتِ قلب کا عکسِ جمیل ہے۔ اُن کا یہ قول سدا بہار پھول کی طرح شاخِ زندگی پر خوشبو بکھیرتا رہے گا۔

''اسلام کی تاریخ بادشاہوں کی تاریخ نہیں' بلکہ اسلام کے آفاقی اصولوں کے مطابق صحیح معنوں میں مسلمان زندگی بسر کرنیوالے علماء، اولیا، صلحاء اور اصفیاء کی تاریخ ہے۔ اسلام کی تاریخ ایسے لوگوں کی تاریخ ہے جو ظالم بادشاہوں کے خلاف ڈٹ گئے' جنہوں نے جان و مال قربان کیا لیکن اسلامی اصول وشعائر پر آنچ نہ آنے دی' جنہوں نے اپنے کردار سے، افکار سے اسلامی فکر کی حرمت پر پہرہ دیا' اسلام کی تاریخ شام کے محلات میں رقم نہیں ہوئی بلکہ کوفہ کی ایک مسجد میں نمازِ فجر کے دوران 'فضت برب الکعبہ' کی تکبیر کے ساتھ پیشانی سے اُبلتے خون سے سرخرو ہوئی''۔

مختصر یہ کہ ڈاکٹر اظہر وحید نے اپنے مضامین میں سچائی اور بے باکی کے ساتھ تلخ وشیریں حقائق کو بطریق احسن پیش کیا' اُن کا صداقت شعار قلم رواں دواں رہے گا اور کذب وریا کا پردہ چاک کرنا اور باطل قوتوں پر ضربِ کاری لگانا اُن کے عظیم مشن میں سرِفہرست دیکھ کر قارئین میں بھی جرأتِ اظہار کا جذبہ بیدار ہوگا۔ اللہ تعالیٰ ڈاکٹر اظہر وحید کی توفیقات میں اُن کی توقع سے بڑھ کر اضافہ فرمائے اور اُن پر ہمیشہ حضور نبی پاک حضرت محمد ﷺ اور ان کی آلؑ پاک اور اصحابؓ باوفا کی مشفقانہ نظر رہے۔ آمین!!

